ستمبر کا چاند
قرۃ العین حیدر
Q_h
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ستمبر کا چاند

ستمبر کا چاند

(رپورتاژ)

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

SITEMBER KA CHAND

BY

QURRATUL - AIN - HYDER

Year of Ist Edition 2002

ISBN 81-87667-27-3
Price. Rs. 325/-

کتاب کا نام	ستمبر کا چاند
مصنفہ	قرۃ العین حیدر
سنہ اشاعت اوّل	۲۰۰۲ء
قیمت	۳۲۵ روپے
کمپوزنگ	خالدہ تبسم
مطبع	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔

سرِ ورق کی پینٹنگ ۔ ہائیڈل برگ کا ایک منظر (آئل کلرز)
عمل — قرۃ العین حیدر

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan Delhi-6 (India)
Ph.: 3216162, 3214465 Fax:91-011-3211540
E-Mail: eph@onebox.com

فہرست

☆☆☆

دیباچہ

رپورتاژ اور سیدھے سادے سفرنامے میں محض اندازِ بیان کا فرق ہے۔ رپورتاژ افسانے کی زبان میں لکھا جاتا ہے، اس میں زیبِ داستاں بھی اسی حد تک ہوتی ہے کہ اس سے حقائق کی پردہ پوشی نہ ہو یا واقعات کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر افسانے اور حقیقت کا امتزاج ہمیں یلدرم کے مضمون ''سفرِ بغداد'' میں ملتا ہے جو ۱۹۰۴ء میں لکھا گیا اور جسے اُردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ اس روداد میں بغداد جانے والے راوی کو راستے میں سند باد جہازی ملتے ہیں جو حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد عالمِ اسلام کی ابتر حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اُچانک غائب ہو جاتے ہیں۔

راقم الحروف کا پہلا رپورتاژ ''لندن لیٹر'' ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں ''نقوش'' لاہور میں شائع ہوا۔ اس میں مَیں نے ذکر کیا تھا کہ میں فیروز جبیں اور چند اور دوست فرانسیسی فلم ''لاروند'' دیکھ کر پیکیڈلی کے سنیما ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے تو ایک اپاہج گورے نے بھیک مانگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ''تمہارے بازو کیا ہوئے؟'' مسکرا کر بولا ''میں ڈنکرک فتح کرنے گیا تھا۔'' اب اس جملے میں اس دور کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جب کہ دوسری جنگِ عظیم کو ختم ہوئے ابھی صرف چھ سال ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے مختلف ملکوں کے متعلق متعدد رپورتاژ قلمبند کئے پھر جی بھر گیا، سیاحت نامے کوئی کہاں تک لکھے۔ امریکہ کے متعلق میرا رپورتاژ بعنوان ''جہانِ دیگر ہفتہ وار اُردو بلٹز بمبئی میں

بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد بھی میں امریکہ وغیرہ گئی اور برطانیہ تو تقریباً ہر دوسرے تیسرے سال جاتی ہوں اور خیال آتا ہے کہ اتنے طویل عرصے میں جس طرح مغرب کا رنگ بدلا ہے اس کے بارے میں بھی لکھوں۔ پتہ نہیں یہ ارادہ کب پورا ہوگا۔ چلیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

قرۃ العین حیدر

نوئیڈا

۱۵ر نومبر ۱۹۹۸ء

☆

لندن لیٹر

معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زنانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ عزیزہ سعید بانو سلمہا اپنی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ آپا بیگم میں خیریت سے ہوں بمبئی سے دُلہن بھابی نے جو آم کا اچار میرے ساتھ کردیا تھا وہ ختم ہوگیا۔ یہاں ہندوستانی دوکان میں مرچ اور مسالہ بہت مہنگا ملتا ہے۔ ایک شلنگ کی ایک پڑیا دھنیے کی سمجھ لیجیے۔ گرم پانی کے پائپ کے ذریعے میرا کمرہ گرم رہتا ہے۔ (پھر کچھ لینڈ لیڈی کا ذکرِ خیر ہوتا تھا) یہاں آپا جانی زمین دوز ریلیں چلتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مُفصّل بیان) میں نے کل یہاں پلاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ (ہندوستانی اور انگریزی کھانوں کا موازنہ اور آپا بیگم کے لئے انگریزی کھانوں کی چند آسان ترکیبیں) آپ کا زُکام اب کیسا ہے؟ اگلے خط میں مَیں برائٹن اور بلیک پُول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دُور اُفتادہ بہن ''سعیدہ''۔

جب پیاری سعیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دُور نزدیک سے رشتے دار عزیز دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں اور اپنی باقی عمر وہ وطن کے کسی گمنام مدرسے میں ہیڈ مسٹرس یا پھر اسکول انسپکٹرس بن کر گذار دیتی تھیں۔

حضرات! اب میں لندن لیٹر کی دُوسری اقسام کا بیان کروں گی۔ ایک آغا اشرف کا

"بی بی سی سے آداب عرض"، تھا کہ کس طرح انگریز نا تسی بمباری کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور فتح انشاء اللہ اتحادیوں کی ہوگی۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد سے جو لندن لیٹر السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں چھپتا ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ کل ہاؤس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ہائی کمشنر سے میں ملا اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں کینا خوب پھول رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹا بڑھا دیا ہے۔ آئندہ اگلے ہفتے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جب کہ "تماشائی" اور "آئینے" کا نامہ نگار خصوصی ان حسین وجمیل رسالوں کے کالموں میں یوں رقم طراز ہوتا ہے۔ "پچھلے اتوار کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گارڈن پارٹی میں اس حسین نیلی ساری میں ملبوس دیکھا جو انہوں نے مجھے بتایا کہ جینوا میں خریدی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے جنہیں میں نے بریگیڈیر فلاں کی دل کش بیوی کو ایک لطیفہ سناتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل ایسکٹ میں بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برسلز کی ایک گمنام دوکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمرہ دستیاب ہوگیا۔ صاحب فلاں نگر کی بے حد خوش پوش صاحبزادی ہیں، کمانڈر صاحب کے کیمرہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں۔ اُن کو بھی فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے اس مرتبہ ASCOT میں وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر مہینے یہی گوسپ ہوتی ہے یہی خبریں، یہی لوگ۔

ان بین الاقوامی طیارہ گاہوں، ان کلبوں اور ریس کورسوں کی رونق دیکھئے ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ روزانہ ادھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ بغداد، بیروت، استنبول، روم، پیرس، جنیوا، نیویارک کیا گہما گہمی ہے۔ کیا کانفرنسیں اور گارڈن پارٹیاں ہیں، اللہ اکبر!

آیئے۔ کیوں نہ "لندن لیٹر" کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔

ملاحظہ فرمایئے۔ ہارون الرشید کا عراق جہاں چاروں طرف بیکراں ریگستان ہیں اور جھلسی ہوئی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دُور سے نظر آ جاتی ہے یا کوئی بدّو خچر پر بیٹھا سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے یا کبھی ٹھٹھک کر آسمان کو دیکھ لیتا ہے جس پر اُڑن

قلعے پرواز کررہے ہیں۔ کیا وقت آن لگا ہے! کیا کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کے لکڑ داداؤں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحرِ ظلمات میں کیا سرپٹ گھوڑے دوڑائے تھے؟ مشرقِ وسطیٰ کے شہروں میں اب آپ کو صرف اطلانتک کے اس پار رہنے والے گھومتے نظر آئیں گے۔ بدّو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کنارے چلا جارہا ہے۔

اس ریستوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع موجود ہے۔ دیواروں پر کوکا کولا کے اشتہار لگے ہیں، ایک آدھ عراقی مادموزیل اونچی سینڈل پہنے سرعت سے گیلری میں سے نکل جاتی ہے۔ کس قدر گرمی ہے! اطلانتک پار والے پسینہ پسینہ ہوئے جارہے ہیں۔ یو این او نے انہیں یہاں عربوں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچی مٹی کی بستیوں میں جاکر دوائیں تقسیم کرتے ہیں اور اپنے کیمروں سے تصویریں اُتارتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے مشرقِ وسطیٰ کی زمین نے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت جیپ پر جارہا ہے جس کے پیچھے پیچھے عرب بدّو کا اونٹ بھی ہے (تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا رومانٹک پس منظر ہے) اس کے لکڑ دادا رچرڈ شیر دل کے ساتھ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے آتے تھے۔ اب وہ انہیں تہذیب سکھانے آیا ہے۔ اگر یہ لوگ از کروہ صلیبی جنگیں نہ کرتے اور کبھی یورپ کا لوہا مان لیتے اور ساتھ ساتھ عیسائی بھی ہوجاتے تو انہیں کاہے کو یہ برے دن دیکھنے پڑتے۔ اب بہر حال یہ انڈر ڈیویلپڈ ممالک ہیں اور یہ عالمگیر ہمدردی اور بھائی چارے کا زمانہ ہے اور اس ایمرجنسی پیریڈ میں تثلیث اور توحید گویا خدا کے سارے ماننے والے ایک محاذ پر اکٹھے ہورہے ہیں۔

توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کررہا ہے جس میں مووی ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں (مصری فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کرلی ہے۔ مادموزیل امّ ریحان اور شرلے ونٹرز میں ذرا بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور مادموزیل امّ ریحان۔ بلکہ اُن کے ساتھ خود ہماری اپنی نرگس اور ثریا اور مدھو بالا اپنے اسٹریم لائینڈ شام کے لباس میں سب ایک ساتھ آوا گارڈنر کے ساتھ فخر سے سر اونچا کرکے کھڑی ہوسکتی ہیں) بہر کیف تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب

کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ میرے رسول اللہؐ اور میرے ائمہ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل وصورت کے رہے ہوں گے یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امامؑ مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا میرے اوپر کافی جذباتیت کا موڈ طاری ہورہا ہے۔ عرب نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اُٹھایا۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی ___ کوکا کولا پیو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی۔

وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ آرکسٹرا نے 'بلیوز' بجانے شروع کر دیئے ہیں۔ عرب بڑے سے مشہدی رومال سے اپنی پیشانی صاف کر رہا ہے۔ میرے پیارے بوڑھے عرب! تم جو ایک پوری تاریخ کے ایک عظیم تمدن اور روایت کے بہت پیارے نمائندے ہو اور تمہارے ہاتھوں میں یہ مووِیز کا رسالہ ہے اور تمہاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں۔ تمہارے پرکھوں نے تو ان بزرگانِ دین کا ساتھ دیا ہوگا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے ہوئے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمہارے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کوکا کولا کا گلاس ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو میرے بھائی! میرے پیارے ساربان........!!

یہ بیروت ہے۔ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور سمبل، کیا شاندار ترک ہے، پلونہ اور ادرنہ اور سالونیکا سب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔ وہ کوریا سے لوٹ رہا ہے اور وہ بھی یو این او کا ایک اہم رکن ہے کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس نے ترک بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی کی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اسے سنایا جو میرے والد کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے مختصراً اس کے گوش گذار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا وہ اطمینان سے صرف یو این او میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اُس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور جس نے اس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر کوریا بھیج رہی ہوں، کامران لوٹنا!! بیٹوں کو

لڑائیوں پر بھیجنا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوبی اور عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے اس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

اُدھر دو برطانوی بیٹھے ہیں۔ ہم فلاں فلاں کو سبق سکھا دیں گے۔ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں۔ تذکرہ غالباً تیل کا ہے۔

سڑک پر جنگلے کے سہارے ایک بہت کم سن پنجابی ہندو لڑکا کھڑا ہے جانے وہ یہاں کدھر سے آنکلا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا حتیٰ کہ اُردو بھی مطلق نہیں بول سکتا۔

سبز پہاڑیوں کی ڈھلان پر پھیلا ہوا اور سمندر کے کنارے کنارے بکھرا ہوا بیروت دھوپ میں جگمگا رہا ہے۔ سمندر نیلا میڈی ٹیرنین! نیلے میڈی ٹیرنین اور لبنان خدا تم دونوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے!! لبنان.........! خلیل جبران کے ملک، تم بہت پیارے ملک ہو۔ یہ سب بہت پیارے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو خلیل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کیتھولک لڑکیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی سڑک پر سے ٹہلتا میری سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ میری ساری کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ دھوپ میں اُن کے سنہری اور چاکلیٹ بال جھلملا رہے ہیں۔ خوبصورت چہروں والی کیتھولک لڑکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ تذکرہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فرنچ بول لیتی ہو؟ میں اُن سے پوچھتی ہوں۔

فرنچ ویری گڈ۔ انگلیش، نو..... پھر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ اُن کی راہبہ جو خود بہت کم عمر اور خوبصورت ہے، سکون سے مسکراتی ہے۔

یہاں دُور دُور انجیر اور زیتون کے درخت ہیں جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی کیتھولک خانقاہیں چھپی ہوئی ہیں۔ جن کی سمت جانے والے سایہ دار خوابیدہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی پیکارڈ یا جیپ تیزی سے اس الوہی سکون کو منتشر کرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں ایا صوفیہ کے مینار نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں، مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں ناچتے ناچتے تھک گئی ہیں اور اس شفق کے دھندلکے میں سارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

الپس، جرمنی۔
المانیہ! آہ المانیہ!! (واہ المانیہ!!!)
بون، کولون، فرینک فرٹ۔
ان ناموں میں کتنا سحر ہے۔ لو یہ کا جگمگاتا شہر فرینک فرٹ۔
فراولین کیا چاہئے......؟ ایک ویٹر جھک کر پوچھتا ہے۔
فراولین کے پیارے بھائی فرانز، تم تو ہٹلر یوتھ میں تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہئے۔ بڑا کنفیوژن ہے بھائی بڑا کنفیوژن ہے۔
مجھے یہاں سے آگے جانے دو۔

بلجیم۔ کیا خوبصورتی ہے، کیا نفاست ہے۔ برسلز، برسلز، گرجاؤں میں شام کی عبادت کے لئے گھنٹے بج رہے ہیں۔ اُن کی گونج شمال کے کہر آلود سمندروں پر پھیلتی جا رہی ہے۔

حضرات میرے پاس وہ کیمرہ نہیں ہے جو کہ میں نے برسلز میں خریدا، ہوتا تو کمانڈر فلاں کے ساتھ میں اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتی۔ اوّل تو مجھے فوٹوگرافی اچھی طرح سے نہیں آتی۔ دُوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اُتارتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں کیوں کہ میرے پاس وہ ٹورسٹ رویہ نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہٰذا ناظرین، اب میں باسم سبحانہ، لندن لیٹر بے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔
دیباچہ ختم ہوا۔

۱۹۸۶ء

حضرات! اس ہوش ربا، دیوزاد پری پیکر عروس البلاد سے ہمارا کتنا صدیوں کا پرانا قلبی وروحانی تعلق ہے۔ ذری آنریبل جان کمپنی کا خیال کیجیئے کہ جب سٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگال لے کے لئے یہاں سے لنگر اُٹھاتے تھے۔ یا جب اوکسفرڈ اور کیمبرج کے ہونہار فرزندوں کو سراج الدولہ اور شجاع الدولہ کے پاس ذرا کام سے بھیجا جاتا تھا۔ کیا کیا معرکے ہوئے ہیں؟ کیا کیا توپیں دغی ہیں؟ اللہ اکبر۔ چپے چپے سے یہاں کے کیسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں؟ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ رڈیارڈ کپلنگ اور ونسٹن چرچل کے اوراق بھی ان گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگا لیجیے کہ پچھلے اسّی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر انہوں نے شعلہ بار تقریریں کی ہیں۔ لندن مجلس اور قہوہ خانوں اور Embankment پر آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ وائٹ ہال کے دروازوں پر پہنچ کر جدوجہد کی ہے۔ ہمارے نیتاؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکر لی ہے اور اب خداوند تعالیٰ کی عنایت دیکھئے کہ بالآخر ہم آزاد ہوئے۔ سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے کاندھوں سے گویا ایک بار اُتر گیا۔ اب ہم یہاں ایک ہلکے پھلکے ضمیر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیتا اب لڑائی لڑنے کے لئے نہیں بلکہ بکنگھم پیلیس کی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ لیڈی ہمارے کالے رنگ پر اعتراض کرتی ہے تو ہم مطلق اس کا نوٹس نہیں لیتے بلکہ جی بھر کے اس کے کمروں کو گندہ کرتے ہیں، اس کے وال پیپرز پر سیاہی کے چھینٹے گراتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اُس کے پردوں سے اکثر نظر بچا کر اُنگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔
یہ سب اِس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ بھلا ہم میں اور مثلاً .... مثلاً کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار کلمہ گو رہتا ہے، کئی مسجدیں ہیں۔ ایک آدھ فرزند کلسیا بھی گاہے بگاہے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے

ملاح ہیں جو مختلف بندرگاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدور ہیں جو شمال کے سارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔ صرف شہر لندن میں نوے ہندوستانی اور پاکستانی ریسٹوران ہیں۔ ہمارے ان گنت لڑکے اور لڑکیاں یہاں کے کالج میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ پھر ہماری بیگمات ہیں جب کوئی خاتون زرتار ''غرارہ'' پہنے سڑک پر سے گذر جاتی ہیں تو واللہ دیکھنے والوں کی طبیعت گلیڈ ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا نا........ بڑی گہما گہمی ہے۔

انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں جہاں ہمارے نادر قلمی نسخے، مغل تصویریں اور سارے تہذیبی خزانے محفوظ ہیں۔ جس کی دیواروں پر سے میرے گورو ایل ایم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ مہارانی جھانسی کے جانشین، نئے بھارت کی سر رنگ بالائیں اپنے دیش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ تلک جینتی منائی جاتی ہے۔

جی ہاں........ یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

لندن کی کلچرل زندگی میں آرٹ کی نمائشوں، تھیٹر، اوپیرا، بیلے اور کونسٹر کے ساتھ ہندوستانی رقص کے مظاہرے بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور اب غالباً 'آن' کی کامیابی کے بعد سے ہندوستانی فلموں کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ نمی جو پچھلے دنوں یہاں آئی ہوئی تھی اسے یہاں کے پریس نے کافی پبلسٹی دی اور برطانوی اور امریکن پروڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

نمی کے ذکر پر خیال آیا کہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کروں۔

'آن' ایک بوگس فلم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آن کے مقابلے میں ''ہم لوگ'' یا ''دھرتی کے لال'' یہاں ایک روز بھی نہ چل پاتی۔ ہندوستان کے متعلق جو تصور یہاں صدیوں سے موجود ہے یعنی مہاراجہ کے ہاتھی گھوڑے اور تلواروں کی لڑائیاں اور سونے کے محلات وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم میں بخیر و خوبی پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا نائٹس برج میں کام کرنے والی ٹائپسٹ لڑکی اور سٹی آف لندن کا بنک کلرک خوش خوش گھر لوٹتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے گلیمر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ مجھ سے یہاں کے ایک بہت بڑے

انٹلکچوئیل اور بڑے مشہور فلم کریٹک نے کہا کہ عالمگیر نمائش کے لئے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائرکٹر محبوب کو اطالوی فلم ''بائیسکل چور'' دیکھنی چاہئے تھی یا دو چار فرانسیسی فلمیں۔ میں نے عرض کیا کہ پہلے ہالی وڈ کے ان سارے ڈائرکٹروں کو بھی ''سائیکل کا چور'' دکھایئے جو ''قسمت'' اور ''دمشق کا چور'' اور ''سلیوگرل'' اور ''بغداد کا چور'' جیسی تصویریں بناتے رہتے ہیں یا جن حضرات نے ''رکم'' تیار کی ہے۔ محض مسٹر محبوب کی ذہنی تربیت کے آپ اتنے خواہاں ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا عکاس اُن کا پریس ہے سنسنی اور تہلکہ اُن کی مرغوب ذہنی غذا ہے۔ صرف بہت زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ٹائمز مانچسٹر گارجین یا نیو اسٹیٹس مین اینڈ نیشن پڑھتا ہے۔ اکثریت کے لئے وہ اخبار نکلتے ہیں جن میں قتل، مار پیٹ، اغوا، ڈکیتی، اور اسکنڈلز کا ذکر ہوتا ہے۔ ارسٹو کریسی اب یہاں آخری سانس لے رہی ہیں لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ''لارڈ فلاں کے بیٹے آنریبل فلاں نے کل رات مے فیئر میں اپنی پارٹی کے لئے شمپین کی اتنی بوتلیں پیرس سے منگوائیں اور اسپین کی خانہ بدوش رقاصاؤں کو بذریعہ ہوائی جہاز چھ گھنٹے کے لئے میڈرڈ سے بلوایا۔ پارٹی صبح کے پانچ بجے تک جاری رہی یا یہ کہ کاؤنٹس فلاں اتنے منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔''

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو سیاست کی بعض بعض تفصیلات سے جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خود یہ طبقہ گھوڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ، اور فٹ بال پُول اور کرکٹ کا اس قدر شیدائی ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورتِ حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈاربی اُن کے لئے بہر حال چین سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔

تحریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک حد تک ضرور موجود ہے۔ پچھلے دنوں یہاں روسی فلم ''زوال برلن'' دکھلایا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے۔ برطانیہ ایک آزاد ملک ہے اور ہم اس کے باشندے، اس چیز پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے

علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اور اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں اور روسیوں کو فتح اُن کی بے مثال بہادری کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ لیکن بہر حال یہ ایک بہت عظیم فلم ہے.........وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تعارف کے ساتھ امریکہ میں قطعی نہ دکھلایا جا سکے گا۔

آزادیٔ تقریر کا دوسرا مشہور و معروف مرکز ہائیڈ پارک ہے جہاں لکڑی کے ڈبوں پر کھڑے ہو کر ساری دُنیا کے سیاستدان، احتجاج کرنے والے، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کمیونسٹ پارٹی کا پوسٹر لگائے جراثیمی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے، اُن سے چند قدم ہٹ کر ڈین آف کنٹربری کے خلاف چلاّ چلاّ کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت خداوند تعالیٰ کو سخت وست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پر یسوع مسیح کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک نومسلم انگریز اور ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی جوش و خروش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔

مقرر اور سامعین کے مابین تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ مجمع ہر ایک کی سنتا ہے اور اسی طرح قہقہے لگاتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

پچھلے دنوں چند اخبار فروخت کرنے والوں نے طے کیا کہ وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے ٹائمنر نے اس پر بڑا زوردار نوٹ لکھا کہ یہ رویہ غلط ہے۔ اگر وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے تو ہم اُن کو ٹائمنر بھی بیچنے کے لئے نہ دیں گے کیوں کہ یہ رویہ جمہوریت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل کو ٹائمنر یا کسی اور اخبار کے لئے بھی یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آزادیٔ تحریر پائندہ باد۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہر نیوز اسٹینڈ پر آپ کو دستیاب نہیں ہو سکتا ___ ایسٹ اینڈ اور چوراہوں پر پارٹی کے افراد اسے فروخت کرتے نظر آجائیں گے۔

ایسٹ اینڈ ___!! پکیڈلی سے ٹیوب میں بیٹھ کر آپ وائٹ چیپل یا اسٹیپنی گرین

اتریئے۔ بیس پچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے جہاں بمباری سے تباہ شدہ محلے موجود ہیں اور دھوئیں سے جلے ہوئے مکانات اور تاریک گلیاں۔ جہاں کی سڑکوں پر سے آپ رات گئے تنہا گذریئے تو آپ کی جیب ضرور تراش لی جائے گی ....نازیوں نے اپنی بمباری کا نشانہ خاص طور پر اس علاقے کو بنایا تھا۔ جہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گنجان آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کنونشن نہیں ہے۔ ہر شخص دوستی کی موڈ میں رہتا ہے۔ افلاس اور گندگی کے معاملے میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہاں ان گنت ہندوستانی، پاکستانی، اور لنکا کے مزدور رہتے ہیں۔ برسوں سے رہتے آئے ہیں اور اس آبادی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ اُن کے لباس بھی اتنے ہی بدنما اور شکستہ ہیں جتنے اُن کے سفید فام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے نیم تاریک ہندوستانی طعام خانے ہیں۔ جہاں اتوار کے روز دن بھر جاز کی موسیقی بجتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیگرو لڑکے اچکتے رہتے ہیں۔ ایک چاء خانے میں ایک روز ہم لوگ گئے۔ اس میں دیوار پر پرانا مسلم لیگ کا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ جس پر قائدِ اعظم کی تصویر تھی۔ بے رنگ کرسیاں اور بھدی میزیں ایک کونے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بھات کھانے میں مصروف تھا۔ کاؤنٹر پر سے سیاہ فام، غالباً سلہٹ کا رہنے والا ویٹر چلایا۔ ''ون ٹی۔ ون رول''۔ عین مین کراچی کے بندر روڈ کا کوئی ریستوران معلوم ہوتا تھا۔ ڈور چسٹر، کلریجز، مے فیئر؟۔ جی ہاں۔ ان الف لیلوی جگہوں کے علاوہ جن کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی عقل چکرا جاتی ہے اور آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ چاء خانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان محض دریائے ٹیمز کا مغربی کنارہ ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور پیٹی کوٹ لین میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹھیلے والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں مونگ پھلی بیچتی ہوئی بڑھیاں، سیکنڈ ہینڈ مال کے انبار دو رویہ فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ وہی رنگ اور ماحول ہے جو اپنے پیارے نخاس کے بازار میں تھا۔

پھر یہ گلیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جن کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر ملبے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت خانے، یہاں سے تو کوئی پیکاڈلی یا سن بیم بھولے سے بھی

نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفلڈ میں، گلاسگو میں، ویلز کی آبادیوں میں، سارے آئرلینڈ میں اور پھر چینل عبور کرنے کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سارا پچھم ہے جس پر کہرہ چھایا ہوا ہے۔ کہرہ جو پچھم کے سمندروں سے اٹھتا ہے۔ نیچے نیلا میڈی ٹرینین جگمگا رہا ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈو کی یاٹ تیرتی ہے۔ حسین کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈوم جو مارکوئس آف ٹوڈل ڈو کے ساتھ پندرہ منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

میری دوست حایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل سلم لینڈ سے کم از کم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں۔ ہمارے اجتماعی فارم دیکھو ہماری نئی موسیقی، ہماری کلچر، ہمارا جذبہ، نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکر لے رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اور پاکستان ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور پاکستان میں اور عربوں میں کیا فرق ہے ___ وہ خاموش ہوگئی۔

___ ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں کے ساتھ مصالحت کرلیں۔ لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا تا کہ مشرق وسطیٰ میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے ___۔

___ وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔ حایا نے پھر کہا۔

اب وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔ حایا کاف من، روسی نژاد ہے۔ یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبلن سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔ حایا بے حد خوبصورت لڑکی ہے۔ ایک تو یہودی ویسے ہی دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔ اس لیے حایا کو کیمبرج میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ حایا یعنی حیا یعنی حیات، عبرانی میں حایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سمبل سے ہر وقت الجھی رہتی ہوں۔ میں حایا کو کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس نے اپنے دستی بموں سے کتنے عربوں کی جان لی ہوگی یہ سوچ کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھی پیانو پر کیکووسکی بجاتی

رہتی ہے۔ جب وہ جذباتی ہوجاتی ہے تو روسی گانے الاپنے شروع کردیتی ہے روسی اس کی مادری زبان ہے۔ عبرانی مذہبی اور سیاسی، انگریزی ادبی اور فرنچ اس کی کلچرل زبان ہے۔ وہ بڑی کٹر اینٹی برٹش عورت ہے۔ فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پٹائی بھی کی۔ سیاسی طور پر وہ اشترا کی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ان سرد مزاج انگریزوں کو وہ بحیثیت مجموعی کافی پر اسرار اور پر کشش نظر آتی ہے۔ پائندہ باد حاؔیا یعنی حیات۔

اس وقت حاؔیا ڈاکٹر الٹ ملر سے ایلیٹ کے معاملے میں الجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر الٹ ملر ہمبرگ کا انٹلکچوئیل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ نمستے کہتا ہے اور کماری کہہ کر پکارتا ہے کیوں کہ سنسکرت اور کالی داس کا وہ بہت بڑا عالم فاضل ہے۔ سات سال تک وہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑتا رہا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار ''جرم سزا'' کو پڑھا۔ اب وہ ہمبرگ میں ادب کا پروفیسر ہے۔ یروشلم کی انٹلکچوئیل حاؔیا کی ہمبرگ کے اس انٹلکچوئیل سے بالکل نہیں بنتی۔ کیوں کہ حاؔیا کو جرمنوں سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر الٹ ملر کی عدم موجودگی میں وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے۔ ذرا دیکھو تو اس منحوس مہا کوی کالیداس کے بچے کو۔ یوکرین میں اس نے کتنے روسی یہودیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہوگا....... یوکرین جو میرا وطن ہے۔

یوکرین تمہارا وطن کہاں سے آیا؟ تم اسرائیلی ہو؟ میں اس سے بگڑ کر کہتی ہوں۔

___ اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں___!! رونلڈ دوسرا سگریٹ رول کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔ رونلڈ برطانوی ہے، نسلاً اینگلوسیکسن اس گروہ کا ایک اور انٹلکچوئیل، سارے جدید انگریزی ادب پر وہ بھی ہم سب کی طرح بے تحاشا حاوی ہے اور اپنے آپ کو ڈاکٹر لیوس سے زیادہ سمجھدار نقاد خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر لیوس سے جو کیمبرج کے بڑے گروؤں میں سے ہیں۔ وہ اکثر الجھتا رہتا ہے۔ تم برِصغیر ہند کی ساری خرافات سیاست کا ذمہ دار محض مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر الٹ ملر کو سیاست کی خرافات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ ٹیگور کے فلسفے کے متعلق کرسٹفر آلی سے کچھ فرما رہے ہیں۔ کرسٹفر آلی لوئی مک نیس کے رفقاء میں سے ہیں اور

جدید شاعروں اور نقادوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ٹیگور ٹیگور چلاتے ہیں۔ آپ نے کبھی ابن خلدونؔ کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں غصے سے اُن دونوں سے کہتی ہوں........ مشرق کا سارا ذہن و فلسفہ محض ٹیگور ہی نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اور امام غزالیؔ" اور ابنِ خلدونؔ اور اقبالؔ کا بھی تو مطالعہ کیجئے......لیکن بھلا آپ عیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا........؟

ہم خطرناک پانیوں کی طرف........رونلڈؔ آہستگی سے تیسرا سگریٹ جلا رہا ہے۔

چنانچہ چاروں اور یہ خطرناک پانی ہیں اور ہم سب ایک ناؤ میں سوار ہیں۔

کیم آہستہ آہستہ بہتا جا رہا ہے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے یہ سینکڑوں برس سے یونہی بہتا آیا ہے۔ اس کے دونوں طرف پُرؔم روز کھلے ہیں اور بے انتہا سرسبز درخت ہیں۔ موسم بہار کے سارے پھول امنڈ رہے ہیں وپنگ ونور کی شاخیں پانی کی سطح پر جھکی رہتی ہیں۔ صدیوں سے یہ پھول اور یہ پرانی دیواریں اور یہ پل، یہ انڈر گریجویٹ بحثیں سنتے آئے ہیں۔ بے حد پرسکون ___ اور بے تحاشا خوبصورت منظر ہے جو کرسمس کارڈوں اور کیلنڈوروں پر منتقل ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہوتا ہے۔ چیری کے درخت ہیں اور ان میں چھپے ہوئے کاٹج اور ٹی گارڈن گرانچسٹرؔ ہے جہاں ریوپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹرؔ گرجا کے قبرستان میں ریوپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹر گرجا کے قبرستان میں ریوپرٹ بروک کے میموریل پر ایک اکیلی ریتھ مرجھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لانچ یونین جیک لہراتی زناٹے سے سطح پر سے نکل جاتی ہے۔ گڈ اولڈ یونین جیک ___ !! کوئی آہستہ سے کہتا ہے ___ ہولی ڈے میکرز اور انڈر گریجویٹس کناروں پر دُور دُور تک ٹولیوں میں منتشر ویک اینڈ منا رہے ہیں۔ پانی کی لہروں پر اَن گنت ڈونگیاں تیر رہی ہیں۔ ابھی قریب سے جو پنٹ گذری ہے۔ اس کے سرے پر کھڑی ہوئی حایاؔ نے جوش میں آ کر زور زور سے کوئی عبرانی لوک گیت شروع کر دیا ہے۔ جو اسرائیل کے کھیتوں میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ ڈاکٹر الٹ ملر آہستہ آہستہ ایک جرمن نغمہ الاپ رہا ہے۔ ڈاکٹر نینسیؔ روحانی گیت، گنگنانے لگتی ہے۔ انٹرنیشنل سمفنی شروع ہو جاتی ہے۔

نینسیؔ آنکھیں نیم وا کئے اپنے وطن جنوب کے Plantation کے گیت گا رہی ہے۔

ڈاکٹر نینسی کارلن۔ یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔اس کی دادی حبشی سلیو گرل تھی۔ جسے نیواورلینز میں فروخت کیا گیا تھا۔اس کا باپ ورجینیا میں پادری ہے نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔لہٰذا اُس نے شمال کی کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھا اور امریکن ناول میں نیگرو پادری کے کردار پر مقالہ لکھ کر اس نے کولمبیا سے ڈاکٹریٹ لیا۔اب وہ جنوب کی کسی بہت بڑی نیگرو یونیورسٹی میں ادبیات کی پروفیسر ہے۔نینسی ہر وقت بشاش رہتی ہے اور بات بات پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہے۔

''دیکھو......تم لوگ ہمیشہ اپنی مظلومیت پر بسورتے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو لیکن نینسی کو دیکھو۔اس کی قوم نے کتنے ظلم سہے ہیں اور یہ کس طرح ہر سمے ہنستی اور دوسروں کو ہنساتی رہتی ہے۔حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کلر پروبلم کے بارے میں تمہاری ہی طرح حساس ہے.......بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سہے ہیں......'' رونلڈ مجھ سے کہتا ہے۔

نینسی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے ساتھ تین چار امریکن اور ہیں جو سب کے سب کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔سب بڑے ذہن پرست ہیں مثلاً یہ لڑکا رسل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔صرف ایذرا پاؤنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے نینسی ان سب کی دوست ہے کیوں کہ بہر حال وہ بھی امریکن ہے اور بڑی پکی امریکن لیکن اُن سب سے مختلف ہے۔ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔نینسی ،حایا اور رونلڈ کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔پھر بھی اس سے کتنی گمبھیرتا اور کتنے دُکھ سے وہ نیگرو روحانی نغمہ الاپ رہی ہے۔

نینسی کارلن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریک فاسٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا ''ہلو ٹوپسی.........!!''

نینسی نے اس سے کہا۔''دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بری نیت

سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے ٹوپسی کہہ کر پکارا ہے لیکن آئندہ کسی نیگرو کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔''

''اوہ......آئی ایم سوسوری ڈیئر......'' انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خاموشی سے پارج میں مصروف ہوگئی۔

''تم نے دیکھا......'' بعد میں نینسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا'' یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرو عورتوں کو ٹوپسی یا نیگرس کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں تم سمجھتی ہونا.........میرا مطلب ہے کہ.........''

''الفاظ میں کیا رکھا ہے.........!!'' رونلڈ نے ایک اور سگریٹ رول کرتے ہوئے کاہلی کا سوال کیا۔

''الفاظ........؟ آپ کسی چینی کو چائنامین کیوں کہتے ہیں اور کیا تم کو پتہ ہے کہ لفظ 'ایشیاٹک' کے پیچھے کتنی حقارت چھپی ہوئی ہے........؟؟'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو..........!! اسی لیے اب تم لوگ اپنے آپ کو ایشیاٹک کے بجائے ایشین کے نام سے یاد کرتے ہو..........!!'' رونلڈ نے کہا۔

''جی ہاں جناب.........'' میں غصے سے کود کر دریچے میں جا بیٹھی۔

''اچھا اچھا۔ ایشین، ایشین.........!! ٹھیک ہے؟'' رونلڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہائے.......'' میں نے نقل اتارتے ہوئے جواب دیا۔

سورج کنگز کالج کے پیچھے غروب ہوتا جا رہا ہے۔ کورٹ یارڈ پر سائے طویل ہونے لگے ہیں۔ پیٹر ہاؤس کوئنز کالج۔ ایمونئل سڈنی سسکس۔ ان ساری سحر انگیز عمارتوں پر تاریکی چھا رہی ہے۔ تاریکی میں ایسا لگتا ہے کہ ابھی ان صدیوں پرانے گھسے پتھروں والے کوریڈورز میں سے قرونِ وسطیٰ کے راہب اور اسکالر کالے گاؤن پہنے شمعیں لیے ادھر سے ادھر گزر جائیں گے۔ ان کمروں میں، ان سیڑھیوں پر اور اُن کورٹ یارڈز کے درختوں کے نیچے کرسٹفر مایو، روجر بیکن، اولیور کروم ویل اور اُن کے بعد کیٹس، بائرن اور جانے کس کس نے اپنے طالب علمی کے زمانے بتائے ہیں۔ اس پُراسرار نیم تاریک ماحول میں اب تک ذرا سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

ٹیم اسی طرح بہتا رہے گا۔

اب ہم اپنے گرینڈ کونسرٹ کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بہہ رہی ہے۔ تیز سبز گھاس نم ہے اور پتوں پر سے بارش کے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔ پورب کے کھیتوں اور کنجوں پر بھی یونہی بارش اسی طرح ہوتی ہے۔ پھلیندے اور کھرنی کے درختوں پر بخشی کا تالاب اس وقت پانی سے بالکل لبریز ہو جاتا ہے اور پیلے کنول وہاں تیرتے ہیں۔ گومتی کے کاٹھ کے پل سے لوگ چولائی اور بتھوے کے جھوئے اٹھائے گذرتے رہتے ہیں، ساون الاپا جاتا ہے کیوں کہ اگست کا مہینہ ہے۔

نوسٹیلجیا:........!!؟ نینسی آہستہ سے دریافت کرتی ہے۔ لان پر ہمارے ساتھی اِدھر اُدھر گروہ بنائے گھاس پر بیٹھے پروگرام کے مختلف حصوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ شاہ بلوط کی لکڑی کی دیواروں والے نیم روشن کمرے میں اس اسکٹ کی مشق کی جا رہی ہے جو ہم نے ایلیٹ کے ''سوینی ایگنسٹیس'' کی پیروڈی میں لکھا ہے۔ ہم ایک ایک جملے اور سین پر قہقہے لگاتے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک امریکن لڑکی وائلن پر ویبر بجا رہی ہے۔ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کا اطالوی طالب علم گٹار بجانے میں مصروف ہے۔ آتشدان کے اوپر سے لیڈی سڈنی کی روغنی تصویر کاہلی سے جھانک رہی ہے۔ جنہوں نے پندرہویں صدی میں یہ کالج قائم کیا تھا۔

رسل فریزر فرش پر پڑے ہوئے گھنگروؤں کو بڑے غور اور دھیان سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ نینسی کارلن پیانو پر تن دہی سے وہ دُھن بجانے کی کوشش کر رہی ہے جو میں نے ناچ کی لے کے لئے اسے سکھائی ہے......رے واگے بندرابن ما بانسریا کھوب کھوب بجا دینا......رے واگے۔

دھیم تانا دھیری نا، تانا دھی ری نا دھیم......سب مل کر الاپنے لگتے ہیں۔

ٹیرفک......!! رسل فریزر چلّا کر خوشی سے کہتا ہے۔

ان سفید قوموں کا آرکسٹرا اب بندرابن کا گیت بجا رہا ہے۔ یہ دھنیں انہوں نے آج تک نہ سنی تھیں جو میں نے ابھی انہیں سکھلائی ہیں سب کے سب بچوں کی طرح اکسائیٹیڈ ہیں۔

اوہ بوائے..........!! نینسی چلا کر کہتی ہے۔

کیا کلچرل ہارمنی پیدا ہوئی ہے، واللہ............!! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فاسٹر مجھ سے کہتے ہیں......میں ہندوستان کو بھلا کس طرح بھول سکتا ہوں؟.........کبھی نہیں......!

یس سر۔ میں کہتی ہوں۔

خصوصاً تمہارا لکھنؤ۔

یس سر۔

تمہاری تہذیب۔

یس سر۔

تمہاری۔ اری جدوجہد۔

یس سر....ٹو چیرز فار ڈیموکریسی۔ [1]

فارسٹر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر جنوبی انگلستان پر موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیزن اپنے عروج پر ہے۔ ویسٹ اینڈ میں پیٹر اسٹنوف، ایڈتھایوانز اور میری مارٹن کے کھیل بے پناہ ہجوم اپنی اور کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے فیشن ایجاد کئے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز سے ذرا پرے اوور سیز لیگ کی بھوری مہیب عمارت ہے جس میں بوڑھے آئی سی ایس اور نوآبادیات کے سابق گورنر دن بھر چپ چاپ وہسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اٹھا کر گڈ اولڈ جے پور ریذیڈنسی یا ڈیرا اولڈ چھتر منزل کلب کا تذکرہ کر لیتے ہیں۔ جہاں ۱۹۲۰ء میں یا ۱۹۳۰ء میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک پارٹی کے دوران میں مَیں نے ایک بہت بوڑھے انگریز کو نوٹ کیا جو سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھا چاء پی رہا تھا، اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ میں نے

---

[1] فارسٹر کی نئی کتاب کا نام

پیالی اُسے اُٹھا کر دی۔

آپ کبھی برِصغیر جا چکے ہیں......؟ میں نے پوچھا۔

ہاں! جا چکا ہوں...... جا چکا ہوں......اس نے پیالی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سنبھال کر اُٹھائی۔

کسی خاص جگہ......؟

بمبئی!

اچھا...... کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں یا ایسے ہی......؟ میں نے اخلاقاً مکالمہ جاری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔

نہیں......ملازمت کے سلسلے میں۔

اوہ......آرمی......؟؟

نہیں، آرمی نہیں۔

تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستان؟

ہاں، ہاں کئی سال، کئی سال۔

کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں......میرا مطلب ہے، بمبئی میں.....؟

او.........میں بمبئی پریذیڈنسی کا گورنر تھا۔

اوہ.............

ان انگریزوں کی تنہائی اب قابلِ رحم ہے۔ اُن کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی زوال آ چکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈ اور کاؤنٹ جن کے پاس لمبے چوڑے خطابات، طویل و عریض ریاستیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے، اب نوکریاں کر رہے ہیں یا اپنے جواہرات اور بیش قیمت کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی نمائش شروع کر دی ہے جن پر ٹکٹ لگا کر وہ تماشائیوں کو اپنے کتب خانے اپنے نفیس بیڈروم اور ڈرائنگ رُوم ایک مستعد گائیڈ کی طرح دکھلاتے پھرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس سے گھر کے خرچ میں مدد لیتے ہیں۔ ''موت کے محصول'' نے ارسٹوکریسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔

انگلستان کے لارڈز اور لیڈیز کا زمانہ ختم ہوا۔

لٰہذا اے مومنوں! لازم آیا تم پر کہ عبرت پکڑو۔

اب آخر میں خاں صاحب سے بھی مل لیجیے جو پچھلے تیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ جوشؔ کے قریبی عزیز ہیں جو اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ بی بی سی کے اُردو سیکشن میں اُن کی وجہ سے بڑی رونق رہتی ہے۔ اتنے طویل عرصے کے ولایت کے قیام کے باوجود اُن کا لب و لہجہ اب تک ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا ہے۔ اُردو بولتے ہیں تو ہمیشہ تھیئٹر کو ٹھیٹر اور ویسٹ منسٹر کو ویسٹ مینیسٹر کہتے ہیں۔ سنیما کو انہوں نے ہمیشہ بائیسکوپ ہی کہا۔ لکھنؤ کے پرانے داستان گویوں کے انداز میں قصّے سناتے ہیں۔ تیس سال گزرے، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے یہاں آئے تھے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ ہائیڈ پارک میں انہوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کیا۔ خلافتِ تحریک آرگنائیز کی۔ اخبار نکالے۔ لائیڈ جارج کے پاس پہنچ جاتے تھے اور اس سے بگڑ کر کہتے تھے کیا معنی کہ آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو ابھی فوراً آزاد کیجئے۔

اب بوڑھے ہوگئے ہیں اور دل شکستہ ہیں کہ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے۔ لیکن پرمٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم ملیح آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے۔ ہر شخص کے دُکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں۔ کوئی خاندان نہیں ہے، اکیلے رہتے ہیں اور اپنے محلے بھر کے گورو اور جگت چچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چودھری محمد علی رودولوی کی حکایتوں میں اور چودھری محمد علی کے قصوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اور سر دُھننے والے اب کم رہ گئے ہیں۔

موسم گرما بھی گذرتا جارہا ہے۔ سیّاح ٹریفلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانے کھلا رہے ہیں۔ ٹیٹ گیلری میں پکاسو اور رائل اکیڈمی میں ڈاونچی کی نمائش ہورہی ہے۔ پکیڈلی سرکس میں وہاں کی مشہور عالم "اسٹرٹ واکر"، لڑکیاں حسین کپڑوں میں ملبوس، اونچی ایڑی کے جوتے پہنے گہرا میک اپ کئے کونوں کھدروں یا فٹ پاتھ کے کناروں پر کھڑی راہ چلنے والوں خصوصاً غیر ملکیوں کو 'ہلو ہینڈسم' کہہ کر اپنی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکیڈلی...... ہارٹ آف دی ورلڈ........!! مجمع بڑھتا جارہا ہے۔ سنیما گھروں کی

کھڑکیوں کے سامنے کیو لگے ہیں۔ایک خوبصورت جوان آدمی جس کی ایک ٹانگ اوپر سے کٹی ہوئی ہے، بھیک مانگتا مانگتا کیو کے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے اور ٹوپی اُتار کر سلام کرتا ہے۔بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔پیسے اس کے بکس میں کوئی بھی نہیں ڈالتا۔

''سلام میم صاحب........!!''وہ ہمارے سامنے آکر کہتا ہے۔

میری دوست فیروز جبیں اس سے پوچھتی ہے۔''کیا تم کبھی ہندوستان میں رہے ہو؟''

''نہیں.......میں ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا اس لیے ہندوستان نہ جاسکا!''وہ مسکرا کر کہتا ہے۔

''اچھا........!''فیروز اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔وہ اسی طرح مسکرا کر تھینک یو کہتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

''ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا''........فیروز دہراتی ہے اور اب ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں کے آگے بھیک مانگتا ہے اور ابھی ایک جنگ اور ہوگی؟؟''

سامنے سے اطلانتک پار والے سپاہیوں کا ایک غول گذر جاتا ہے۔میں اور فیروز سنیما کے اندر جا کر لارونڈ دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

لارونڈ.......زندگی کا میری گوروانڈ......؟!!

تو بھائی فیروز یہ سلسلے ہیں۔رات کو میں آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر فیروز سے کہتی ہوں۔یہ ہمارا پرانا لطیفہ ہے۔یونیورسٹی میں ہم جب اکٹھے پڑھتے تھے تو شام کو ہوسٹل کی ڈائننگ ٹیبل پر دن بھر کے سارے ضروری واقعات، یونیورسٹی پالیٹکس اور اسکنڈلز ایک سانس میں گوش گذار کرنے کے بعد میں فیروز سے کہتی تھی۔تو یہ سلسلے ہیں بھائی صاحب........!!

اور یہ کملا ہے یہ صاحب ہندوستان کی فارن سروس کی ایک بڑی ذمہ دار رُکن ہے پر اب تک لگتا ہے کہ ابھی ابھی اپنی کلاس کا کوئی پیریڈ گول کر کے کالج سے بھاگی چلی آرہی ہے۔اس کا فلیٹ چیلسی میں ہے۔لہٰذا آرٹ وارٹ کا چکر اس کے یہاں بہت رہتا ہے۔

کینیڈا کا انٹلکچوئیل تاریخ اور پولیٹکل سائنس کا ماہر برتی بلیٹن برگ جائینی رائے کی ایک تصویر کو بے دھیانی سے الٹ پلٹ رہا ہے۔ برتی آج کل بیک وقت دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینیڈا کی اقتصادی تاریخ اور دوسری کچھ اور اسی قسم کی چیز ہے۔ دونوں کتابیں بڑے پروگریسو نظریے سے لکھی جارہی ہیں۔اپنی کم عمری کو چھپانے کے لئے ہزوقت بے حد سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروگریسو......؟ افوہ.........افسوس یہ ہے کہ تم تو پچھّم کے زوال پرست انٹلکچوئیل بھی نہیں ہو۔کولونیل انٹلکچوئیل ہو.........میں اسے جلانے کے لئے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹلکچوئیل ہی سے وحشت ہوتی ہے اور پھر کینیڈا کی یہ مخلوق......؟ افوہ........ یہ کولونیل لوگ بھلا کیا کھا کر انٹلکچوئیل بنیں گے۔ بھائی جو تمہارے باپ کے چین اسٹورز ہیں کینیڈا میں اُنہیں میں مگن رہو (برتی جب اپنی بے تحاشا طویل و عریض امریکن کار میں سڑکوں پر سے گذرتا ہے۔خصوصاً کنٹری سائڈ کے قصبوں کی پتلی پتلی سڑکوں پر سے تو راہگیر رک کر کار کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔امریکن کاریں انگلستان میں بہت کم نظر آتی ہیں۔انگلش کاریں جو اُن کے سامنے بالکل کھلونا ایسی دکھلائی دیتی ہیں۔راہ گیر حیرت سے امریکن کاروں کو کبھی کبھی چھو کر بھی دیکھ لیتے ہیں........)

اور پھر کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر ترقی پسند نظریہ........(جھگڑا جاری رہتا ہے)

برطانیہ عظمیٰ کے انقلابات.......!! میاں انقلاب تو ایشیا میں آتے ہیں۔دو سال میں ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔مہینوں اور ہفتوں میں دنیا ادھر سے ادھر کر دی جاتی ہے یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے دو سو سال تک انڈسٹریل ریولیوشن گھسٹا۔پھر اسٹیم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کانوں کا سلسلہ رہا۔ بھائی دنیا کی تاریخ تو ایشیا میں بن رہی ہے۔آیا خیال میں؟ میں کہتی ہوں۔

کیا میلوڈریمٹک اپروچ ہے آپ کی.......!! جم کہتا ہے۔

ابھی ابھی جم اپنے ایسوسی ایشن کے دفتر سے واپس آیا ہے۔ جم بھی رونلڈ کی طرح انگریز ہے۔جدید سنگ تراشی اس کا مشغلہ ہے اور چونکہ وہ بھی چیلسی میں رہتا ہے لہٰذا اسے بھی اپنے آپ کو فن کار سمجھنے پر مجبور کیا جاتا رہتا ہے، حالانکہ وہ مُصِر ہے کہ وہ بے حد پریکٹیکل آدمی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ نمستے کرتا ہے اور سارے قدیم ہندو فلسفے اس نے گھول کر پی رکھے

ہیں۔گاندھین طرزِ زندگی کا سخت قائل۔دنیا کے سارے پروبلمز کا حل صرف اس نے دریافت کرلیا ہے۔وہ یہ کہ ہم سب کو شخصی Cells بنانے چاہئیں اُن میں رہتے ہوئے اور اُن سے آگے بڑھ کر ہم سوسائٹی کی اصلاح کریں گے اور زندگی لامحالہ نہایت سیدھی سادی اور پرسکون ہوجائے گی۔اسی شخصی درجہ معرفت کی آئیڈیلزم کے چکر میں اِس کی غیر سیاسی انسانیت پرست ایسوسی ایشن کی طرف سے پچھلے دنوں چنداللہ والے مہاپرش کراچی گئے تھے۔اُن میں فرانسیسی ،سوئس، ڈچ اور غالباً انگریز مرد اور عورتیں تھیں۔ یہ لوگ لالوکھیت میں کئی مہینے مہاجرین کے ساتھ رہے۔دن رات لگ کر انہوں نے مکان تعمیر کئے۔دن بھر وہ اینٹ اور گارا ڈھوتے تھے اور رات کو چٹائیوں پر پڑ کر سو رہتے تھے۔کیا روحانی بلندی ہے، واللہ........!!میں جم سے کہتی ہوں۔

مصیبت یہ ہے کہ جم مذہبی بھی نہیں ہے لیکن انقلاب کا قائل نہیں۔ بڑا سخت Pacifist اس کے خیال میں سوویت یونین اور مغربی ممالک دونوں تباہی کے راستے پر جارہے ہیں۔اچھا خاصا جین مت کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔بس ہر ایک کو مکمل شخصی آزادی اور امن حاصل ہونا چاہئے اور سب کو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں رہنا چاہئے۔

جم اگر خداپرست، ہوتا تو بڑا عمدہ رومن کیتھولک فادر ثابت ہوتا گڈ اولڈ جم............

کرشنا مینن رٹائر ہوگئے ہیں۔جب تک وہ ہائی کمشنر رہے پرانی انڈیا لیگ ہاؤس میں انہوں نے اپنی رہائش کے لئے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔جس میں ایک طرف چائے بنانے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتابوں اور اخباروں کے انبار بکھرے رہتے تھے۔

اور اب رات ہورہی ہے۔سڑک کے کنارے کنارے گھومنے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے بھکاری جو فٹ پاتھ پر رنگین چاک سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دیوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور راہ گیر کو دھندلی، پرامید آنکھوں سے دیکھتے ہیں، فٹ پاتھ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوتا ہے...... یہ میں نے جھیل اور چاندنی رات کی تصویر بنائی ہے،لیکن چونکہ چاک سے سارے رنگ اجاگر نہیں ہوسکتے اور کاغذ یا کینوس کے

بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پاتھ کی زمین ہے۔ اس لیے تصویر ایسی نہ بن سکی جیسا میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات گذارنے کے لیے کوئی جگہ، یا سونے کے لیے کوئی پلنگ نہیں ہے ....وغیرہ وغیرہ۔

سڑکیں سنسان ہو چکی ہیں۔ زمین دوز ریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں متوسط طبقے کے باولر ہیٹ اور چھتریوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔

کوئی سیاح اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا بد مذاق شہر ہے جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں کل پیرس جا رہا ہوں.........شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے گئے ہیں باہر خنک ہوا چل رہی ہے کل سردی ہوگی۔ نیچے سڑک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری بچے کھچے پرچے سمیٹ رہے ہیں۔ جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ ایوا پیروں مر گئی۔ شاہ فاروق کو نکال باہر کیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق رونے لگے۔ روسیوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہیں گے۔ میں اور فیروز اور کملا اور حایا اور نینسی اور اُن کے علاوہ رونلڈ اور رالٹ ملر اور برتی اور جم سب سو جائیں گے۔ کیوں کہ یہ آج کا دن بھی ختم ہوا۔

کل کیا ہوگا۔ یہی سوال ۱۹۳۸ء میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے......دیکھو............!

اب تمہاری خاطر کوئی ڈینیل فیصلے کے لیے نہ آئے گا۔

ستمبر کا چاند

اور ٹو تنگ نے کہا
مجھے اب تک وہ زمانہ یاد ہے
جب مورخوں نے ان باتوں کے لیے
تاریخ کے صفحات خالی چھوڑ دیے تھے
جنہیں وہ نہ جانتے تھے
خوبانی کے شگوفے ہواؤں کے ساتھ
مشرق سے مغرب کی طرف اُڑ رہے تھے
اور میں اُن کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں

ایذرا پاؤنڈ (تیرہواں کنٹیو)

"میں نے ایک روز ایک لڑکی کو دیکھا"
جو ایک چٹان پر اُگی ہوئی گھاس پر جھکی رو رہی تھی
خزاں کی ایک خاموش شام
وہ گھاس تنہائی میں چپکے سے مرجھا گئی[1]
میں نے کتاب گھاس پر رکھ دی۔
"آزاد دُنیا کے یہ مصنفین" ____ فرانسیسی ادیب نے کہنا شروع کیا۔

---

[1] ماؤ کاؤ کی ایک نظم۔

''ہم نے طے کیا تھا کہ کم از کم آج کی شام سیاست کی بات نہیں کریں گے۔ دیکھو یہ ادیبوں کا اجتماع ہے اور پولیٹیکل پلیٹ فارم بنتا جا رہا ہے۔'' میں نے اکتا کر جواب دیا۔

''پولیٹیکل ____ ؟ کل ہی تو میں نے بہت دیر تک جن تکامی سے جاپانی ناول میں خود وجودیت کی تحریک کے متعلق تبادلۂ خیال کیا۔'' پھر دفعتاً وہ رُک گیا۔ سامنے سے چیکوسلواکیہ والا ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ مصوّر بھی تھا اور ہر سمے خاموشی سے اسکیچ بنایا کرتا تھا۔

قریب کی ایک لاؤنج میں سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شیشوں کے طویل برآمدے کے سامنے فوارے چل رہے تھے۔ دو امریکن مصنف بید مجنوں کے راستے پر سے گزر گئے۔

''اشٹین بک بے چارے اب تک زکام میں مبتلا اپنے کمرے میں بند پڑے ہیں۔ ژاں نے اظہارِ خیال کیا۔

'زکام وکام نہیں'۔ میں نے جواب دیا۔ وہ نکلنا نہیں چاہتے، ورنہ یہ جاپانی مارے عقیدت کے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ تم کو کچھ اندازہ ہوا انگریزی زبان کے ادیبوں کی مقبولیت کا، یہاں کیا عالم ہے ____ ؟''

''واقعی ہر پڑھے لکھے جاپانی نے سارا مغربی ادب گھول کر پی رکھا ہے۔ تین تین یوروپین زبانیں جانتا ہے مگر انکسار کا یہ عالم کہ بس بچھے جا رہے ہیں۔''

عین اسی لمحے ایک جید جاپانی ناول نگار آن موجود ہوئے۔ وہ سامنے کھڑے جُھک جُھک کر کہہ رہے تھے۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو خاتون! تو اندر چلئے لاؤنج میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میرے نہایت ادنیٰ جھونپڑے میں قدم رنجہ فرما کر چا ____ ''

میں نے کتاب گھاس پر سے اُٹھالی۔ ارادہ یہ تھا کہ اگر چند منٹ کی مہلت ملے تو کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھوں گی مگر یہ جاپان ہے جہاں ادیبوں کی بین الاقوامی کانگریس کا انتیسواں سالانہ اجلاس ہونے والا ہے اور ہر جاپانی کا فرض ہے کہ وہ خاطروں کے مارے مہمانوں کی جان نکال لے۔ صبح جان اشٹین بک سے جب شکریے کے کوئی الفاظ نہ بن پڑے تو انہوں نے عاجز آ کر کہا کہ تعذیب کا سب سے خوبصورت طریقہ یہ ہے کہ اتنی تواضع کرو کہ مہمان آدھ موا ہو کر رہ جائے۔

امپیریل ہوٹل کی سُرخ قالینوں والی فرلانگوں لمبی گیلریوں میں رپ رپ کرتی خادمائیں سفید فراکوں میں ملبوس سائے کی طرح گزر رہی ہیں، کسی ایک گیلری میں سے مادام صوفیہ وادیا مدراسی ساری پہنے بالوں میں پھول لگائے باہر نکلتی ہیں اور کیمرہ مین ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں____ گرل روم میں بیٹھے ہوئے ایلمر رائس یا آندرے شاژون کوئی دلچسپ سا جملہ کہتے ہیں اور وہ شام کے سارے اخباروں میں چھپ جاتا ہے کانگریس کے سکرٹریٹ میں رات رات بھر کام ہو رہا ہے۔ خداوند! یہ تم نے ایک کانگریس اپنے ملک میں بلائی ہے یا اپنے شہنشاہ کی تاجپوشی منعقد کر رہے ہو۔ یہ جوش و خروش تو ہم نے ملکہ ایلزبتھ کے کارونیشن کے وقت انگلستان میں نہیں دیکھا تھا مگر جاپانی جو کام کریں گے اس میں تن من دھن سے لگ جائیں گے جان دے کر اسے مکمل ترین بناڈالیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے شہنشاہ کو دیوتا سمجھ کر اس کی خاطر جنگ میں نہ کود پڑتے۔ اور پھر اپنی شکست کے بعد اسی ملک کی تعمیرِ نو چند سال میں ایسی نہ کرتے کہ آج وہ مغربی جرمنی کی طرح فری ورلڈ میں دوبارہ سب سے آگے نکل گیا ہے۔

یہ آدمیوں کی نہیں جناتوں کی قوم ہے۔

ہر اَن دیکھے ملک کے متعلق ایک بے تکا سا تصور ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ جاپان کے متعلق بچپن میں مندرجہ ذیل تصورات تھے۔ ہیرا کیری گیشا گرلز، چیری کے شگوفے، فیوجی یاما، کیمونو سستا مال یعنی کہ علی گڑھ اور پنجاب کے میٹرک کو ہائی اسکول کے زمانے میں جاپانی میٹرک کہا کرتے تھے اس کے علاوہ ہر سستی چیز جاپانی کہلاتی تھی۔ پرل ہاربر کے بعد معلوم ہوا کہ درختوں اور پھولوں کی عاشق قوم فاشسٹ درندوں میں تبدیل ہوگئی ہے جس کا قلع قمع کرنا برطانوی ہند کے ہر سپاہی کا فرض تھا۔ لاکھوں سپاہی ان پیلے وحشیوں سے لڑتے مشرق بعید اور برما کے محاذوں پر امر رہے۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ یہ لوگ تو دراصل ایشیائی حریّت کے علمبردار ہیں اور ایشیا کو مغربی شہنشاہیت سے نجات دلانے کے لیے جہاد کر رہے ہیں آئی این کے سور ما سبھاش بوس کی قیادت میں ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ان ایشیائی جانبازوں سے جا ملے۔ نتیجہ بہر حال یہ رہا کہ سارا مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا خون اور آگ کے سمندر میں ڈوب گیا۔

پھر ہیروشیما نے دفعتاً ہوا کا رُخ بدل دیا۔ ساری مہذب دنیا کی ہمدردی جاپان کو حاصل ہوگئی۔ ہیروشیما ایک عظیم لرزہ خیز سمبل قرار پایا۔

امریکہ کا قبضہ ہوا۔ میک آرتھر آیا۔ جاپانی معاشرے کی کایا پلٹی۔ وہ فیوڈل جنگ پرست رومینٹک ساج خواب وخیال بنا۔ شہنشاہ نے سوٹ پہنا اور وہ سورج دیوی کی اولاد کے درجے سے اُتر کر انسان بنا۔ جی آئی سپاہیوں نے جاپانی لڑکیوں سے شادیاں رچائیں۔ مارشل ایڈ آئی جاپان امریکہ کا اتحادی بنا اور اس وقت وہ ایک زبردست تجارتی اور صنعتی طاقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ دس سال کے ہیر پھیر میں کیا سے کیا ہوگیا۔ (بہت سے ملکوں میں دس سال کے ہیر پھیر میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔)

صرف تین دن قبل میں یہاں پہنچی تھی۔ اس وقت بحرالکاہل کی شمالی وسعتوں پر ہلکے پھلکے بادل تیر رہے تھے۔ افق کے قریب سمندر میں سے نکلے ہوئے پہاڑی سلسلے پر دھند جمع ہو رہی تھی۔ نیچے حدنظر تک سبز جزیرے تھے اور پائن کے درخت اور گاؤں اور ان پر تیرتے ہوئے بادلوں کو ہوائی جہاز کی کھڑکی میں سے مجھے دیکھ کر دفعتاً معلوم ہوا کہ جاپانی تصاویر کے ہلکے خطوط، ادب لطیف اور مدھم رنگوں کے کیا معنی ہیں۔

ہوائی جہاز سمندر پر اترتا دفعتاً رن وے پر آگیا جو پانی سے ملی ہوئی تھی۔ فوٹوگرافروں اور مووی کیمرہ مین کی ایک فوج کی فوج اپنے فلیش گنز سنبھال کر ہوائی جہاز کی طرف لپکی میرے ساتھ مشہور امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس بھی ہانگ کانگ سے سوار ہوئے تھے جو جاپان میں بے حد مقبول ہیں مختلف اوقات پر مختلف طیاروں سے دور دور کے ملکوں کے ڈیلی گیشن ایرپورٹ پر اُتر رہے تھے اور بڑی زبردست چہل پہل تھی ٹوکیو کا عظیم الشان ایرپورٹ امریکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر امریکن فوجی گاڑیوں اور طیاروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ بے چارے جاپانی میں نے دل میں کہا۔

باہر آ کر ہم ٹوکیو کی طرف روانہ ہوئے۔ ''چند سال قبل یہ سارا شہر راکھ اور ملبے کا ڈھیر تھا دو تہائی ٹوکیو امریکن بمباروں نے تباہ کر دیا تھا۔ اس وقت یہ دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے'' جاپانی منتظم نے کار کی اگلی سیٹ پر سے مُڑ کر مجھے خطاب کیا۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شام کا اندھیرا گرتا آرہا تھا اور دور سے ٹوکیو کی

اسکائی لائن جگمگا اُٹھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی جگہ کا اوّلین امپریشن سب سے حقیقی اور دیرپا ہوتا ہے۔ سڑکوں پر موٹروں اور بسوں کی ریل پیل تھی۔ مغربی لباس پہنے عورتیں اور مرد نہایت سکون سے ٹرام کاروں کے انتظار میں قطاریں بنائے کھڑے تھے ہلڑ نہیں تھا خوانچے والے آوازیں نہیں لگا رہے تھے لاؤڈ اسپیکر سے فلمی گانے نشر نہیں ہو رہے تھے۔ کوڑے کے ڈھیر نہیں تھے۔ مگر۔ میں نے سوچا ویسٹ اینڈ تو دُنیا کے ہر بڑے شہر کا مرعوب کن ہوتا ہے۔ یہاں سلمز بھی تو ہوں گے فقیر بھک منگی عورتیں ننگے پیر پھرنے والے آوارہ گرد بچّے۔ میں ان سب کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ موٹر انتہائی شاندار عمارتوں کے سامنے سے بے حد چوڑی سڑکوں پر سے گزرتی ایک پگوڈا کی وضع کی عمارت کی برساتی میں داخل ہوئی جس کے سامنے تالاب میں کنول کھلے تھے۔

یہ امپیریل ہے یہاں کا سب سے پرانا اور مشہور ہوٹل اور دُنیا کی گراں ترین قیام گاہوں میں سے ایک۔ اسے عظیم امریکن معمار فرینک لائیڈ رائٹ نے بنایا تھا یہ زلزلوں اور بمباری سے بچا رہا ہے۔ لوبی میں کانگریس کے مندوبین آ آ کر اتر رہے ہیں۔

''اے لو وہ ایلبر ٹو مراویا آئے۔''

''یہ اپنا بیگ سنبھالے جارج یکشن اترے۔''

''ارے ڈوس پیسو بھی ہیں۔

''او ہو ڈاکٹر سری نواس آئنگر بھی آن پہنچے۔''

''رادھا کرشنن نہیں آئے؟''

''نہیں۔ بلایا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی گیا تھا۔ مگر حکومت کی مصروفیات کی وجہ سے دونوں صاحبان نہیں آسکے۔''

''ہاں! ہاں! اور وہ کون ہیں؟''

''ارے یہی تو جان اسٹین بک ہیں!''

یہ بڑا زبردست اجتماع ہے اٹھائیس ممالک سے دو سو کے قریب مصنفین نے دنیا کے چاروں کھونٹ سے شرکت کی ہے۔ دور دراز آئس لینڈ اور برازیل سے لے کر آسٹریلیا اور لبنان تک سبھی موجود ہیں مشرقی یوروپ سے بلغاریہ چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے

کمیونسٹ ادباء آئے ہیں مگر عوامی جمہوریہ چین یہاں موجود نہیں۔ کیوں کہ آج جاپان اس ملک کے وجود ہی سے منکر ہے جس سے اس نے اپنی تہذیب مستعار لی۔

''سیاست تم ایشیائیوں کے اعصاب پر کیوں سوار رہتی ہے؟'' مصنوعی چٹان پر بیٹھے بیٹھے ژاں نے مڑ کر مجھ سے کہا۔

''یہ سوال تو آپ اسٹیون اسپنڈر سے کیجئے۔ آخر وہ شاعری پر اکتفا نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے۔ سیاست تو میرے اعصاب پر اس لیے سوار ہے کہ اس کی وجہ سے ہم نے بڑے بھیانک دُکھ اُٹھائے ہیں اور اس وقت بھی اُٹھا رہے ہیں۔''

''اچھا تو آؤ زین فلسفہ پڑھیں۔ یہ جاپان ہے اور پائن کے درختوں پر خزاں کے بادل چھائے ہیں وغیرہ۔''

''زین کا مطلب تمہیں معلوم ہے؟'' میں نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

''نہیں۔''

''زین سنسکرت کے لفظ دھیان کی جاپانی شکل ہے اور چین سے یہاں آیا۔ اب آگے پڑھو۔''

اُس نے دوبارہ کتاب کھولی۔

''بیل تو کبھی نہ گُما تھا پھر اسے ڈھونڈھنے سے کیا فائدہ۔ چرواہا خود اپنے کو کھوئے بیٹھا ہے۔ جنگل کی تنہائی میں چرواہا اپنے بیل ڈھونڈھ رہا ہے۔ چاروں اور پانی کے جھرنے ہیں اور پہاڑیاں اور پگڈنڈیاں تھکا ہارا وہ نہیں جانتا کدھر جائے۔ اسے تو صرف میپل کے جنگل میں ٹڈوں کے گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

''سامنے سے مسٹر اسپنڈر گذرے وہ خاموشی سے باغ عبور کر کے اپنے کمرے کی اور جا رہے تھے۔

میں نے پھر کتاب اُٹھالی۔

سُتروں کی مدد سے اس بیل کے نقش پا تو مل گئے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ گو برتنوں کی شکلیں مختلف ہیں مگر سونا ایک ہی ہے اور خارجی دنیا دراصل پرم آتما کی مظہر ہے لیکن ابھی تک وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر پایا۔ ندی کے کنارے درختوں کے نیچے بیل کے قدموں

کے نشان بکھرے ہوئے ہیں مگر خوشبودار گھاس اتنی گھنی ہے کہ چرواہا اس میں اپنا راستہ تلاش نہیں کر پایا۔"

جھیل کے کنارے ٹہلتے ہوئے چند فرانسیسیوں نے نیچی آواز میں گنگنانا شروع کر دیا ایک جاپانی وائلن نواز درختوں کے جھنڈ میں ویبر بجا رہا تھا۔فرانس نے سب سے پہلے بڑا وفد بھیجا ہے جس میں پچاس سے زیادہ خواتین اور حضرات شامل ہیں۔فرانسیسی مقبوضہ الجزائر سے ایک مسلمان خاتون مادموزیل جمیلہ دربیش تشریف لائی ہیں مگر وہ غالباً خود کو مسلمان یا عرب کہلوانا پسند نہیں کرتیں لہٰذا میں عرصے تک انہیں فرنچ ہی سمجھا کی اکادمی فرانس کے رکن موسیو آندرے شازوں جو تنظیم کے بین الاقوامی پریذیڈنٹ ہیں یہاں بھی صدارت کریں گے۔مصر سے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد عوض تشریف لائے ہیں جو اسکندریہ یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں۔انگلستان سے اسٹیون اسپنڈر، انگس ولسن الیکس واہ اور مشہور ہنگرین نژاد مزاح نگار جارج مکیش کے علاوہ دس بارہ اور لیکھک بھی ہیں۔ان میں سے ایک جے ایل کرینمر بنگ کیمبرج کا تاریخ اور چینی ادب کا اسکالر ہے WISDOM OF THE EAST کے سلسلے کی کتابوں کا ایڈیٹر اور پبلشر بھی آج کل ہانگ کانگ یونیورسٹی میں مشرق بعید کی تاریخ کا استاد ہے۔یہ اور امریکہ کا ڈونلڈ کین کیمبرج میں ہم جماعت تھے۔ڈونلڈ کین جاپانی کا مشہور مترجم اور اسکالر ہے اور کولمبیا یونیورسٹی میں جاپانی پڑھاتا ہے۔

مشرقی جرمنی کے ناول نگار بوڈو یوزے بنّے بھائی کے دوست ہیں۔پچھلے دنوں بنے بھائی جب مشرقی جرمنی گئے تھے تو انہی کے یہاں ٹھہرے تھے۔اُن کی پہلی امریکن بی بی موجودہ مسز ایم این رائے ہیں۔دوسری بی بی امریکن ہیں۔یہ پچھلے سال ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں دلّی گئے تھے۔

مغربی جرمنی کے نمائندوں میں ایک بوڑھے پھوس انڈولوجسٹ اور مستشرق ڈاکٹر ہیلمتھ فان گلینسپ شامل ہیں۔یہ مغربی جرمنی کی ٹبنگین یونیورسٹی میں انڈولوجی اور فلسفہ مذہب کے اُستاد ہیں کانٹ اور مشرق کے مذاہب اور غیر مسیحی مذاہب اُن کی تازہ ترین تصانیف ہیں۔

ہندوستان سے ڈاکٹر سری نواس آئنگر آئے ہیں جو آج کل آندھرا یونیورسٹی میں

انگریزی کے استاد ہیں۔ ترچنا پلی کے تامل ادیب اور فلسفی بہت بوڑھے ایم آر جمو ناتھن جن کے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور جو پہلی بار اپنے وطن سے دُور طویل سفر پر آئے ہیں۔ مرہٹی ادیب و نائیک کرشنا گوگ جو عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ احمد آباد کے اسکول آف گجراتی لنگوتج اینڈ لٹریچر کے ڈائریکٹر او ماشنکر جوشی بنگال کے مسٹر رائے مرہٹی ادیب پربھاکر پدھیے بمبئی کی فرانسیسی نژاد مادام صوفیہ وادیا نیو یارک لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں انہوں نے سنسکرت پالی اور قدیم فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان پچھلے تیس سال سے بہت شدید قسم کی ہندوستانی ہیں۔ اُن کے علاوہ شریمتی کملا ڈونگر کیری ہیں جو کونکنی اور انگریزی کی مصنفہ ہیں اُن کے میاں بمبئی یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں اور یہ خود انڈین ویمنز یونیورسٹی کی فیلو۔ الہٰ آباد کے شری واتسائن ہندی کے مشہور ادیب۔

انڈونیشیا سے علی سجان سلطان تقدیر تشریف لائے ہیں جدید انڈونیشی ادب کے پیش رو اور فلسفی اور جکارتا کی قومی یونیورسٹی کے نائب صدر ہیں۔ اُن کے ایک ناول کا نام ''بتارن میگھ'' ہے۔ یعنی بکھرے ہوئے بادل۔ ایک ڈچ انڈونیشین ناولسٹ بھی آئی ہیں جو خود کو خالص انڈونیشین کہلانا پسند کرتی ہیں اور بڑی زبردست قوم پرست۔

جنوبی کوریا سے خواتین و حضرات کی ایک کھیپ کی کھیپ آئی ہے جن کو سیاسی پروپیگنڈہ ہی سے فرصت نہیں۔ ان سب کو خاصا کومک سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ سے اسٹین بک ڈوس پیسس، ایلمر رائس، جان ہرسی، ایلزبتھ دائننگ (جو چند سال پہلے جاپانی شہزادوں کی اتالیق بھی تھیں) اور ڈونلڈ کین یونیسکو کی نمائندگی فرانس کا روجر کیلوا کر رہا ہے جو تنقید کی بہت سی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ پابلو نیرودا کے مترجم کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ برازیل کا شاعر فاؤستینو نا سمنیو نشاۃ ثانیہ کی ادبیات کا پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ قانون داں بھی ہے اور برازیل کے سپریم کورٹ کا جج ہے۔ اسرائیل کا ادیب مصر والے سے نہیں بولتا۔ قوم پرست چینی کمیونسٹ ادیبوں سے کتراتے ہیں۔

ایک گروہ اور ہے یہ لوگ ''جلا وطن'' ادیب کہلاتے ہیں۔ یہ مشرقی یوروپ کے لوگ ہیں جو زیادہ تر لندن، پیرس اور نیو یارک میں رہتے ہیں۔ پولش جلا وطن الگزنڈر جنٹا جس

کی ایک کتاب غلامی کے صحن ۱۹۴۷ء میں مہاتما گاندھی کے لکھے ہوئے دیباچے کے ساتھ چھپی تھی۔ اس گروپ میں ہنگرین جلاوطن پال تبوری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی بی بی مادام تبوری جو کیٹ بارلے کے نام سے لکھتی ہیں کسی زمانے میں پری رہی ہوں گی چالیس کے پیٹے میں ہیں مگر اب بھی بے حد خوبصورت نظر آتی ہیں۔ یہ بھی ہنگرین نژاد ہیں۔

فرانسیسی بہت زندہ دل، انگریز بے حد خاموش۔ اسٹین بک اپنی کتابوں کی مانند نکلے۔ چہرے پر ایسا ایکسپریشن رہتا ہے جیسے بے حد محظوظ ہو رہے ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مجھے لکھنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ گھر کے سودا سلف کا حساب بھی بیوی کو نہیں لکھنے دیتا خود ہی لکھتا ہوں۔ بلغاریہ کا ادیب معلوم ہوتا ہے کسی سنٹرل یوروپین جاسوسی فلم میں ایکٹنگ کر کے چلا آ رہا ہے۔ برازیل والا بھی عین مین لیٹن ایکٹر معلوم ہوتا ہے۔ یوروپین اور جنوبی امریکن حسب عادت سخت شولرس ہیں۔ اینگلوسکسن ادیب اینگلوسیکسن ہیں۔

ایک عظیم الشان دس منزلہ عمارت میں جو ایر کنڈیشنڈ، ساؤنڈ پروف اور الٹراموڈرن طرزِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس طرح کی عمارات بعد از جنگ سینکڑوں کی تعداد میں تعمیر کر لی گئی ہیں کانگریس کی انٹرنیشنل ایگزیکیٹو کونسل کا پہلا اجلاس ہو رہا ہے پانچویں منزل پر ایک ہال میں جہاں نشستوں کی ترتیب یو این او کے مانند بنائی گئی ہے۔ چھت میں چھپی ہوئی روشنیاں ستاروں کی مانند جھلملا رہی ہیں۔ چاروں اور کیمرے اور ٹیلی ویژن نصب ہیں۔ ایک دیوار پر لکڑی کی لمبی چوڑی ساؤنڈ پروف بالکنی میں مترجم لڑکے اور لڑکیاں ہیڈفون لگائے مائیکروفون لیے بیٹھے ہیں ساری کارروائی کا بیک وقت انگریزی اور فرانسیسی اور جاپانی میں فوری ترجمہ ہوتا جا رہا ہے اس وقت کونسل کے سامنے ہنگرین ادباء کا مسئلہ ہے بند کمرے کا اجلاس ہے لوگوں پر سخت سنجیدگی طاری ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہنگری میں پچھلے دنوں لکھنے والوں پر جو ظلم توڑے گئے ہیں اُن کی تحقیقات کون کرے اور کس طرح۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کون جائے اور سوال یہ ہے کہ بلّی کون ہے۔

بڑا زبردست کھنچاؤ فضا میں پیدا ہو گیا۔ مشرقی یوروپ کے نمائندے جو انگریزی نہیں سمجھتے اپنے اپنے ہیڈفون پہن کر انہماک سے فرانسیسی ترجمہ سننے میں مصروف ہو گئے۔

موسیو پال تبوری نے جوش و خروش سے بولنا شروع کیا۔ یہ پچھلے بیس سال سے لندن میں رہتے ہیں پھر دوسرے ہنگرین پال اگینوئس نے کہا'' میرے وطن کے بہت سے ادیب پاگل ہو گئے ہیں جیلوں میں بند ہیں۔ان کو تھرڈ ڈگری کیا گیا۔''

کمیونسٹ لیکھک آرام سے بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ پال تبوری کی تقریر کے بعد بڑے زور شور کی تالیاں بجیں۔ کمیونسٹ سگریٹ پیتے رہے۔ ہندوستان اور مصر کے نمائندوں نے بھی کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا۔ ہندوستان نے حسب معمول مصالحت کی پیش کش کی۔ ہنگری کے مسئلہ پر ووٹ لینے کے سلسلے میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔

تب صدر آندرے شازوں نے ایک نہایت شاعرانہ تقریر کی۔

چونکہ یہ یو این او نہیں اور پیشہ ور سیاستدانوں کے بجائے ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہے لہٰذا اس خالص سیاسی مباحثے میں بھی فصاحت و بلاغت تشبیہوں اور استعاروں کے ہر طرف سے دریا بہائے جا رہے ہیں۔

آندرے شازوں نے کندھے اُچکا کر بڑی بیکسی سے کہا۔'' میں اس وقت تنہا ہوں۔ میرے سامنے بڑا زبردست فیصلہ ہے میں کیا کروں کدھر جاؤں ___ ؟''

جنوبی کوریا کے نمائندے نے چلا کر کہا'' ہنگری کو پی ای این کی تنظیم سے فوراً نکال باہر کیجئے۔ اصل ہنگرین ادیب وہ ہیں جو اس وقت جلاوطن ہیں کمیونسٹ ہنگری کا کوئی وجود ہم مانتے نہیں۔ جس طرح اصل چینی ادیب قوم پرست چینی ہیں کمیونسٹ چین مجرم ملک ہے۔''

اتنے میں کسی دل جلے نے ہال کے دوسرے کونے سے سوال اُٹھایا۔'' کیا میں پوچھ سکتا ہوں عوامی چین یہاں کیوں نہیں ہے؟'' پھر ہنگامہ شروع ہوا۔

دوسری طرف ہنگرین جلاوطن بولے چلے جا رہے تھے۔'' میں کہتا ہوں ادیبوں کو جیل بھیجنا غلط ہے۔'' وہ گرجے۔

ادیبوں کو برین واش کرنے کی کوشش کرنا بھی غلط ہے کسی اور بگڑے دل نے چپکے سے کہا۔

انطونی سلونی مسکی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دوسرا پولش ادیب اب باقاعدہ سو رہا ہے۔

ہال کی ایک سمت سے کسی نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ کیسا رائٹرز کلب ہے۔جس میں عوامی چین سوویت یونین اور شمالی کوریا نہیں۔ یہ امپریلسٹوں کا کلب ہے۔''

پھر بلہ ہوا ہر ایک نمائندے نے اپنے اپنے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون اپنی طرف کھینچے۔

جنوبی کوریا والا پھر چلایا۔ ''ہنگرین پی این سی سنٹر ختم کر دینا چاہیے۔''

مصر نے کہا۔ ''اگر ایسا کیا گیا تو آپ کے لیے یہ تحقیقات کرنے کون جائے گا کہ وہاں ادیبوں پر کیا مظالم ہوئے۔ اس وقت تک وہاں کے ادیب اس سنٹر کے ذریعے بین الاقوامی تنظیم سے منسلک ہیں۔''

آزاد دنیا اور آزادی کا لفظ بار بار اِدھر اُدھر سے لڑھکایا جارہا تھا۔

آزادی کیا شے ہے۔ میں نے سوچا۔ یہ بڑا مابعد الطبیعاتی سوال بن جاتا ہے۔ لکھنے والوں کی آزادی، سیاسی آزادی، ذاتی آزادی۔ فری ورلڈ کے لکھنے والے آزاد ہیں۔ جنوبی کوریا نے کڑک کر کہا۔

جبھی تو ہر وقت سیاسی پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی بگڑے دل نے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

'' آزادی سے لکھنا میرا مقصد ہے۔ ایک بلجیئن ادیب نے کہنا شروع کیا۔ ہم کسی طرح ہنگری کے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' میں نے فوراً ہیڈ فون پہنا۔ اس سے صرف ایک آدمی نے پال بتوری کی طرف اشارہ کرکے کہا'' وہاں کے گواہ اور پراسیکیوٹر اور جج کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ہم محض اس ایک آدمی کی گواہی پر بھروسہ کرلیں گے؟ امریکن فرانسیسی اور برطانوی انصاف کے تصوّرات سے یہ رویہ مطابقت نہیں رکھتا۔''

میں نے جھک کر بائیں طرف جھانکا جدھر امریکن بیٹھے تھے۔ اب ایلمر رائس کے سونے کی باری تھی۔

اب مشرقی جرمنی کا نمائندہ کہہ رہا تھا۔ ہنگرین جلاوطن ادیب نے ہمیں جو کچھ بتلایا اس سے بالکل متضاد خبریں ہمیں بوڈاپسٹ سے موصول ہوئی ہیں۔

دوسری طرف سے ویت نام کے نمائندے نے فرانسیسی میں کہا۔ ہم امن کے نام پر

یہاں جمع ہوئے ہیں اور ہم ویت نام کے ادیب چاہتے ہیں کہ امن کے لیے لکھیں۔

''امن''۔ میں نے دل میں سوچا۔ آزادی کی طرح آج کل کی اصطلاحات میں یہ ایک اور عجیب و غریب لفظ ہے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' شام کو میں نے مسٹر رائے سے کہا ہم لوگ ایک شاہی محل کے ایسے عظیم الشان ایوان ضیافت میں ایک میز کے کنارے کھڑے کچی مچھلی نگلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

''ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔'' انہوں نے کہا'' پچھلے دن میں جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ تم اس میں کیوں نہیں آئیں؟''

''مجھے بلایا تو گیا تھا۔'' میں نے مچھلی کے کانٹے نکالتے ہوئے جواب دیا۔'' مگر میں اپنے آپ کو ایماندار سمجھتی ہوں اور ایمانداری کا تقاضا یہ تھا کہ میں پاکستان کی نمائندگی دلّی میں نہیں کر سکتی تھی یہ ایک تیسرا ملک ہے۔ غیر جانبدار زمین۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔'' مجھے ڈھاکے میں بنگالی ادباء کی کانفرنس کے لیے بلایا گیا تھا۔ لیکن مجھ میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔''

ایک امریکن ادیب نے قریب آ کر کھانے پر اظہارِ خیال شروع کیا۔'' میں آپ لوگوں کی باتوں میں مخل تو نہیں ہوا؟'' اس نے کہا۔

''نہیں تو۔'' مسٹر رائے نے جواب دیا۔'' ہم لوگ اپنے خاندانی جھگڑے کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ایک خاندان میں پھوٹ پڑ جائے اور دو سگے بھائی اپنے آبائی مکان کا بٹوارہ کر کے علیحدہ ہو جائیں تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان میں دوبارہ اتفاق پیدا ہو سکے۔

مسٹر رائے آئی سی ایس سے ریٹائر ہونے کے بعد شانتی نکیتن میں رہتے ہیں۔

''میری آخری پوسٹنگ مرشد آباد میں تھی۔'' انہوں نے کہا۔'' درمیان میں گنگا ہے دوسرے کنارے پر راج شاہی ہے گنگا میں کشتی کی اگر چند لہریں اُدھر ہو گئیں تو پاکستان میں پہنچ جاتی ہے۔ وہاں خوب اسمگلنگ ہوتی تھی اور واقعات جو نئی انڈو پاکستان اصطلاح میں سرحد کے تنازعات کہلاتے ہیں۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی تھیں اور لوگ مارے جاتے تھے گنگا کے ہندوستانی کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھو تو راج شاہی کی سول لائنز کی کوٹھیاں نظر آتی ہیں

جہاں پاکستان سول سروس کا حاکم رہتا تھااور وہ بھی اس طرح اسمگلنگ کی روک تھام اور بارڈر کے جھگڑوں کے سلسلے میں گولیاں چلواتا تھا۔ راج شاہی بھی ایک زمانے میں میرا وطن تھا۔''

اور ممکن ہے کہ راج شاہی کے اس حاکم ضلع کا وطن مرشد آباد رہا ہو۔

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔''

یہ ٹوکیو کے ایک عظیم الشان کلب کا جگمگاتا ہوا ہال نہیں تھا جس میں سینکڑوں اجنبی غیر ملکی ڈنر سوٹ اور ایوننگ گاؤن پہنے ہاتھوں میں شمپین کے گلاس لیے کلچر اور امن کی باتیں کررہے تھے۔ ہم تو اس وقت گنگا کے اندھیرے ساحل پر کھڑے تھے دکھیاری گنگا جس کی لہروں پر کشتیاں چل رہی تھیں جن میں چراغ ٹمٹماتے تھے اور ملاح بھٹیاری گاتے ہوئے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس اندھیرے میں دونوں ساحلوں پر آمنے سامنے بندوقیں تانے سپاہی ایک دوسرے کی طرف رُخ کیے بیٹھے تھے یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔ یہ میرے لیے ہیروشیما کے تصور سے زیادہ لرزہ خیز تھا۔ میں ہال کے دوسرے سرے جہاں ایک امریکن بڑھیا، ایک نامور امریکن شاعر کی بیوہ ایک کونے میں چپکی کھڑی تھی۔

'' کہئے کیا حال چال ہیں؟'' میں نے اس سے کہا۔

''سنو! امریکن بڑھیا نے اچانک اس طرح مجھے مخاطب کیا گویا کوئی بے حد اہم بات بتانے والی ہو۔'' سنو۔ مدتیں گزریں۔ اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ جب میں ایک نوجوان لڑکی تھی اور پیرس میں پڑھتی تھی ایک جاپانی طالب علم سے مجھے عشق ہوگیا جو وہاں آرٹ سیکھ رہا تھا ہم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے مگر کچھ ایسا ہوا کہ اس نے جاپان واپس آکر ہم وطن لڑکی سے شادی کرلی اور میں امریکہ لوٹی اور میری بھی شادی ہوگئی۔ اس کے بعد سے میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ ابھی میں نے سنا کہ وہ زندہ ہے اور یہیں موجود ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے اس سے ملنا چاہئیے یا میں خواب کو خواب ہی رہنے دوں؟''

''خواب کو''۔ میں نے اس سے کہا۔'' خواب ہی رہنے دیجئے۔''

تو گویا تمہارا خیال ہے کہ مجھے اس سے نہیں ملنا چاہئیے۔

''نہیں۔''

'' تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ خاموش ہوگئی اور اُدھر دیکھنے لگی جدھر جان اسٹین بک چند

جاپانی نوجوانوں کے مجمع میں گھرے کھڑے تھے ہال کی سنہری اور روپہلی منقش چھت اور دیواروں پر ان گنت جھاڑ فانوس جھلملا رہے تھے بالکنی میں آرکسٹرا اب ایک بہت پرانی دھن بجا رہا تھا شاید یہی دُھن اس بیچاری بڑھیا نے چوالیس سال پہلے ۱۳ ء کے پیرس میں سُنی ہو۔ جب وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور ایک سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والے خوبصورت جاپانی مصوّر سے عشق کر رہی تھی اگر وہ مصوّر اس سے اس سے ملے تو اسے ایک حسین امریکی بلونڈ کی جگہ ایک بوڑھی عورت نظر آئے گی، موتیوں اور زیوروں سے لدی ڈھیروں پوڈر اور سرخی منہ پر لگائے خشک بالوں پر مضحکہ خیز ہیٹ پہنے ہوئے، موٹی بے ہنگم امریکن بڑھیا اور وہ خود بلا عینک لگائے سفید بالوں، سوکھے مرجھائے چہرے اور اداس چندھی آنکھوں والا ایک جاپانی بوڑھا ہوگا وہ ناگاساکی میں ختم ہو چکا اور اس بُڑھیا کو غلط اطلاع ملی ہو کہ وہ زندہ ہے اور اس وقت اسی دعوت میں موجود ہے۔

دوسری صبح کانگریس کا کھلا افتتاحی اجلاس تھا جو ایک بہت بڑے ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس روز اٹھارہ سو ملکی اور غیر ملکی ادیبوں کا مجمع تھا۔ ٹیلی ویژن، کیمرے، آرک لائٹس مختلف اقوام کے جھنڈے پریس کے نمائندے۔

اونچے پریزیڈیم جاپان کے سب سے پہلے ناولسٹ نے استقبالیہ تقریر کی جس کو ایک چینی فلسفی کے مقولے پر ختم کیا۔ ''بھائیو! کیا یہی کم خوشی کی بات ہے اتنی دُور دُور سے ملنے کے لیے آئے ہیں؟''

اُن کے بعد جاپانی وزیر خارجہ بولے جو مصوّر بھی ہیں۔ آندرے شازوں نے ان کو جواب دیا۔ پچھلی جنگ میں ہم میں سے بہت سے ایک دوسرے کے دُشمن تھے یا دوست تھے جنگ کی قبریں ہمارا مشترکہ ماضی ہیں اور اُن کے سامنے جھکے ہم پوچھ رہے ہیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ جنگ کے بعد بہت سے جاپانی نوجوانوں کو وارٹریبونل کی طرف سے سزائے موت ملی تھی۔ مرنے سے پہلے ان لڑکوں نے جو خط لکھے۔ اُن میں سے ایک بیس سالہ نوجوان نے ماں کو صرف اتنا لکھا تھا۔

''میں نے لفظ کل کاغذ پر لکھا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔''

یہ بیس سالہ لڑکا جو مرنے کے لئے جا رہا تھا انسانیت کے اس پورے ڈرامے کو اس

نے اس مختصر سے جملے میں قلمبند کر دیا۔

دُنیا کے ادیبو! کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم بیس سالہ لڑکوں کو موت کے سائے سے آزاد ہو کر زندگی کی روشنی میں کل کا نظارہ کرنے کا موقع دیں۔''

اب جان اسٹین بک آئے اور ایسا لگا جیسے سوتے سوتے جاگے ہوں اور اُنہوں نے اینچیوں کی سی آواز میں کہا۔

''خواتین و حضرات۔ میں بے حد خوش ہوں اور بے حد میری عزت افزائی ہوئی لیکن یہاں میں بالکل بھونچکا کھڑا ہوں۔ مجھے آج صبح تک نہ معلوم تھا کہ مجھے بھی بولنا ہوگا میں بہت مختصر تقریر کروں گا۔ میرا اس کانگریس سے بہت قریبی تعلق ہے یہ ایشیا میں پہلی کانگریس ہے اور اصلیت یہ ہے کہ میری بھی پہلی کانگریس ہے۔

جب میں نیویارک سے چل رہا تھا تو ایک دوست نے کہا تھا فکر نہ کرنا۔ بس سنتے رہنا۔ میں جاپان پن کلب کا شکر گزار ہوں۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ صرف سننا ہی کافی نہیں، غور سے سننا ضروری ہے۔ اب میں بیٹھ کر غور سے سنوں گا۔ اور وہ واپس جا کر بیٹھ گئے۔

ابوالمنصور احمد جو پاکستان کے اس وقت کے وزیر تجارت تھے بنگالی کے صحافی اور طنز نگار کی حیثیت سے اس کانفرنس میں آنے والے تھے مگر کراچی سے روانہ ہونے سے ایک روز قبل مرکزی حکومت میں کرائسیس آ گئی لہٰذا انہوں نے سفر منسوخ کر دیا۔ ان کی جگہ پاکستان کے سفیر ڈاکٹر عمر حیات ملک مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کانفرنس میں شامل ہوئے۔

دوپہر کو انڈسٹریل کلب میں لنچ تھا یہ کلب بھی اس ملک کی صنعتی ترقی اور دولت کا مظہر تھا۔

لنچ کے دوران میری میز پر ایک صاحب آن بیٹھے۔ ایک جاپانی نے جو برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا اُن سے کہا۔ ''میں اس قدر خوش قسمت ہوں کہ ٹیگور سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکا ہوں عرصہ ہوا جب وہ جاپان آئے تھے۔''

پاکستانی مہمان نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جاپانی نے گھبرا کر ان کو دیکھا اور پھر خود بھی چپکا ہو رہا۔ شاید اسے احساس ہوا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔ اس کے

برابر میں دوسری طرف مشرقی پاکستان کے ایک ادیب بیٹھے تھے اور شاید اب تک وہ دونوں ٹیگور ہی کی باتیں کررہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے یہ ادیب بھی ہر بنگالی کی مانند خواہ وہ پاکستانی ہو یا ہندوستانی ٹیگور کے پرستار تھے مغربی پاکستان کے مہمان کی معنی خیز خاموشی پر وہ چپ ہوگئے۔ چند لمحوں بعد مقابل میں بیٹھے ہوئے ایک یوروپین نے دوسرا موضوع چھیڑ کر موقع کو سنبھالا۔

میں نے مغربی پاکستان کے ان مہمان سے آہستہ سے کہا۔ ''ٹیگور کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟''

''جی؟''

''میرا مطلب ہے کہ ٹیگور بنگالی کا عظیم ترین شاعر ہے اور بنگالی پاکستان کی ایک سرکاری زبان ہے تو اس حساب سے ٹیگور بھی پاکستانی شاعر ہوا؟

''دیکھئے میں عرض کروں۔'' میں نے گلا صاف کیا۔ ''آپ نذرالاسلام کو بڑا زبردست پاکستانی شاعر مانتے ہیں جس غریب کو پاکستان کے وجود کی بھی خبر نہیں اور وہ کلکتے میں پڑا زندگی کے دن پورے کررہا ہے تو پھر ٹیگور کو آپ پاکستان کا شاعر کیوں نہیں مانتے جب کہ آپ کو مشرقی پاکستان کے ہر گھر میں قائدِ اعظم کی تصویر کے ساتھ ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہے مطلب یہ کہ اس بے چارے جاپانی نے مارے اخلاق ٹیگور کے متعلق آپ سے بات کی تو آپ خاموش ہوگئے اور وہ بے حد کھسیانا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کلچر کی تقسیم کے بعد ٹیگور اور اقبال جیسی عظیم بین الاقوامی ہستیوں کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔''

انہوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں ناچار پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

شام کو ہم سب ٹوکیو سے باہر ایک پرستان کے ایسے باغ میں عصرانے کے لیے جاتے ہیں جہاں سبزے پر لکڑی کے ٹی ہاؤس میں کاغذی قندیلیں روشن ہیں پائن کے درختوں کے پیچھے سے پورن ماشی کا چاند طلوع ہورہا ہے جس کی روشنی میں باغ کے جھرنے جھلمل کررہے ہیں سبزے پر گڑیوں کی طرح سجی ہوئی گیشا لڑکیاں مہمانوں کی تواضع کررہی ہیں سامنے ان کا ایک اور گروہ اپنے کلاسیکل رقص دکھارہا ہے (جو بے حد معمولی اور بیجان ہیں)

ٹی ہاؤس کی سیڑھیوں پر جاپانی سازوں کا آرکسٹرا بے سری موسیقی بجا رہا ہے۔

ایک خوش شکل جرمن کیتھولک فادر جو یہاں کسی یونیورسٹی میں ادبیات کا استاد ہے (ٹوکیو میں ۷۹ یونیورسٹیاں ہیں علاوہ ڈگری کالجوں کے یہ ناقابلِ یقین بات ہے لیکن صحیح ہے) کرسی قریب کھینچ کر مجھے اس رقص کے معنی سمجھا رہا ہے۔

فادر ایکس ''بیس سال سے جاپان میں ہے رومن کیتھولک راہب ہے مگر خاصا رنگین مزاج معلوم ہوتا ہے۔'' جانے اس کی کیا کم بختی آئی تھی کہ راہب بن گیا۔'' ایک فرنچ لڑکی مجھ سے چپکے سے کہہ رہی تھی۔ ''اب پچھتاتا ہوگا۔''

''عجیب بات ہے۔'' میں اس سے کہتی ہوں۔'' جاپانی اس قدر شاعرانہ مزاج کے مالک ہوتے ہوئے بھی میٹافزیکل، بالکل نہیں۔''

''ہاں! ژاں نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔'' حالانکہ زین فلسفہ۔''

چاند اب تیرتا تیرتا ٹی ہاؤس کے اوپر پہنچ چکا ہے۔

''افسوس کہ یہ اگست کا نہیں ستمبر کا چاند ہے۔'' فادر ایکس ہنس کر کہتا ہے۔

اسٹیون اسپنڈر قریب ایک مونڈھے پر بیٹھے سوچ میں ڈوبے گھاس کو دیکھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی گیشا لڑکیوں کے ناچ پر بھی اچٹتی سی نظر ڈال دیتے ہیں۔ باغ میں جھرنے کے گانے کی آواز دفعتاً تیز ہوگئی ہے۔ پائن کے درختوں کے پرے سے بانسری کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

''چرواہے نے آواز سن کر راستے کا پتا لگا لیا۔ اس کے ذریعے اس نے چیزوں کی ابتدا پر نظر ڈالی اور اس کے حواس میں سرگم کی سی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ جب آنکھ کو صحیح اشارہ ملا تو اسے خود اپنا پتا بھی مل جائے گا شاخ پر کوئل گا رہی ہے۔ سہانی ہوائیں چل رہی ہیں اور ندی کے کنارے بید مجنوں سبز ہیں بیل تو وہاں خود ہی موجود ہے وہ کہاں چھپ سکتا ہے۔ اس کا خوبصورت سر شاندار سینگوں سے مزیّن ہے کون مصوّر اس کی تصویر کھینچے گا؟

لڑکے نے بیل کو مضبوطی سے پکڑ لیا مگر اے لو! بیل تو رسہ تڑا کر پھر کُہر آلود پہاڑیوں میں جا چھپا۔

چرواہے کو اپنا سونٹا اور رسّہ کبھی نہ کھولنا چاہیئے تا کہ بیل دُنیا کی ناپا کیوں میں گم نہ ہو جائے لیکن اگر بیل کی رکھوالی کی گئی تو وہ خود ہی شدھ ہو جائے گا اور آپ سے آپ چرواہے کے پیچھے چلنے لگے گا۔

کشمکش ختم ہوئی۔ اب لڑکا اپنے بیل پر بیٹھا شام کے دھند لکے میں بانسری بجاتا گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہے۔

کیا اب یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اسے گیان مل گیا ہے؟''

صبح ہوئی۔ معزز غیر ملکی مہمان سانگی کائیکان جانے کے لیے امپیریل سے نکلے۔

صبح۔ ٹوکیو اپنے کام پر جا رہا ہے۔ یونیورسٹیاں، دفاتر اور کارخانے جاگ اُٹھے ہیں چوراہوں پر ٹریفک کے حادثات سے مارے جانے والوں کے اعداد و شمار کرکٹ کے اسکور کی طرح بورڈز پر بدلتے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک پندرہ مارے گئے، ستائیس زخمی ہوئے بائیس مارے گئے پچاس زخمی ہوئے تیس مارے گئے۔

زندگی کے اس ہنگامے سے بے نیاز امپیریل محلات کے گرداگرد خندق میں راج ہنس گردنیں اٹھائے سکون سے پانی کی نیلی لہروں پر تیر رہے ہیں۔

شہر کے وسط میں شاہی محلات ہیں جن کے چاروں اور کئی میل کی وسعت میں پائن کے جھنڈ پھیلے ہیں۔ ان باغوں کو فصیل نے گھیر رکھا ہے اور اس فصیل کے گرداگرد بے حد خوبصورت پچاس فٹ گہری خندق ہے جس کے کنارے پر بید مجنوں جھکے ہوئے ہیں۔

اس خندق کے چاروں اور ٹوکیو آباد ہے۔

محل کے صدر دروازے کے پل پر کھڑے ہو کر دیکھئے تو پارک کے اُدھر وہ عمارت نظر آتی ہے جہاں مک آرتھر رہتا تھا۔

راج ہنس تاریخ کے ان بھونچالوں سے بے نیاز پانی پر تیر رہے ہیں۔ روز صبح خندق کے کنارے کنارے چوڑے ایونیو پر سے گزرتے ہوئے ہم ان راج ہنسوں کو دیکھتے ہیں۔

بسیں آگے پیچھے سانگی کائیکان پہنچ گئیں ہلکی ہلکی بارش ہو چکی ہے۔ فل بوٹ اور برساتیوں میں ملبوس ٹوکیو کے شہری انگریزوں کی سی سنجیدہ شکلیں بنائے سڑک پر سے

گزر رہے ہیں۔

چاروں اور بے حد دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔

مغربی ادیب شرم سے پانی پانی ہے اور اپنے ماضی کے جرائم کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر بیٹھا زین فلسفہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یا دانتوں تلے اُنگلی دبائے اس دنیا کے نظارے میں مصروف ہے۔ ٹیلی ویژن اسٹیشن بیلے انڈر گراؤنڈ ٹرینیں تھیٹر فلم اسٹوڈیو ڈیپارٹمنٹل اسٹور، اداکار مصوّر ادیب سائنسداں مندروں کے راہب یونیورسٹیوں کے پروفیسر۔ یہ کیسے عجیب و غریب لوگ ہیں۔ یہ کون انوکھی نسل ہے کہاں سے آئی ہے ایشیائی ماضی میں اس کی داستان کا پہلا باب کہاں سے شروع ہوتا ہے۔

لوبی کے دریچوں کے باہر بارش شروع ہوگئی ہے رفتہ رفتہ دھند بڑھتی جارہی ہے۔ سنہرا کہرہ آسمانوں پر سے اتر رہا ہے وہ سر بفلک عمارتوں پر چھا گیا ہے باغوں پر برس رہا ہے۔ لاؤنج کے ایک کونے میں اٹلی کا ایک کیتھولک دانشور خاموش بیٹھا ہے۔ اس کی روح اس دھند لکے کو چیر کر گیان پا سکتی ہے؟

پتا نہیں ہم میں سے کس کو یہ حق ہے کہ دوسرے کے گیان کے متعلق فیصلہ کریں۔

پہاڑیوں پر چرواہا بانسری بجاتا اپنے گھر کی اور جارہا ہے۔ باغوں میں سانچی کے پھاٹکوں کے نیچے سے لڑکیاں پھول اٹھائے گزر رہی ہیں شنتو معبدوں میں چراغ روشن کر دیئے گئے ہیں دھند بڑھتی جارہی ہے۔

اب سب چیزیں دھند لکے میں ڈوب گئیں۔ سوریہ دیوی کے بیٹے ہیرو ہیٹو کا محل اسی الوہی کہرے میں چھپ گیا۔ خندق کا نیلگوں پانی آسمان کی سیال روشنی سے جاملا۔ اب زمین اور آسمان ایک ہے۔ وجود اس روشن خلا میں سما گیا (یہ زمین نروان کا احساس ہے؟)

وقت کا شنتو کاہن اپنی قندیل لیے راستے پر پیچھے کی اور پلٹا۔ قندیل کی لَو اونچی کر کے اسے تیز ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچاتا پہاڑی پر چڑھا اور بانس اور پائن کے تاریک جنگلوں میں جا گھسا۔

جنگل میں جگہ جگہ سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے ستون تھے جن کی کھڑکیوں میں چراغ جل رہے تھے جنگل کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا شمالی سمندر تھا اور خالص وسعت

کا احساس۔

شنتو کاہن نے قندیل اونچی کر کے کہا۔

''ابتدا میں آسمان اور زمین ایک تھے اور محض انتشار تھا۔ اس انتشار میں سے لطیف حصہ اوپر اُٹھا اور آسمان بنا ٹھوس حصہ نیچے گرا اور زمین کی تشکیل ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان سے معاً ایک شے برآمد ہوئی۔

جو خدا تھا۔

پھر چار دیوتا اور پیدا ہوئے اور انہوں نے سات مزید دیوتاؤں کو جنم دیا۔ اُن کی آخری اولاد ازانگی دیوتا اور ازانامی دیوی تھے۔

ازانگی اور ازانامی کی اولاد جاپان ہے۔

جاپان دیوتاؤں کے حکم سے پیدا ہوا۔ سمندروں پر تیرتا ہوا ملک ازانگی اور ازانامی زمین کے درمیان معلّق پل پر کھڑے تھے انہوں نے دیوتاؤں کا دیا ہوا ہیرے جواہرات کا نیزہ سمندر میں ڈبویا اور سمندر کا جھاگ جو اس کی نوک پر لگا اس کے گرنے سے یاماٹو کے آٹھ جزیروں کی تخلیق ہوئی اس کے بعد ازانگی دیوتا اور ازانامی دیوی کے یہاں جاپانی نسل پیدا ہوئی۔

ازانگی اور ازانامی کی پہلی اولاد سوریہ دیوی اور چاند دیوتا تھے ان دونوں کے یہاں وہ سارے دیوتا پیدا ہوئے جو کائنات پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اگنی دیوی کو جنم دیتے وقت دیوی ازانامی مر گئی اور اس کا آسمانی شوہر غم و غصّے کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے موت کی دُنیا تک جا پہنچا۔ لیکن ازانامی اب پاتال کی دیوی بن چکی تھی۔ دیوتا واپس لوٹا اور سورج کے محل میں رہنے لگا۔ اس وقت زمین اور آسمان سے دور چلی گئی تو سوریہ دیوی نے اپنے پوتے جموتینو کو جاپان کا پہلا شہنشاہ بنا کر دُنیا میں بھیجا۔

جاپانی دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ جاپان کا شہنشاہ سوریہ دیوی کا بیٹا ہے۔ یہ جزیرے مقدس ہیں ہماری قوم مقدس ہے ہمارے آباؤ اجداد مقدس ہیں۔ کاہن قندیل سمیت اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دھند چھٹی۔

نکلتے سورج کی روشنی میں نظر آیا کہ ان جزیروں پر واقعی ایک عجیب و غریب دُنیا آباد ہے خوبصورت گاؤں، جھرنے، لکڑی کے پل، چھوٹے چھوٹے قدوں والی خوبصورت عورتیں سر پر سفید رومال باندھے چاول کے کھیتوں میں جھکی تھیں۔ ان جزیروں کے سلسلے میں ایک نسل بستی تھی جس کے ٹھور ٹھکانے کا کسی کو پتہ معلوم نہ تھا۔ اُن کی زبان اُن کی دیو مالا۔ اُن کی روایات ساری دُنیا سے بالکل مختلف اور علیٰحدہ تھیں۔

یہ قدیم یاماٹو قوم ہے۔

اُن کی زبان کا دُنیا کی کسی دُوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ماہر لسانیات نے کہا۔

یہ لوگ بحر الکاہل کی دور افتادہ پولی نیزین نسل کی اولاد ہیں۔ ان میں سے بہت سے افریقہ کے سفید فام تورانی ہیں جو لاکھوں برس قبل جنوبی ہند، جنوبی ایشیا اور چین سے گزرتے یہاں پہنچے۔ اینتھرو پولوجسٹ نے کہا۔

عیسیٰ کی پیدائش کے پانچ سو سال بعد ہندوستان سے ایک عظیم لہر اُٹھی اور چین اور کوریا کے راستے ان جزیروں تک پہنچی ۵۲۲ء کے بعد سے چین کے رسم الخط اور ہند کے مہایان فلسفے نے اس ملک کی موجودہ تہذیب کی تشکیل کی۔ مورّخ نے کہا۔

شنتو کاہن ان سارے فیصلوں سے بے نیاز مندر میں آبیٹھا آباء کی پوجا میں مشغول ہے۔ لکڑی کے مکانوں کے آنگنوں میں ننھے ننھے معبدوں کے سامنے لوبان جل رہا ہے۔ ایٹمی سائنسدان اپنے دار التجربے سے گھر لوٹنے کے بعد چپل اُتار کر اپنے کمرے میں شنتو معبد کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور بدھ کی مورتی پر پھول چڑھاتا ہے۔

چنانچہ جاپان کی اصل تاریخ ۵۲۲ء سے شروع ہوتی ہے۔

مصر، چین، ہندوستان، ایران اور عراق کے برعکس یہ تو بے حد مختصر سا تاریخی وقفہ ہے صرف سوا تیرہ سو سال مشرق کے ماضی کے اتھاہ سمندر میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔

جاپانی ادب کی تاریخ بھی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔

جاپانی ادب بھی سوا تیرہ سو سال پرانا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں نارہ میں دار السلطنت قائم ہوا۔ اس وقت جاپان میں چینی زبان اور ادب کو وہی اہمیت حاصل تھی جو ہم عصر ہندوستان اور یوروپ میں سنسکرت اور

لاطینی کو ملی ہوئی تھی۔ ہندوستان سے بہت سے سنسکرت کے الفاظ اور حروف فلسفے اور فن سنگ تراشی کے ساتھ یہاں پہنچے۔ علم حسب معمول پروہتوں اور سرکاری افسروں کی ملکیت رہا۔ کوجیکی نثر میں پہلی کتاب ہے جو شاہی فرمان کے بموجب ۷۱۲ء میں لکھی گئی ۷۰۰ء سے ۸۰۰ء تک دارالسلطنت میں تاریخ قانونِ طب قدیم چینی ادب اور جمالیات کی تعلیم کے لیے اسکول قائم کئے گئے خوبصورت مندر تعمیر ہوئے باغات لگائے گئے۔ چین کا ثقافتی اثر گہرا ہوتا گیا۔

جاپان کا شاعر مناظر فطرت کا عاشق تھا۔ اس نے اپنے اشعار میں گرتی برف کا ذکر کیا اور ندیوں میں کھلتے پھولوں کا اور خزاں میں مرجھاتی گھاس کا۔ اس کے یہاں گہرا فلسفہ نہیں تھا (آج تک نہیں) جاپان کی ساری شاعری اور مصوری امپریشنسٹ رہی ہے کھیتوں پر تیرتے ہلکے پھلکے بادلوں اور نازک رنگوں کا فن جاپان کی ان چھوٹی چھوٹی نظموں نے مغرب کی امیجسٹ شاعری کو متاثر کیا۔ یہاں کی مصوری نے انیسویں صدی کے آخر میں یوروپ میں امپریشنسٹ مصوری کی پوری تحریک کو آگے بڑھایا اور اُن کو تاثرات کی ایک نئی دنیا دریافت کر کے دی۔ اس مصوری نے بنگالی اُستاد کو متاثر کیا اور رابندر ناتھ ٹیگور، نندلال بوس نے آبی رنگوں کے واش کی تکنیک کو بنگالی اسکول میں رائج کیا (عبدالرحمٰن چغتائی بھی بنگالی اسکول کے شاگرد تھے)

نارا کے شاہی دربار میں شاعروں کا احتجاج ہوا۔ خود شہنشاہ شاعری کرتے تھے ساتویں صدی کے ایک شہنشاہ کے اشعار ہیں۔

خزاں زدہ کھیتوں پر برستی بارش رات کے سمے
چٹائی کے چھت والے عارضی جھونپڑوں میں سے ٹپکتی
سوتے ہوئے کسانوں کی آستینوں کو بھگوئے ڈال رہی ہے۔

اسی شہنشاہ کی بیٹی کی نظم ہے۔

موسم بہار گزر چکا
گاگو کی پہاڑی ڈھلوان پر
نئے دُھلے ہوئے کپڑے

سفید بادلوں کی طرح پھیلے ہیں۔

ایک اور شہنشاہ نے لکھا۔

ہزاروں جھونپڑوں میں سے دُھواں
بل کھاتا اُٹھ رہا ہے
سمندر پر سفید مرغابیاں اڑتی ہیں۔
دھان کے کھیتوں کی سرزمین! جس کے لیے ہم جیتے اور مرتے ہیں۔
یاماتو۔ متبرک ملک۔!!

اسی صدی میں شہزادی نوکاتا نے لکھا۔

موسم سرما میں سے بہار برآمد ہوئی
پرندوں کی چہکار سے جنگل گونج اُٹھے
ان گھنے کنجوں میں سے گزرنا آسان نہیں
جہاں پگڈنڈیوں پر کلیوں کے انبار لگے ہیں
لیکن پت جھڑ کے مہینے میں
میں ان وادیوں میں سرخ پتے چنتی ہوں
میرے لیے خزاں کی پہاڑیاں کافی ہیں

ایک اور شاعر نے کہا:

سرخ پتوں پر چلتے ہوئے
میں اکیلے ہرن کی پکار سنتا ہوں
پت جھڑ کا موسم کتنا اداس ہے!

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دارالسلطنت کیوٹو میں منتقل ہوگیا۔ اب ادب کا ہین دور شروع ہوا جو چار سو سال تک قائم رہا۔ یہ زمانہ انتہائی عیش وعشرت کا تھا۔ دربار میں ایک مصنوعی اور پُرتکلف تہذیب پروان چڑھ رہی تھی۔ محل میں باضابطہ محکمہ شاعری قائم کیا جاچکا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ امراء اور شہزادیاں اور بیگمات سب شاعری کرتی تھیں۔ چینی زبان اور ادب کو اب بھی فوقیت حاصل تھی۔ بدھ مت کے زیرِ اثر دُنیا کے فانی ہونے کا

احساس شدید تر ہو چکا تھا سوسائٹی میں خواتین کی اہمیت اور اُن کا اعلیٰ درجہ اس عہد کی خصوصیت ہے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا شاہکار چار ہزار صفحات کا ایک ناول ''گنجی کی کہانی'' جو ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ فیو جی دارا خاندان کی ایک خاتون نے تصنیف کیا۔ اس ناول کو جاپانی ادب میں وہی اہمیت حاصل ہے جو انگریزی میں سڈنی کے آرکیڈیا اور فیلڈنگ کے ناولوں کی ہے۔ اس عہد میں اور بہت سے خواتین نے ناول لکھے جو آج تک اسی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس عہد کی شاعری نے بھی اپنی قدیم قومی روایات برقرار رکھیں۔

بطخیں گھر کی طرف پرواز کر رہی ہیں۔
خزاں کے چاند کی روشنی میں اُن کے پر چمکتے ہیں۔
جہاں پرا کیلی کوئل چلا رہی تھی
میں بھی اکیلا تھا
میں نے اس کی آواز کی طرف نظر اُٹھائی
مگر مجھے صبح کے پھیکے چاند کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔

جب میں اپنے گھر کو خدا حافظ کہہ کر چلا جاؤں
اور میرا گھر سنسان پڑا رہ جائے۔
میرے چھپّر کے قریب اُگے ہوئے آلوچے کے درخت!
بہار کے موسم میں اپنی کلیاں کھلانا نہ بھولنا۔!

اور مسرور قہقہے لگاتی موسم گل کی بکھراں دھوپ!
اتنی بے صبری سے چیری کے شگوفے کیوں گرا رہی ہے؟

پیارے پہاڑی چیری کے درخت
آؤ ہم تم دونوں خوش ہولیں
کیوں کہ ہمارا اور کوئی دوست نہیں ہے۔
میرے بھائی!

بارہویں سے لے کر سولہویں صدی تک جاپان مستقل خانہ جنگی کا شکار رہا۔ بدامنی

اور سیاسی انتشار سے پناہ لے کر علم و ادب خانقاہوں میں جا چھپا۔ اداسی کا رنگ گہرا ہو گیا۔ خواتین بھی ادبی افق سے غائب ہو گئیں۔ ادب میں سیاسی اور جنگجو عناصر آ گھسے۔ تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی زمانے میں جاپان کا مشہور نوہ ڈرامہ پیدا ہوا جس کی بنیاد ہمعصر انگلستان MIRACLE AND MORALITY PLAYS کی طرح مذہبی تھی۔ شنتو مندروں کا ڈانس ڈرامہ اس کا پس منظر تھا جس میں دیوداسیاں ڈھول اور منجری کی تال پر ناچتی تھیں (آج بھی اسی طرح ناچتی ہیں) سینکڑوں نوہ ڈرامے لکھے گئے شوگن جنگجو جاگیردار سماج نے اُن کی سرپرستی کی۔ ان ڈراموں کا ہیرو عموماً ایک راہب ہوتا تھا۔ پھر اس میں مزاحیہ عنصر بھی شامل کر دیا گیا آج تک نوہ کو جاپان میں وہی مقبولیت حاصل ہے۔

چاروں سمندروں پر موجیں ساکت ہیں۔
دنیا پر سکوت طاری ہے۔
وقت کی ہوائیں آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔
ایسے زمانے میں وہ صنوبر بھی مبارک ہو۔
جو اکٹھے بوڑھے ہوتے ہیں۔
ہم خوش قسمت ہیں جو اپنے قابلِ قدر آقا کے اس عہد میں پیدا ہوئے۔
سحر قریب ہے۔
اور کہرہ صنوبر کے درختوں پر گر رہا ہے۔
سدا بہار درخت بنے کھڑے ہیں۔
وقت کے اختتام کی علامت
درخت جو اکٹھے بوڑھے ہوتے ہیں۔

۱۶۰۰ء سے ۱۸۶۸ء تک فیوڈل ادب کا زمانہ ہے۔ تو کوگاوا شوگن خاندان کے دورِ حکومت میں ملک میں امن پھیلا اور تہذیبی اداروں کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ چینی کلاسیکس اور کنفیوشس کا فلسفہ ایک بار پھر سے رائج ہوا۔ یدو (موجودہ ٹوکیو) کا نیا شوگن دارالحکومت اپنی شان و شوکت اور تہذیبی سرگرمیوں میں ٹوکیو کے شاہی دارالسلطنت سے بازی لے گیا بدھ مت کا اثر ختم ہوتا گیا اور قدیم شنتو مذہب کے زیرِ اثر شدید قسم کی نیشنلزم

آگے بڑھی، ادب کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ ہر موضوع پر ان گنت کتابیں لکھی جانے لگیں۔ قدیم چین کے یانگ اور ینگ کا فلسفہ (جو ہندو الٰہیات کے برہما اور شکتی کے نظریے کی مانند ہے، یہاں بھی بے حد مقبول ہو گیا۔ یانگ مثبت مذکر اور متحرک ہے ینگ منفی مونث اور غیر متحرک ہے۔ یہ قدرت کی دو قوتیں ہیں جن کی کارفرمائی سے دُنیا کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس فلسفے کے سوشل اخلاقیات اس شوگن سماج کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوئے جس میں فرض کو بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی۔ نچلے طبقے کے انسانوں کا فرض تھا کہ اونچے طبقے کے انسانوں کی اطاعت کریں۔ اونچا طبقہ صرف حقوق کا مالک تھا فرائض نچلے طبقے کو سونپ دیے گئے تھے اس زمانے کے ادب کا ہیرو سمورائی ہے۔ سمورائی جنگجو اس سماج کا آئیڈیل انسان تھا۔ بات بات پر لڑ مرنے والا اعلیٰ خاندان آن پر جان دینے والا بانکا سورما۔ اسی فیوڈل عہد میں عورت تقریباً پردے میں بٹھلا دی گئی۔ طوائف یا گیشا کا عروج ہوا۔ وہی ناولوں کی ہیروئن بنی۔

اب یدو۔ کیوٹو اور اوساکا میں چھاپہ خانے کھل گئے تھے۔ سماج میں سے سب سے اونچا درجہ سمورائی کو حاصل تھا۔ اس کے بعد کاریگروں، کسانوں اور تاجروں کی باری آتی تھی۔ یہ گویا جاپان کے چار ورن آشرم تھے۔

فیوڈل عہد ناولوں کا عہد تھا۔ نوہ اب بھی مقبول تھا لیکن پہلے غیر مذہبی تھیٹر یعنی کابکی کی بنیاد سولہویں صدی میں ایک دیوداسی نے ڈالی جو رہبانیت کی زندگی سے بھاگ کر اوساکا آ گئی تھی اور اب گا بجا کر اپنا پیٹ پال رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنی ناٹک منڈلی لے کر یدو چلی آئی اور کابکی تھیٹر قائم کیا۔

نوہ اور کابکی کے علاوہ کٹھ پتلیوں کا ڈرامہ بھی اس ملک میں کئی صدیوں سے مقبول ہے۔ فیوڈل عہد کی شاعری ـــــ

یہ رہا وہ پرانا تالاب
لو اس میں ایک مینڈک کودا
ذرا پانی کی جھنکار تو سنو!

اگر تم ہون کی الوہی روح کو دیکھنا چاہتے ہو
تو پہاڑی چیری کے شگوفے پر نظر ڈالو

دنیا جس میں سے ہم گزرتے ہیں
بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے ایک سائبان ہے
اور پھر۔ خدا حافظ!

سڑک کے کنارے ایک پھول کھلا تھا
گدھا آیا اور اس کو چر گیا

میرے پلنگ کے قریب کوئی چراغ نہیں
سوائے میری کھڑکی کے چاند!

دوستو مجھ سے دور رہو
تاکہ میں تنہائی میں دن بھر پھولوں کی عبادت کر سکوں

پائن کی شاخوں اور آدھی رات کی بارش میں سے جھانکتا
چاند آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔!
گو دنیا محض ایک شبنم کے قطرے کی مانند ہے
مگر ہماری ہی دنیا تو ہے!

بے چاری چھوٹی سی یتیم
آ میرے ساتھ کھیل

جدید جاپانی ادب کا زمانہ ۱۸۶۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ شوگن حکومت کے زوال مغربی اقوام کی آمد اور شہنشاہیت کی تجدید کے ساتھ ساتھ جاپان نے نئے زمانے میں قدم رکھا۔ اب تک ملک کے سارے دروازے غیر اقوام کے لیے سختی سے بند تھے۔ پچھلی صدیوں میں ڈچ تاجروں نے آمد و رفت شروع کی تھی۔ کیتھولک مشنری یہاں پہنچے تھے مگر اُن سب کو نکال باہر کیا تھا جاپان مکمل طور پر باقی دنیا سے الگ تھلگ اپنی کائنات میں بند بیٹھا تھا ۱۸۶۸ء میں یدو میں نیا شاہی دارالسلطنت قائم ہوا جس کا نام ٹوکیو رکھا گیا۔ اب دفعتاً یوروپ تہذیب، یوروپ کی ادبیات کے مطالعے نے زور پکڑا۔ شہنشاہ نے ایک دستور یہ اور ایک پارلیمنٹ قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ تقریباً سارے اہم یوروپین امریکن اور انگریزی ادب کا جاپانی میں ترجمہ کر ڈالا گیا جاپانی ادیب مصلح قوم بنے۔ جاپانی زبان جو ایک ہزار سال سے چینی خیالات کی ترجمانی کر رہی تھی اسی آسانی سے مغرب کی ترجمانی میں مصروف ہوگئی۔

لیکن آج کی شاعری میں بھی ایک ہزار سال قبل کی آواز بازگشت سنائی دے رہی ہے ـــــــ

اب میں لیٹ کر خواب دیکھوں گا۔
اور بارش کی آواز
اور مینڈکوں کا شور مجھے لوریاں دے گا

ـــــــــــ

میرے اوپر ہنسا کرو
مجھے کنویں کا مینڈک کہہ لو
لیکن میرے کنویں کی منڈیر پر پھول جھکے ہیں
اور چاند اس کے پانی میں تیر رہا ہے!
ذرا سوزوموشی کا گیت تو سنو
اگر شبنم گا سکتی تو اس کی آواز ایسی ہی ہوتی
ہاں! میرا مکان پرانا ہے
اس کی چھت پر پودے اُگ رہے ہیں

لیکن سوز و موشی کی آواز تو کبھی بوڑھی نہ ہو گی
میرے بچپن کا گھر بدل چکا
لیکن جھینگروں کی صدائیں وہی ہیں
میرا خیال ہے وہ پرانے اچھے دنوں کی یاد میں
گانے کی کوشش کر رہے ہیں!

جدید جاپانی ادب بے حد ترقی یافتہ ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں۔ ہر زندہ قوم کی طرح اُن کا ادیب بھی معاشرے میں بے اندازہ عزت کا مالک ہے وہ بھوکا نہیں مرتا نہ وہ سڑکوں کی نالیوں میں بے ہوش پایا جاتا ہے۔ جاپان کے بڑے ایکٹر اور بڑے مصنف اپنی قوم کے لیے ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ قوم فنکار کی عزت کرنا جانتی ہے۔

لاؤڈ اسپیکر پر ایک لڑکی کی شیریں آواز آئی۔ ''ادبی سیشن کے لئے اندر تشریف لے چلئے۔''

نائب صدر موسیو روجر کیلو نے کہا۔ ''یونیسکو کی طرف سے میں اس گول میز کانفرنس کے اراکین کا سواگت کرتا ہوں۔ مغرب کے اسکالر قدیم مشرق سے واقف ہیں۔ انہیں ہم عصر مشرق کے ذہن کا کوئی علم نہیں۔ اہلِ مشرق مغرب کو محض ایک فاتح اور کولونیل طاقت کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اُن کی مغرب کے ماضی سے واقفیت نہیں وہ گوتھک آرٹ کے مقابلے میں سرریلزم کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔ علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ مشرق آخر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے اور زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اورینٹ کا وجود درحقیقت کہیں ہے بھی یا نہیں۔ عربی، ہندی اور چینی رسم الخط ایک سے نہیں ہیں۔ قاہرہ سے کراچی تک کا رسم الخط ایک سا ہے مگر بہر حال ایک یوروپین طرزِ تحریر ہی نے ساری دنیا کو یکجا کر رکھا ہے۔ میرے پاس اورینٹ اور مغرب کے اختلافات کی بہت سی مثالیں موجود نہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اورینٹ میں حقیقی اتحاد موجود ہے۔ مجھے یہ شبہہ ہے کہ کہیں مغرب کی مخالفت ہی تو سارے مشرق کے اتحاد کی بنیاد تو نہیں۔ علاوہ ازیں مشرق کا اسکالر اپنے ہمسایہ ممالک کے ماضی کا پتہ چلانے کے لیے پیرس لندن اور برلن کا رخ کرتا ہے۔ مشرق کے سیاستدان نے نہ صرف مغرب کی یونیورسٹیوں میں بلکہ مغرب کے بنائے ہوئے جیل خانوں میں اپنی تربیت

حاصل کی ہے۔اب یہ راستہ یک طرفہ رہا ہے۔''

مصر کے ڈاکٹر محمد عوض نے کہا۔'' مختلف ملکوں کے مصور، موسیقار اور سائنسدان ایک دوسرے کے کام سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن دوسری زبانوں کے ادب کے سلسلے میں کمیونیکیشن کا معاملہ آڑے آجاتا ہے۔ بیتھوون کے سوناٹا کا عربی یا ہندی میں ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم لکھنے والوں کا فن ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے ایک مترجم کی حاجت ہے۔

بڑی قابلِ غور بات یہ ہے اہلِ مغرب نے آج تک مشرق کے ادب کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ سوا چند مستشرقین کے جنہوں نے اس خزانے کا کھوج لگایا اور اس میں جرمن دانشور سب سے آگے تھے۔ گوئٹے تھا جس نے اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں عربی اور فارسی پڑھی۔ اس نے اپنا دیوان اس وقت لکھا جب اس کے وطن میں انتہا پسند اور جنگجو قوم پرستی کی لہر اپنے عروج پر تھی۔ اس شاعر نے اپنے آپ کو ہندوستانی اور ایرانی اور عربی تہذیبوں کے دھارے میں بہایا مگر اس کی تخلیقات سے کسی قسم کی دوسرے درجے کی دوغلے پن کی جھلک نظر نہیں آتی جس کا خطرہ عموماً لوگوں کو اس قسم کا اثر قبول کرنے کے سلسلے میں محسوس ہوتا ہے۔

پچھلی صدی کے اواخر میں یوروپ کے رابطے سے عرب ممالک میں تھیٹر اور ناول اور مختصر افسانے کی تحریک چلی۔ سیاستدان عرب دنیا میں تفرقہ اندازی کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے باوجود ان تہذیبی کوششوں کے ذریعے مشرق اور مغرب اس خطے میں ایک دوسرے کے ہمدرد کی حیثیت سے قریب تر آ سکتے ہیں۔''

آندرے شازوں نے کہا۔'' میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس محفل میں ہم میں سے کوئی بھی اپنی حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں بول رہا ہے۔ ڈاکٹر عوض نے جو کچھ کہا وہ اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حکومت کے بجائے اپنے ملک کی طرف سے تقریر فرمائیں۔''

برطانیہ کے اینگس ولسن نے کہا۔'' میں آپ سے ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔ تخیلی ادب سے باہر جانے کی مجھ میں صلاحیت نہیں لیکن اگر میں صرف لکھنے کے فن ہی کی بات کروں تو فرار پسند ادیب نہ سمجھئے گا۔ کوئی ناولسٹ اس معاشرے

کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کرسکتا جس میں وہ زندہ ہے۔ آخر یہ معاشرہ ہی تو وہ مادہ ہے جس کو ٹھونک پیٹ کر اپنے اطمینان کے مطابق ایک شکل میں ڈھالتے ہوئے اس کی ساری زندگی بیت جاتی ہے لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم سیاسی اور عمرانی نظریات پر بحث کریں اور اگر میں نے ایسا کیا بھی تو ان برطانی ادباء کے ساتھ ناانصافی ہوگی جن کی میں یہاں نمائندگی کررہا ہوں اور کسی تھیوری کے ماتحت رہتے بغیر اپنے فوری اور بلاواسطہ تجربے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں نے اب تک صرف پانچ چھ جاپانی ناولوں کے ترجمے پڑھے ہیں اور اگر میرے میزبان برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ انہوں نے مغربی فارم کو اس سے پوری طرح کیوں قبول کرلیا اور کس خوبصورتی سے قبول کیا۔

اس سلسلے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ایک لکھنے والے کو کبھی یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس کی اپنی جڑیں اس کے تخیل اور اس کے فن کی اصل بنیاد ہیں یہ جڑیں کاٹ کر وہ بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کو صرف اپنے بچپنے کے متعلق ہی لکھتے رہنا چاہیے! مگر چند تمثیلیں اور سانحے جو ہماری کہانیوں کے پس منظر میں رہتے ہیں شروع ہی سے ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکتے ہیں۔ گو اس کے بعد ہم اپنا مواد بہت سی مختلف دنیاؤں سے بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ کپلنگ ای ایم فارسٹر اور سمرسٹ ماہم نے ایشیا سے یہ مواد حاصل کیا۔

لیکن چند بنیادی سوال ہیں جن کی شخصیت لکھنے والے کے نقطۂ نظر سے بین الاقوامی ہے گو اُن کا حل قومی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔ وہ بنیادی مسائل میرے نزدیک یہ ہیں۔

ایک انسان کے اندر وقت اور انسانی شخصیت کا باہم رشتہ کیا ہے؟

مختلف شخصیتوں کے وجود کا اظہار کس طرح کیا جاسکتا ہے اور اُن کا ایکا کس طرح دکھایا جاسکتا ہے؟

کیا انسان کی سماجی اور پبلک شخصیت اور اس کی نجی شخصیت ایک ہی ہے اگر نہیں تو کون سی زیادہ اہم ہے؟

کیا ہم لکھنے والے زندہ مواد کو اپنی کتابوں میں ٹھونس کر اور اُن کو پلاٹ میں جکڑ کر اور اُن پر اپنے فیصلے صادر کر کے اسے قتل تو نہیں کر دیتے؟

طرزِ بیان کیسا ہو۔

اس سال موسمِ گرما میں جب میں نے جاپانی ناول نگاروں تآنی زاکی کوآباتا اور می شی ما کے ناول پڑھے تو ان بنیادی سوالوں کے متعلق میرے دماغ میں ایک تعطل سا پیدا ہو گیا گویا میں ایک اندھی گلی میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن جہاں جہاں ان ناول نگاروں کا رویہ شخصیت وقت اور اظہار رساں کے سلسلے میں مغربی فنکاروں کا سا زتھا وہاں اُن کا خالص جاپانی فارم ہر اس چیز سے اس قدر مختلف تھا جو میں نے آج تک سوچی کہ مجھے فوراً LIBERATION حاصل ہو گیا۔ ظاہر میں اُن کی تقلید میں نہیں لکھ سکتا۔ لیکن یہ بذات خود ایک بڑی ہمت افزائی تھی کہ چند بڑے فنکار شخصیت اور زندگی کے بنیادی مسائل کے متعلق ایسے خطوط پر سوچ رہے ہیں جن سے میں بالکل واقف نہیں اور اس بات نے مجھے اپنی جڑوں میں اور گہرا کھودنے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ مغرب اور مشرق کے فنکار کو ایک دوسرے کے اختلاف میں بڑی تخلیقی تحریک مل سکتی ہے دوسرے ممالک کے رسم و رواج کے متعلق تو آپ عام کتابوں سے بھی معلومات حاصل کر سکتے ہیں مگر لیکھک کے لیے اصل محرک وہ اچانک جھلک ہے جو ایک ایسے آئینے میں نظر آ جائے جس میں ساری دنیا ایک دوسرے زاویے سے منعکس ہے۔ مقامی رنگ یا عالمگیر اپروچ کے بجائے یہ اصل چیز ہے۔''

جاپانی پی ای این کی طرف سے سوئے کی چی آ ونو نے کہا۔

''جاپان کلچر کے معاملے میں شروع سے درآمد کا قائل ہے چوں کہ یہ ملک ہمیشہ خود مختار رہا لہٰذا اس کے باشندوں کو انتخاب کرنے کی آزادی میسر تھی۔ انہوں نے جو پسند کیا اختیار کیا جو ناپسند کیا چھوڑ دیا۔ یوروپ سے ہم نے حسن کا مصنوعی ذہنی اور غیر شخصی احساس حاصل کیا جس کے مقابلے میں ہمارے یہاں حسن کا قدرتی جذباتی اور شخصی احساس موجود تھا۔ نثر میں ہم یوروپ کی معقولیت اور تناسب سے متاثر ہوئے لیکن جدید جاپانی ادیب محض مغرب کا نقال نہیں ہے۔ قدرت سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش ہر جاپانی فنکار کی

سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہی جاپانی طرزِ زندگی اور طریقۂ فکر کی جڑ ہے۔ گو یہ جڑ ایک مغربیت پسند اور صنعتی سماج میں بہت حد تک مل چکی ہے۔

آج کے لکھنے والوں کو ایسی زبردست مذہبی اور سماجی آزادی ہے جو ہمارے غیر ملکی ادیبوں کو بھی چونکا دے گی۔ اس آزادی کی وجہ ہمارے لکھنے والوں اور عوام کے درمیان بڑی خلیج پیدا ہوگئی ہے۔ عوام کے نزدیک لکھنے والوں کا ایک اونچا طبقہ پیدا ہوگیا ہے۔

اس آزادی میں مغربی معدومیت اور انکار کائنات اور مشرق فنا کے احساس کا رنگ شامل ہے اور خطرہ ہے کہ ادیبوں کا گروہ اینٹی سوشل نہ بن جائے۔"

ہندوستان کے ڈاکٹر سری نواس آئنگر نے کہا:

"کیا مشرق کلرڈ اقوام کے ادب کا رنگ بھی مختلف ہے؟ موسیو تین نے ایک جگہ پوچھا ہے۔ ادب کی علّت و معلول کیا ہے؟ ان کا جواب ہے نسل معاشرتی ماحول اور لمحہ۔ ایک خاص قوم اور ایک خاص ملک کے ایک خاص وقت میں یکجا ہونے سے لٹریچر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دلاوری کے عہد نے رزمیہ کی تخلیق کی۔ شہروں کے پرتکلف تمدن نے ڈرامے کو جنم دیا۔ انیسویں صدی کے صنعتی دور نے ناول اور آج کی ٹیکنالوجیکل تہذیب نے جاسوسی افسانہ فلم اسکرپٹ اور ٹیلی ویژن پروگرام پیدا کیا لیکن ان سب چیزوں کے علاوہ کیا شخصی تجربہ اس تخلیق میں شامل نہیں؟ تیراک خواہ وہ دھارے کے ساتھ یا اس کی مخالف سمت میں پیرے گو دھارا اس کے بہنے یا اس کی جدوجہد میں شامل ہے۔ لیکن تیراک بذاتِ خود پیرنے کی مہم کا مرکز ہے۔ والمیکی اور ہومر سوفوکلو، کالی داس، بھبھوتی اور شیکسپئر اور مولئیر کی اپنی مستقل شخصیتیں تھیں۔ فردوسی گم شدہ، گنجی کی کہانی یا کرامزاف برادران لوگوں کا جاری کردہ مینیفیسٹو یا کسی کمیٹی کی رپورٹ نہیں تھے۔ چارلس لیمب کے مضامین اس کے علاوہ اور کوئی نہ لکھ سکتا تھا۔

چنانچہ ادب کیا سوشل نسلی یا علاقائی تخلیق ہے۔ وقت کی روح میں شرکت یا مختلف مردوں اور عورتوں کے دکھ، خوف، خواب اور روژن اس کی تخلیق کی اصل وجہ ہیں۔ تیرنے کی مہم کی اصل حقیقت کیا ہے۔ دھارا یا پیراک؟ غالباً انسان اور ادب میں بیک وقت دو خصوصیات موجود ہیں۔ اگر ایک طرف سے دیکھا جائے تو انسان دیواروں میں محصور ہے تنہا اور منفرد۔ دوسری طرف وہ آدم کی ساری نسلوں سے مماثلت رکھتا ہے کائنات میں ذرے کی حیثیت سے

شامل ہوتا ہے اسی طرح کوئی ایک شعر کوئی ایک جملہ بذاتِ خود ایک ستارہ ہے جس کے اپنے قوانین ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ستارہ ایک پورے نظامِ شمسی میں شامل ہے جسے ادب کہتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی ادب کی تخصیص اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن ان دونوں میں ادب کی پھر مزید علاقائی تقسیم بھی موجود ہے لہٰذا ہم مشرق اور مغرب کے ادب کو کسی مشترک پیمانے سے جانچیں؟ ہندوستانی چینی اور جاپانی ادبیات میں کون سی قدر مشترک ہے؟ عربی، فارسی، بنگالی، مرہٹی، تامل اور برمی ادبیات کی کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ان کو ایشیائی کہا جاتا ہے؟ کیا امریکن آسٹریلین، جنوبی افریقی ادب انگریزی لٹریچر کی مانند ہے؟ کیا مشرق و مغرب کی تخصیص اینگلو انڈین (یا ہندوستانیوں کے لکھے ہوئے انگریزی ادب) لٹریچر کو اینگلو امریکن، آسٹریلین لٹریچر سے جدا کر دیتی ہے؟ روسی ادب کو مشرقی سمجھا جائے یا مغربی؟ کیا ہسپانوی ادب پیرودین کے بہ نسبت پرتگالی سے زیادہ نزدیک ہے؟ بالفظ دیگر جغرافیائی قربت اور اتحاد یا مشترک زبان ادبیات کے رشتوں کی تشریح کرتی ہیں؟ پھر قومیت کا مسئلہ بھی اُردو اور بنگالی ادب اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں میں تخلیق کیا جارہا ہے۔

لیکن اس تخلیق کے پیچھے کون سی چیز زیادہ طاقت سے کارفرما ہے۔ ایک مشترک زبان یا ایک مشترکہ مذہب اور قومیت؟

زندگی میں ظاہری تغیر اور حقیقی تسلسل میں برابر تصادم رہتا ہے ادب اس تصادم کا عکاس ہے وہ کیا شے ہے جو فنکار کو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ ادب کی آفاقیت وقت اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماوراء ہے۔ سچ عالمگیر ہے۔ حقیقی ادب میں انسان انسان سے بات کرتا ہے مشرق مغرب سے ماضی حال سے یا حال مستقبل سے نہیں۔ اعلیٰ ادب کے سامنے زبان و مکان کی کوئی حیثیت نہیں۔

ظاہری طور پر انسان، ادوار، ممالک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ہمارا محنت اور غم اور روح کا تجربہ ساری دنیا میں یکساں ہے۔ سیاست اقتصادیات منظم مذہب اور متضاد فلسفوں نے انسانوں میں افتراق پیدا کر دیا ہے لیکن بڑا ادب خصوصاً شاعری بجلی کی خیرہ کن

لیک کی طرح ہمیں یک لخت اس اندھیرے میں راستہ دکھا دیتی ہے۔

مشرقی ادب نے روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی ہے UNKNOWN کے سمندر کو کھنگالا ہے لامکاں کو ناپنے کی سعی کی ہے۔ رشیوں اور صوفیوں نے اس ادب کی آبیاری کی ہے اس کے برعکس مغرب کا ادیب زیادہ تر خارجی دنیا اور انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی کا عکاس ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرق کے لیکھک زندگی کے مادی تقاضوں سے بالکل بے نیاز ہیں افلاس اس وقت ایشیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے مغرب کے لکھنے والے تحفظ اور شخصی یا اجتماعی مسرت کے متعلق لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں افلاس سے چھٹکارا ملنے ہی پر شخصی یا اجتماعی مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

اس وقت مشرقی یا مغربی ادبیات کا روایتی رول بدل گیا ہے مشرق میں مادیت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ مغرب کے لکھنے والے روحانیت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مشرق کے ادب کی اصل خصوصیات برقرار ہیں۔ یہاں جارج اورویل کے جانور خانے کی طرز کی طنز نہیں لکھی جا سکتی نہ مغرب میں جاپانی شاہکار ''بگلا اور غروب آفتاب'' پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑی عجیب بات ہے کہ سوفوکلز اور شیکسپئیر کی قسم کی ٹریجڈی کی تخلیق سے مشرق نے ہمیشہ انکار کیا ہندوستان میں ایک سو سال سے شیکسپئیر پڑھا جا رہا ہے لیکن عوام (ذہن پرستوں کے علاوہ) ہیملٹ یا لیئر کے دوست نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مشرق طبعی موت کو آخری خاتمہ سمجھنے سے منکر رہا ہے۔ عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا کوئی ٹریجڈی نہیں آپ اگر اُن کے دوبارہ جی اُٹھنے پر یقین رکھتے ہوں۔

یقین اصلی چیز ہے۔

''دُنیا ایٹمی تباہی کے دروازے پر کھڑی ہے اور اس وقت مشرق اور مغرب کے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ محض بازار کے شور وغل اور بیوپاریوں کی چیخ و پکار کی حیثیت رکھتا ہے۔''

فرانس کے ژاں ـ جے ہی تو نے کہا۔

''ایک چینی حکیم چانگ سین کا مقولہ ہے ہوا فطرت کی بانسری درختوں اور پانیوں

پر سے بہتی ہوئی میرے نغمے بجاتی ہے اسی طرح تاؤ میرا فلسفہ مختلف زبانوں میں میرا اظہار کرتا ہے اور اپنی جگہ قائم ہے۔''

۱۹۱۶ء میں اپنی مرضی کے خلاف جنگ میں لڑ رہا تھا۔ میرے سارے دوست ختم ہو چکے تھے۔ یوروپ خود کشی میں مصروف تھا۔ میرے سامنے صرف تاریکی تھی۔ اس وقت میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ پیغام سنا جو انہوں نے جاپان کو دیا تھا ٹیگور کے الفاظ کے ذریعے مشرق کی آواز پہلی بار میرے کانوں تک پہنچی۔ انہوں نے یوروپ کی انسان کشی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایشیا کی نشاۃ ثانیہ کی پیش گوئی کی تھی اور جاپان کو خالی نقالی کے خطرے سے آگاہ کیا تھا وہ قوم پرستی کے مخالف تھے۔ انہوں نے کہا'' ہمارے افلاس کے وسیع صحرا پر تخت خداوندی قائم کرو۔ اور یاد رکھو کہ وہ جو بڑے ہیں لازمی طور پر عظیم نہیں۔ اور غرور ہمیشہ فنا ہوتا ہے۔''

لنچ کے بعد تیسرے پہر کو کانگریس کے اراکین دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک گروہ مادام صوفیہ وادیا کی صدارت میں طرزِ زندگی پر مشرق و مغرب کے اثر پر تبادلۂ خیالات کے لیے جمع ہوا۔ دوسرا گروہ امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس کی زیرِ صدارت جمالیاتی اقدار پر مشرق و مغرب کے اثر پر گفتگو کرنے والا تھا۔

طرزِ زندگی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے عظیم جاپانی ناولسٹ جون تکامی نے کہا ___

میں ایک جاپانی لیکھک ہوں اور اس سمے جب کہ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں میرے چہرے پر وہ مسکراہٹ ہے جسے جاپانی پر اسرار مسکراہٹ کہا جاتا ہے۔ بہت سے غیر ملکی اس جاپانی تبسّم کو غلامی اور کاسہ لیسی کی علامت سمجھتے ہیں غیر ملکیوں کا یہ رویہ اس جذبۂ حقارت پر مبنی ہے جو اُن کے دلوں میں جاپان کے لیے ہے۔

لیکن اس تبسّم کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ایک عرصہ دراز تک فیوڈل غلامی کے عالم میں رہے۔ جب ایک جاپانی کسی اور سے ملتا تھا تو اسے فوراً مسکرا کر یہ ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مسکراہٹ عادت میں شامل ہوئی اور پھر اس عارفانہ تبسّم میں تبدیل ہوگئی۔ میں بھی عادتاً مسکراتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس وقت میری شعوری کوشش یہ ہے کہ میں اس تبسّم کے ذریعے آپ لوگوں کے لیے اپنے جذبہ خیر سگالی

کا اظہار کر کے آپ کا خیر مقدم کروں۔

جاپانی تبسم بندگی کے علاوہ امن اور مہربانی کا تبسم بھی ہے یہ نرمی اور ملائمت نہ صرف جاپان بلکہ سارے ایشیائیوں کا شیوہ ہے۔ میرے ملک کی طرح تقریباً سارا ایشیا صدیوں تک ظلم اور تشدد کا شکار رہا ہے جس کی وجہ سے ایشیائیوں کو ایسا مسکین اور متحمل بننا پڑا لیکن ایشیائی علم کی محض یہی ایک وجہ نہیں۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ ایشیا کے لوگ فطرت کے ساتھ بڑے سکون اور ہم آہنگی سے رہنا چاہتے ہیں۔ اہلِ مغرب فطرت سے لڑتے اور اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس پر قابو پانا چاہتے ہیں اسی جدوجہد کے نتیجے میں ان کے یہاں ایک سائنٹیفک کلچر پیدا ہوا اور اس جدوجہد کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایشیا سائنس کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا۔

ٹوکیو میں آپ نے مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا عجیب وغریب امتزاج دیکھا۔ میں آپ کے سامنے مغربی سوٹ بوٹ پہنے بیٹھا ہوں مگر میرے ہونٹوں پر ابھی تک وہ عارفانہ مسکراہٹ ہے ہم نے اپنی جاپانی مسکراہٹ ابھی تک نہیں کھوئی۔

''میں آپ سے اور بہت کچھ کہتا مگر میری انگریزی بے حد کمزور ہے۔''

ہندوستان کے آنند شنکر رائے نے کہا ___

''قدیم ہندوستان نے روم کے ساتھ تجارت کی اور یونان سے لڑا لیکن قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان باہر کے ممالک سے کٹ گیا۔ اس لیے جب یوروپین ہمارے یہاں پہلے تاجر اور پھر حاکم کی حیثیت سے پہنچے تو ہم کو بے حد حیرت ہوئی وہ اپنے نشاۃ ثانیہ کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر عہدِ جدید کے نقیب کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہم ابھی قرونِ وسطیٰ ہی میں پڑے تھے۔ پہلے مشرق ومغرب کے درمیان جغرافیائی فاصلہ تھا اب یہ فاصلہ وقت کا ہو گیا۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان غیر متوازن ارتقاء کے تین سو سال حائل تھے سوال یہ تھا کہ ہم اس تین سو سال کے فرق کو کس طرح پر کریں اور ترقی کی اسٹیج تک جا پہنچیں جہاں وہ اب موجود تھے۔ مگر دوسرا سوال یہ تھا کہ کہیں اس دوڑ میں ہم اپنا پرانا راستہ نہ بھول جائیں اور مغرب کی جس منزل پر پہنچیں تو معلوم ہو کہ شاید مغرب بھی غلط راستے پر چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے نے سوچا کہ ہر مغربی چیز مشرق کے لیے اچھی

نہیں لیکن موڈرن ہونا سب کے لئے اچھا ہے۔لہٰذا ہندوستانی نشاۃ ثانیہ مغربی اصلاحات اور اپنے ماضی کے ورثے کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ ہمارے علاقائی ادب اپنی روایات کو چھوڑے بغیر عہدِ نو میں داخل ہوئے۔ برطانوی آزادخیالی اور فرانسیسی انقلاب اور اُپنشدوں کا مطالعہ بیک وقت کیا جانے لگا لیکن بعد میں قوم پرستی کی تحریک کے زیرِ اثر مغرب کو بالکل مسترد کردیا گیا۔ یوروپ کے خلاف غم و غصّے کا جذبہ شدید ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے اواخر میں ریفارمیشن کی مخالفت اور ماضی کی تجدید اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس زمانے میں آرٹ اور ادب میں بڑی اچھی اچھی چیزیں تخلیق کی گئیں لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہم اپنے ماضی میں محدود ہوکر موڈرن زمانے سے کٹتے جارہے ہیں تب راجہ رام موہن رائے کے سو سال بعد مہاتما گاندھی نے کہا کہ وہ مغرب کے خلاف نہیں لیکن اس موڈرن تہذیب کے مخالف ہیں جو مغرب کو گھن کی طرح کھارہی ہے اور اس کی مدافعت مشرق کو اپنی اہنسا کی پوری طاقت سے کرنا چاہیے۔انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنے اندر ستیہ اور اہنسا تلاش کریں اور اپنے باہر غریبوں، مظلوموں پر نظر ڈالیں۔مہاتما گاندھی قرونِ اولیٰ کے کسی عیسائی سینٹ کی مانند رہتے تھے۔جسمانی اور روحانی محنت کرتے تھے جمالیاتی اور ذہنی اقدار سے بے نیاز فطرت خدا اور عوام کی قربت میں وہ اس طرح زندہ رہے جس طرح آج کل کی دنیا میں اور کوئی انسان نہیں رہا ہے۔اپنے اس جادو کے ذریعے وہ کروڑوں عوام سے جو چاہتے تھے منوا لیتے تھے۔محبت اُن کی جادو کی چھڑی تھی۔

ایسی معجز نما بحث کون کرسکتا ہے؟ یا آپ ان کو مانئے یا اُن کو مسترد کردیجئے ہم سے گاندھی کے راستے کو مسترد کرنا ناممکن تھا۔لیکن ہم جدید یا مغربی راستے کو بھی ترک نہیں کرسکتے تھے۔کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جس چیز کو نامنظور کرسکتے تھے اسے قبول کرلیا؟ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔دراصل جدید مغرب کا سحر ہمارے لیے خود ہی زائل ہوگیا۔پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہم جدید مغرب سے مایوس ہوئے دوسری جنگ کے بعد ہم کو اس سے کراہت آنے لگی۔لیکن ہم کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ گاندھی کا راستہ اختیار کرکے ہم کہیں ڈیڑھ سو سال کی ایک ترقی کو رد کرتے ہوئے پھر قرونِ وسطیٰ میں تو واپس نہ پہنچ جائیں گے۔ ہندوستان میں ایسے خطرناک لوگ موجود ہیں جن کو اہنسا اور ستیہ کی قطعی پروا نہیں اور جو ہزاروں سال برس پرانا سماج اور برہمنوں

کی طبقاتی برتری کا نظام واپس لانا چاہتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے ہمارے یہاں نہرو جیسے موڈرن انسان بھی موجود ہیں لیکن یہ موڈرن انسان بغیر ایک فوج کے اپنا کام نہیں چلا سکتے اور یہ گاندھی کی اہنسا کی تعلیم کا بالکل الٹ ہے گاندھی ۱۹۴۷ء کے بعد کے آزاد ہندوستان کا سب سے دکھی انسان تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ ہمارا گھر تقسیم ہو چکا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ہم نے قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت والے ان خطرناک لوگوں پر جنہوں نے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ قابو پانے کے لئے تشدد کا آزادی سے استعمال کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کو دھوکا دیا۔

ہم عدمِ تشدد کے پابند نہیں رہ سکتے۔ لیکن ان کے سکھلائے ہوئے دوسرے اصول حق پرستی پر قائم ہیں۔ حق کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنا پڑا ہے۔ اور اس کی بنا پر ہم بے حد دکھی ہیں۔ ہم اُن کے بتائے ہوئے راستہ پر پوری طرح نہیں چل سکتے۔ ہندوستان کو سب سے پہلے اس تیزی سے جدید بننا ہے کہ رجعت پسند عناصر تشدد یا فریب کے ذریعے گھڑی کی سوئی کو صدیوں تک واپس نہ پہنچا دیں۔ ہمارے عوام اس قدر بھولے ہیں کہ بڑی آسانی سے مذہب کے نام پر بھڑکایا جا سکتا ہے لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ہم زمانۂ حال کو اپناتے ہوئے اپنی دشمن یعنی قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت سے تو دُور ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے دوست مہاتما گاندھی کے اور ہمارے درمیان کا فاصلہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مستقبل قریب میں تلوار کی جگہ محبت نہیں لے گی۔ شہروں کی جگہ گاؤں اور مرکزی نظامِ حکومت کی جگہ لامرکزیت نظر نہیں آئے گی۔ آج ہمارے یہاں کروڑوں عوام ووٹ دینے جاتے ہیں اگر بے صبری میں انہوں نے ستیہ اور اہنسا کا سہارا چھوڑ دیا تو ملک ایک اور تباہی کی طرف جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی میں ہم زیادہ دیر نہیں لگا سکتے۔ تیز رفتار ترقی ہی انقلاب کا نعم البدل ہے۔

اس وقت ہندوستان کے لکھنے والوں کے سامنے یہ سارے مسائل ہیں۔ دماغوں میں جدیدیت روایت پرستی اور گاندھین فلسفے کے درمیان کشمکش جاری ہے اور جب تک ایک محبت اور ستیہ پر مبنی ٹھوس بنیاد کا فیصلہ نہ کیا جائے عظیم آرٹ یا لٹریچر کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر اس وقت حالانکہ ان گنت کتابیں اور رسالے چھپ رہے ہیں کوئی

غیر معمولی تخلیقات پیش نہیں کی جا رہی ہیں۔ یوروپین تراجم میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اب مغرب اور موڈرن ہم معنی سمجھے جا رہے ہیں۔ مغرب کو اجنبی نہیں سمجھا جاتا۔ کسی قسم کا احساسِ کمتری یا برتری یا اختلاف اس لفظ کے ساتھ نہیں۔ مغرب کی موجودہ اقدار ہندوستان میں بھی رائج ہیں اپنے سیاسی جھگڑے کے باوجود ہم ان کو منظور کر چکے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر کو انگلستان یا مغرب سے کوئی عناد نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا کام کرنے کے لئے اور اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔

ہم آرٹ اور خیالات کی عالمگیر قدروں میں یقین رکھتے ہیں لیکن ہم اپنی قومی انفرادیت کے بھی قائل ہیں۔ ہندوستانیت کو جدیدیت یا عالمگیریت کی لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا صدیوں سے ہندوستان کی تشریح کی جا رہی ہے۔ پچھلی نسل کے لیے ہندوستان غیر مغربی یا غیر جدید کے مترادف تھا۔ آج ہندوستان میں سب کچھ شامل ہے لیکن اس کی روح منفرد ہے۔

ہمارے لکھنے والوں کا مستقبل کیا ہے؟ غالباً بہت جلد موڈرن اور گاندھین راستوں میں سے ایک انتخاب کرنا ہوگا اور یہ فیصلہ بڑا تکلیف دہ ہوگا۔ مغربی لیکھکوں کے سامنے اس قسم کا کوئی اذیت دہ فیصلہ نہیں ہے۔"

بلغاریہ کے کمیونسٹ ادیب بویاں بولغر نے کہا ــــــ

"آج کی دنیا بے حد مختصر ہوگئی ہے لیکن زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے دنیا کا ادب ابھی تک قومی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ ادب اپنی مخصوص قوم کے اعلان کی ترجمانی کرتا ہے۔ بالزاک کے ذریعے ہم انیسویں صدی کے فرانس کی روح میں اتر جاتے ہیں۔

لیکن اکثر ہوتا ہے؟ قومیں جو صدیوں سے ایک دوسرے کی ہمسایہ ہیں (مثال کے طور پر بلغاریہ اور یونان کو ہی لیجیے) ایک دوسرے کے مصنفین کے بجائے فرانسیسی مصنفوں کو زیادہ بہتر جانتی ہیں (میں نے بالزاک کا حوالہ دیا) اور فرانس بلغاریہ سے بہت دور ہے!

چھوٹی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ فن لینڈ اور پنجاب اور بلغاریہ اور ایران کے ادب نے ایک دوسرے کو کتنا متاثر کیا ہے؟ آپ کسی چیز کو جانے بغیر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ ادب کے ذریعے آپ ان قوموں کو جان سکتے ہیں اور ان سے

محبت کر سکتے ہیں۔ محبت کے بغیر امن کی باتیں کرنا بیکار ہے۔

میں ایک چھوٹی قوم بلغاریہ کے ادبی نمائندے کی حیثیت سے آپ لوگوں کو سلام کرتا ہوں تا کہ اس عالمگیر کونسرٹ میں میری آواز بھی سنائی دے جائے۔

فرانس کے آرماں پیئرال نے کہا۔ میں اپنے چند پسندیدہ جاپانی اشعار دہراؤنگا ___

اگر چاند کے کنارے پر ایک لکڑی لگا دو
تو یہ کیسی خوبصورت پنکھیا بن جائے۔

ایک گرتی پنکھری
میں نے شاخ کی طرف واپس جاتی دیکھی
یہ تو تیتری تھی!

وہ لڑکی جو کبھی نہیں آتی!
پرسکون شام میں جلتی ہوئی سمندری گھاس کی مانند

ساحل پر اس کا انتظار کرتے کرتے
میں بھی جل کر راکھ ہو گیا

آہستہ خرام سنہری مور
کی لمبی دم کی طرح طویل رات میں
میں کہاں تک اس کی راہ دیکھوں؟

میری زندگی
پہاڑی ندی پر تیرتے بلبلوں کی مانند نازک ہے۔

ان خیالات کی صدائے بازگشت دوسرے پیرایے میں آپ کو دوسرے ملکوں کی شاعری میں ملے گی'' شروع میں۔ جب زمین و آسمان جدا ہوئے۔ فیوجی یاما کے متعلق ایک مشہور پرانی نظم ہے۔ یہی الفاظ انجیل مقدس میں موجود ہیں۔ ساری دنیا کی لوک کہانیاں معلوم ہوتا ہے۔ شروع میں ایک خاندان میں سنائی گئی تھیں۔ کارمن میرے ایک ہم وطن کی تخلیق ہے لیکن اسے اہلِ اسپین نے خالص ہسپانوی سمجھا۔ ایک چینی اوپیرا اور چند فرانسیسی لوک گیتوں میں مَیں نے عجیب وغریب مماثلت پائی۔ آج کل میں ایک جاپانی ناول کا ترجمہ کر رہا ہوں اس میں پروونشل زندگی کا جو نقشہ ہے وہ کسی بھی فرانسیسی صوبے کے شہر کا ہو سکتا ہے۔''

جاپان کے تاکیو کوابار نے کہا ___

'' پچھلی صدی میں اپنی تنہائی سے نکل کر دفعتاً ہمیں معلوم ہوا کہ اہلِ مغرب ہمارے سروں پر آن پہنچے ہیں۔ برطانیہ ہندوستان کو فتح کر چکا تھا اور اب ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم خود مغرب کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مغرب کی مدافعت کریں۔ یہی عہد میں ہمارے یہاں روس کا بھی آیا اور سوشلزم بھی روایت پرستی بھی موجود رہی۔

جاپان اور نیپال کے علاوہ دنیا کی اور کوئی قوم ہزاروں سال تک متواتر اور مکمل طور پر آزاد نہیں رہی۔ یہ ایک اہم تاریخی حقیقت ہے یہ حقیقت ہماری بہت سی اچھائیوں اور کمزوریوں کی ذمہ دار ہے۔

ہماری زبان میں اختلاف یا غیر ملکی عناصر زیادہ نہیں تھے لہٰذا ہم منطق اور فن خطابت کو ترقی نہ دے سکے لیکن اُن کے بجائے رعنائی اور نزاکت خیال کو خوب جلا ملی۔ فیوڈل عہد میں فلسفہ اور مذہب مرکزی حکومت کے ماتحت تھا لہٰذا جبھی سے قوم پرستی کی داغ بیل پڑنا شروع ہوگئی جدید ادب خالص مغربی ادب کے زیرِ اثر پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کے لکھنے والے اپنی بہت سی روایات کے لیے نادم تھے۔ آج جاپان میں موپساں، استندآل، ٹالسٹائی اور دوستووسکی کو قومی کلاسیک سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی آپ یہ نہ بھولیے کہ جاپان میں تعلیم عام ہے اور عوام کتابیں پڑھنے کے شائق ہیں۔

میں یہ بھی بتادوں کہ ہم نے مغرب کے ہاتھ اپنی روح کو نہیں بیچا ہے۔ ہم مغربی لباس پہنتے ہیں مگر ہماری کھال کا رنگ زرد ہے۔ ہم اس زرد رنگ کے لیے نہ شرمندہ ہیں نہ اس کی وجہ سے مغرور ہمارا تقلید کا دور ختم ہو کر تخلیق کا دور شروع ہو رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ہم ایٹمی عہد کی نفسیات کی عکاسی فیوڈل عہد کے ادبی طرزِ بیان کے ذریعے نہیں کر سکتے۔''

پولینڈ کے انطونی سلوینمسکی نے کہا ____ ''کیا یہاں پہنچ کر چند پٹے ہوئے فقرے دہرا دینے سے وارسا سے ٹوکیو تک کے سفر کا مقصد پورا ہو گیا۔ کیا میں یہاں محض اسی لیے آیا تھا۔؟

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ذہنی تکمیل کے کارناموں کی جس بلندی پر پہنچو وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ یہاں چین کا تیر پہلے ہی سے گڑا ہوا ہے جو کئی ہزار سال قبل پھینکا گیا تھا اور ہند کا تیر اور جاپان کا تیر ____ اور جاپان نے تو اس زمانے میں بھی جب کہ سارا مشرق کولونیل غلامی کی تاریکی میں ڈبو دیا گیا تھا ایسی ٹیکنولوجیکل برتری حاصل کی کہ زار شاہی روس جیسی زبردست طاقت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ترجمے کی دقت بہت حد تک مشرق اور مغرب کی ادبیات کو قریب لانے میں حائل رہی ہے خصوصاً شاعری جس کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ طاقتور سمندری یوروپین طاقتیں صدیوں سے اہلِ ایشیا سے واقف ہیں لیکن پولینڈ جیسے چھوٹے چھوٹے یوروپین ممالک بہت سیکنڈ ہینڈ طریقے پر واقف ہو سکے ہیں۔ ہم کو ہندو چینی اور جاپانی شاعری کے ترجمے انگریزی سے پولش میں کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں آپ خود ایک دلچسپ تجربہ کر کے دیکھئے۔ ایک گم نام پولش نظم پن کلب کے برطانوی سنٹر کو بھیجئے جہاں سے اس کا انگریزی ترجمہ ہنگرین، پرتگالی اور جاپانی سنٹرز میں بھیجا جائے۔ ان ساری زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کا آخری ترجمہ دوبارہ پولش میں کر کے دیکھئے معلوم ہوگا یہ تو کوئی دوسری نظم ہے۔

ترجمے کی دقت اس کے علاوہ دوسری چیز قوموں کی ایک دوسرے سے مکمل ناواقفیت ہے اس کی ایک معمولی سی مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یوروگے میں جب یونیسکو کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ یونیسکو کو پولینڈ کے قومی

شاعر آدم مکی ویز کے متعلق ایک کتاب شائع کرنا چاہئے۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ مغرب اس عظیم ترین سلاد شاعری سے کس حد تک ناواقف ہے۔ ایک مشہور ترین انسائیکلو پیڈیا میں مَیں نے اس کا نام ڈھونڈھنا شروع کیا۔ "M" کے خانے میں مکی ماؤس تو تھا لیکن مکی ویز کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ابھی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اپنے وطن پہنچ کر وارسا میں اپنے یونیورسٹی طالب علموں کو میں نے مکی ماؤس اور مکی ویز کا یہ قصہ سنایا۔ ان کو ہنسی نہیں آئی۔ نہ اس بات میں کوئی لطیفہ انہیں نظر آیا۔

کیوں کہ وارسا کے کسی ایک طالب علم نے کبھی مکی ماؤس کا نام تک نہیں سنا تھا۔!

اس محفل میں جمالیاتی اقدار اور طرزِ زندگی پر مشرق و مغرب کا باہم اثر زیر بحث ہے میں اس مسئلے کے ایک ضروری پہلو کا تذکرہ کروں گا جو میرے ملک کے لیے بڑی خاص اور ڈرامائی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا اشارہ روسی کمیونزم کے چین پر اور چینی فلسفیانہ روایات کے کمیونزم پر اثر کی طرف ہے۔ اسٹالن عہد کی کمیونزم نے بہت سی حکایات اور دیو مالائیں گھڑ لی تھیں۔ گزشتہ سالوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک طاقتور دیوتا اور کینہ پرور راکھشسوں کی ایک ٹولی کی ذاتی مرضی اور من کی موجی پر زندگی اور شخصی آزادی کا تمام تر انحصار ہوتا ہے ہمیں یقین نہیں کہ وہ عہد دوبارہ دہرایا نہیں جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان رکھشسوں سے کس طرح لڑیں۔؟ یہاں پر کنفیوشس کا وہ جواب سنئے جو انہوں نے اپنے چیلوں کے اس سوال پر دیا تھا کہ دیوتاؤں اور راکھشسوں کا رول کیا ہونا چاہیے۔

''جہاں تک ہو سکے ان سے کم سے کم سروکار رکھو۔ پہلے یہ دیکھو کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ امن انصاف اور محبت سے رہتے ہو یا نہیں۔'' جب کنفیوشس سے پوچھا گیا کہ ان ہم جنسوں کے لیے سب سے پہلے کیا کیا جائے۔

''انہیں روٹی مہیا کرو۔''

اور اس کے بعد۔؟

''انہیں تعلیم دو۔''

اس عقلیت پرست پروگرام نے اٹھارویں صدی کے یوروپ کو متاثر کیا تھا۔ یہ

پروگرام اب ایک نئی حقیقت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آیا مطلق العنان دیوتا اور راکھشس آخر میں فتح مند رہتے ہیں یا عقلیت پرست آزاد انسانی خیالات اس بات پر نہ صرف بہت سے چینی اور پولش دانشوروں کی قسمتوں کا انحصار ہے بلکہ سوشلسٹ ہیومنزم کی آئیڈیالوجی کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔

اس وقت ہم لکھنے والوں کو کیا کرنا چاہئے۔ یہ علم معیشت حیوانات کا مسئلہ ہے۔ پوری انسانیت زندگی کے تبدیل شدہ حالات سے مطابقت پیدا کرلے گی یا نیست و نابود ہوجائے گی۔''

"Total War" اور "Two Faces of Man" کے مصنف ڈچ ماہرِ نفسیات میرلو جوسٹ نے کہا ____

''ایک خالص مغربی سائنس کے نمائندے کی حیثیت سے اگر میں بار بار نفسیات کی اصطلاحات استعمال کروں تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ مشرق اور مغرب کے انسان نے تجزیۂ نفسی کے کلنک میں اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل سے جس طرح مجھے باخبر کیا میں اس سے آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ دوسروں کی مختلف خصوصیات انسانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں رکھتیں۔ اس علیٰحدگی کی اصل وجہ وہ روایتی تصور ہے جو انسانوں نے دوسرے انسانوں پر اپنی طرف سے چپکا رکھا ہے اور اس تصور کی اصلاح کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج یہ اختلافات بے حد شدید ہو چکے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغربی یوروپ پیچھے کو سرک گیا اور روس، امریکہ اور ایشیا اپنی اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ سامنے آگئے۔ مغرب اپنے غرور میں مبتلا یہ بھول جاتا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔

اگر میں اپنے مشرقی ماہرِ نفسیات دوست سے کہوں کہ وہ مغربی اور مشرقی کے روحانی فرق پر روشنی ڈالے تو وہ میری اس جاننے کی سعی پر مسکرائے گا اور کہے گا۔ خاموش رہنا سیکھو میرے بھائی اور دھیان میں مصروف ہو کر اپنی اندرونی آواز سنو۔

لیکن کیا تم کو دنیا کے اہم ہنگامی مسائل کا احساس نہیں؟ میں بے صبری سے کہوں گا۔ دیکھو کسی لمحے بھی جنگ چھڑ جائے کولونیلزم ایٹمی خطرہ پرشور مڈل ایسٹ کمیونزم۔

کیا تم نے اپنے اچھے ہوئے ہوئے زیادہ گہرے مسائل کی پردہ پوشی کرنے کے لئے یہ سیدھے سادے شفاف پرابلم تخلیق تو نہیں کر لیے ____ ؟ میرا مشرقی ماہرِ نفسیات دوست کہے گا۔

اور پھر خاموشی چھا جائے گی۔

ایک ڈاکٹر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں جانتا کہ بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں ان کے دکھ، تکالیف مسرّتیں! انسان محبت کرتا ہے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان مرتا ہے۔

جب میرا پہلا چینی مریض میرے پاس آیا تو مجھے بڑی گھبراہٹ سی ہوئی مجھے دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کے نمائندے کا علاج کرنا تھا۔ میں ڈر سے تھر تھر کانپا۔ مجھے اینتھرو پولوجسٹ حضرات نے خبر دار کر رکھا تھا کہ مشرق بعید کا مطالعہ بہت مشکل کام ہے۔

لیکن اس کے پروبلم بھی وہی نکلے جو میرے یوروپین مریضوں کے تھے۔ دکھی بچپن سخت مزاج والدین جنگ سے تباہ شدہ ملک میں اسکول کی تعلیم، بڑے بھائی سے حسد چہیتی بیوی کی موت۔

ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی مخصوص نسل یا ملک میں محض اتفاقاً پیدا ہو گئے مگر اسی پیدائش کے لحاظ سے ہمیں اپنی وفاداریاں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔

مختلف کلچرل سانچوں کے اندر بے شمار روحانی سانچے موجود ہیں اور جب یہ متضاد کلچرل گروہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہنوں کے اندر وہ سارے تعصبات پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور کمیونکیشن علامتوں اور آوازوں اور الفاظ کے مختلف ہونے کی وجہ سے اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلی نصف صدی کی سیاسی اصطلاحات نسل خون زمین رنگ دراصل غیر شخصی اور سائنٹیفک معانی۔ کے بجائے گہرے جارحانہ جذبات کے مظہر ہیں۔

لیکن ہر کلچرل گروہ خوف اور شبہے اور تعصب کے پرانے پیٹرن توڑ کر مذہبی علامتوں اور تخلیقی آرٹ کے ذریعے اپنے آپ کو کمیونی کیٹ کر لیتا ہے۔ مشرق ڈائریکٹ تصوراتی اور الہامی ہے مغرب بالواسطہ ہے تجزیے اور تعبیر و تضمین کا قائل۔

لیکن بے صبر سائیکولوجسٹ ان سب باتوں کا جواب انسانی طرزِ عمل کی ٹیکنیکل اصطلاحات کے ذریعے چاہتا ہے وہ پوچھتا ہے کہ کنفیوشس مہاتما بدھ اسلام اور ہندو فلسفے

کے نفسیاتی محرکات کیا تھے؟ یا یہ کہ عیسائیت اتنے مختلف کلیساؤں میں کیوں بٹ گئی؟

مشرق اور مغرب میں نفسیاتی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ محض چند خصوصیات مشرق سے تعلق رکھتی ہیں اور مغرب سے مشرق کا انسان اپنے خاندان اور اپنی کمیونٹی سے زیادہ قریب رہتا ہے اس کا نجی تنہائی کا مطالبہ مغربی انسان کے اس مطالبے سے جداگانہ ہے یہاں یہ تنہائی مذہبی مراقبے کے لیے پسند کی جاتی ہے لیکن اس مراقبے میں بھی مشرقی انسان گروہ کا فرد رہتا ہے گروہ یہاں زندگی کا مرکز ہے یہاں میں مشرقی ندامت کی کلچر اور مغربی احساسِ جرم کی کلچر کا فرق واضح کردینا چاہتا ہوں انسان کو ندامت اپنے کنبے یا اپنے ہم چشموں سے ہوسکتی ہے اس کا گروہ اس کا طرزِ عمل تیار کر کے دیتا ہے اور انسان اسی گروپ میں رہے جاتا ہے۔ ذاتی احساس جرم اور ذمہ داری کے مغربی تصوّر کے تحت فرد اور گروہ میں بہت فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں فرد کی کشمکش اس کے گروہ سے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے اندرونی وجود سے ہے مشرق میں جرم وسزا کرم کے غیر شخصی قانون کے ماتحت ہے یہاں کسی الوہی مصنف یا ذاتی ضمیر کے فیصلے کی ضرورت نہیں اس کے برعکس مغربی معاشرے نے فرد پر بے شمار پابندیاں عائد کردی ہیں وہ غیر سماجی طرزِ عمل اختیار نہیں کرسکتا۔ احساس جرم سے بچنے کے لیے اسے اپنے شعور سے نفرت اور تخریب پسندی کے جذبات کو اس حد تک نکال دینا پڑا ہے کہ اس کی ریاکاری غیر شعوری بن کر رہ گئی ہے لیکن موجودہ ٹیکنولوجیکل تمدن کا مغربی انسان اب مشرق کے گروہ پسند انسان کی طرح روز بروز گروہ کے پیٹرن میں شامل ہو جاتا ہے۔

مغرب کے انسان کو اپنی شدید تنہائی کی وجہ سے نیوروسس کا شکار ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے اجنبیوں اور غیر ملکیوں سے اسے وحشت ہوئی۔ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو دوسروں سے برتر سمجھنے کی نرگسیت دراصل احساسِ کمتری اور غیر اطمینانی کو چھپانے کا ایک حربہ ہے۔

مشرقی تہذیبیں دوسری تہذیبوں اور نسلوں کے سلسلے میں ہمیشہ سے بہت مہمان نواز اور آزاد خیال رہی ہیں۔ چین اپنی جنگوں میں ہارا لیکن اپنے فاتحوں کو فتح کرتا رہا۔ منگولیا اور منچوریا کے فاتح خود چینی بن گئے۔ ہندو مذہب کا رویّہ سارے مذاہب کے لیے عالمگیر رواداری کا ہے۔ آج سے ہزاروں سال قبل ہندو حکماء نے اس نظریے کو (جو آج کل جدید Physical اصول ہے) منظور کر لیا کہ مختلف نظریے بیک وقت صحیح ہو سکتے ہیں ہندوازم

دوسروں کے خیالات کے لیے جارحانہ طور پر متعصب کبھی نہ رہی۔ اس کے باوجود یہی ہندوازم روح کے اختلافات کے متعلق روادار رہی اور جس مذہبی انفرادیت کے اصول کی تبلیغ کی۔ یہی ہندوازم اپنے معاشرے کے اچھوت طبقے کے لیے انتہائی تنگ نظر ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے اسلام ہندوستان میں کامیاب ہوا۔ اسلام کا مساوات کا رویہ اور عمل پرستی گروہ پرست انسان کی طبیعت کو زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ مسلم مفکر اقبال مشرقی فلسفے کی انفعالیت اور خیال پرستی سے بہت نالاں تھے۔ گو اسلامی طرزِ تفکر کی یکسانیت اور PARTICIPATION کے نفسیاتی پیٹرن کی وجہ سے مسلمان ممالک آمریت کے بڑی آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔

بدھ ممالک میں انسان کے ایکے پر زور دیا گیا ہے۔ انسان اور اس کا خاندان اور اس کا ملک اور سارا نظام کائنات اور نروان۔ یہ سب ایک ہیں۔ اسے ذہنی سکون آفاقی سناٹے میں حاصل ہوتا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے فقیری، سکت کوشی اور غربت اب بھی اورینٹل کلچر کے آدرش ہیں۔

مغرب کا آدرش وہ باغی لوسی فر ہے جو اپنی خودی کے بل پر آفاق سے ٹکر لینے کے لئے تلا رہتا ہے۔ اپنے اُستادوں سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔ مشرق کا انسان اپنے استاد اپنے گرو کے ساتھ ہی رہنے کا متمنی ہے۔

مغرب کا انسان پُراسرار اور غیر منطقی چیزوں سے خائف ہے۔ اسے تفریح میں اندرونی مسرّت نہیں ملتی۔ وہ خوشی کے متعلق باتیں کرتا ہے مگر خوشی محسوس نہیں کرتا۔

انسان کسی جگہ سے تعلق حاصل کرنے کی، کسی گروہ میں شامل ہونے کی حاجت کو مشرقیوں نے زیادہ آسانی سے حل کرلیا ہے وہ آرام سے اپنے ماحول اپنے خاندان برادری طبقے اور قوم میں شامل رہتے ہیں، ہم کو اس شرکت کے لیے ممبر شپ کارڈ ڈپلوما خرچ کی رُکنیت کا لیبل اور شادی کا لائسنس درکار ہے ٹیلی ویژن دیکھتے وقت ہماری تنہائی سب سے زیادہ شدید ہوتی ہے ہمارے اندرونی کھنچاؤ کو کم کرنے کے لیے گروہ کا سہارا ابھی ہمیں میسّر نہیں۔

اب ٹیکنالوجی اور انفرادیت پرستی دونوں کی لہر مشرق میں داخل ہو چکی ہے لیکن کیا مشرق اور مغرب قریب آسکیں گے؟ انسان انسان سے مل سکے گا؟ غریب امیر سے مسرّت اداسی سے تعلق پیدا کرسکتی ہے۔؟

مذہب یا فلسفے کے بجائے انسان کی طاقت اور دولت کی تلاش اور حرص نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے۔

چینیوں، روسیوں، کمیونسٹوں، اہلِ پیرس، عربوں، یہودیوں، ہسپانیوں اور جاپانیوں وغیرہ کے متعلق جو متعصب تصوّرات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔ان کے زائل ہونے میں ابھی بہت عرصلہ لگے گا۔موجودہ سرد جنگ اور اس کے پروپیگنڈے نے ان متعصب تصوّرات کو بے حد ہولناک طور پر بڑھا اور پھیلا دیا ہے۔"

اسی روز لکھنے والوں کے دوسرے گروہ نے امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس کی زیرِ صدارت جمالیاتی اقدار پر تبادلۂ خیالات کیا۔جاپان کے سی ای آئی ٹو نے کہا ____

چیکوسلواکیہ کے نمائندے مسٹر اڈولف ہوف میسٹر نے آج ایک اخبار میں لکھا ہے جاپانی مصوّری کے متناسب اور جاندار خطوط دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ تنظیم اور فرماں برداری اس قوم کی فطرت میں داخل ہے۔

یہ صحیح ہے تنظیم کا یہی احساس آپ کو نظموں کی بحر اوزان افسانوں کے اسٹائل میں ملے گا۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک بے حد کم آمیز اور صابر قوم خیال کئے جاتے ہیں۔

موت کے متعلق ہمارے رویّے کو بھی بہت حیرت انگیز سمجھا جاتا ہے کیوں کہ جاپانی مرنے کی بالکل پرواہ نہیں کرتے اور خودکشی ہمارے معاشرے کا خاص انسٹیٹیوشن رہا ہے۔ موت سے ہمکنار انسان کو زندگی بے حد صاف نظر آتی ہے اس کا اثر آپ ہماری مصوّری میں دیکھئے جہاں سفید پس منظر کے مقابل میں صرف ایک پھول ایک چٹان ایک پہاڑ یا ایک انسانی شکل آپ کو نظر آئے گی۔یہ سفید گراؤنڈ فنا اور عدم موجود کی علامت ہے یہی ہمارا بدھ فلسفہ ہے۔

گو جاپانی گروہ کے احساس سے محروم ہیں لیکن اس کو اپنے خاندانوں اور دوستوں سے بہت اُنسیت ہے ایک قوم جو ساری دُنیا سے الگ تھلگ ایک دُور اُفتادہ جزیرے میں رہتی ہے اسی تنہائی کی وجہ سے وہ اپنا گھر اور اپنے باغات کو سجا کر رکھتی ہے لیکن اجنبیوں سے اسے زیادہ مروّت نہیں دوسری جنگِ عظیم میں جاپانی سپاہیوں کے طرزِ عمل کا پس منظر یہی تھا۔

جاپانی فنکار اسی بدھ فلسفے کے زیرِ اثر سوسائٹی سے بھاگ کر تنہائی میں پناہ لیتا ہے۔
پال تبوری نے کہا۔

''میں ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جہاں مشرق و مغرب میں سے ایک کا انتخاب ایک ہزار سال سے ایک بنیادی مسئلہ رہا تھا۔ ہنگری کو ایک ہزار سال تک اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ آیا وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پُل ہے مشرق کے خلاف ایک فصیل ہے یا دونوں کے لیے اسے ایک پھاٹک کا کام دینا ہے۔

ایک مگیار سے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا ملک بلقان کا ایک حصّہ ہے تو وہ لڑ مرے گا ہمارے لکھنے والوں نے پیرس فلورنس اور میونخ کو اپنا روحانی وطن سمجھا اور اپنی قوم کی مشرقی ذہنیت سے بے حد نالاں رہے۔ اُن کے نزدیک مشرقی ذہنیت کاہلی، بے ایمانی، ناکارہ پن اور جہالت کے مترادف تھی۔

ان لکھنے والوں کا یہ غم و غصہ بہت حد تک حق بجانب تھا۔ ہم نے بازنطین سے تھوڑا بہت حاصل کیا مگر ہنگری کا صرف ایک بادشاہ صلیبی جنگوں میں لڑنے کے لیے گیا تھا اور وہاں سے مایوسی کے علاوہ اور کچھ ساتھ نہ لایا ہمارے لئے مشرق صرف تباہی کا منبع تھا۔ تاتاریوں کے حملے اور قتل عام ترکوں کا تسلّط۔ ہم ڈیڑھ سو سال تک عثمانیوں کے غلام رہے اور اس عرصے میں ہماری تہذیب بالکل برباد ہوگئی ہمارے نشاۃ ثانیہ کو دو سو سال تک انتظار کرنا پڑا۔ ترک تسلّط کے دوران میں ان کی کاہل اور ظالمانہ حکومت اور آرٹ اور لٹریچر کی طرف سے ان کی مکمل بے اعتنائی نے ہمارے اندر غیر ملکی اقتدار کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی سلب کر دی ہنگری کی تازہ صورتِ حال کی جڑیں دراصل اس وقت میں پہنچتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہنگرین قوم کے دل میں مشرق کے لئے عجیب قسم کی جا گزیں رہی۔ ساری اقوام اپنی نوجوانی کے عہد کا فردوس گمشدہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اپنے باغِ عدن کے خواب دیکھتی ہیں۔ مگیار وسط ایشیا سے آئے تھے۔ مدتوں ہمارے بہت سے ہم قوم اپنے ایشیائی رشتہ داروں کی تلاش میں سرگرداں چین تبت افغانستان اور ایران میں مارے مارے پھرے اور اب تو پچھلے بارہ سو سال سے ہنگری کی کلچر کا رخ جبری طور پر مشرق کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

مشرق کا خوف ہمیں اپنے پرانے عوامی ادب میں جا بجا ملتا ہے۔ کسان گیت کار بھنورے سے کہتا ہے اس سے قبل کہ ترک آ کر اسے مسل ڈالیں اسے یہاں سے اُڑ جانا چاہیے۔ اکثر لوک گیتوں میں ان ہنگرین لڑکیوں کی فریاد ہے جنہیں ترکوں نے اغوا کیا یا مار ڈالا۔ ڈھائی سو سال تک ترکوں کے خلاف جنگ نے کوچہ گرد گویوں کے گیتوں میں رنگ بھرا۔ ایک سولہویں صدی کے شاعر نے کہا ____

ترک کا عقیدہ ہے
کہ کسی عیسائی کو وہ دھوکا دے کر اغوا کر سکے
تو صلے میں اسے جنت ملے گی۔

اس طویل اذیت ناک جدوجہد کے بعد ہنگرین اور ترک نے ایک دوسرے کی عزت کر کے امن کے ساتھ رہنا سیکھا۔ سترہویں صدی کے آخر میں تو ہنگرین میں ترکی کے لئے گہری ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور بہت سے ہنگرین وطن پرستوں کے لئے جو اپنے زیادہ خطرناک دشمن یعنی ہیپس برگ تسلّط سے لڑ رہے تھے۔ ترکی اکثر جائے پناہ ثابت ہوا۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں شاعر اور کیتھولک راہب پال ایلیوس نے مغرب کو مشرق کے جھوٹے اور کھوکھلے سحر سے بچنے کے لئے آگاہ کیا۔ اس وقت والٹیر کے زیرِ اثر سارا یوروپ مشرق کے رومان سے مسحور ہوا جا رہا تھا۔

یہ مت کہو کہ چرواہوں کے جھونپڑوں والا ریگستان بڑا خوبصورت ہے۔ اس نے لکھا ____

کیا لندن اور پیرس میں عظیم ترین عقلی شاہکار تخلیق نہیں ہوئے۔
کلیسیت اور کورنیل مغلوں کے
ہندوستان ہرگز نہیں گئے تھے
تم جس نے وی آنا کے محل دیکھے ہیں
تم الجزائر کے وحشیوں کے خیموں کو واقعی پسند کرتے ہو؟

لیکن ایک اور ہنگرین شاعر نے مشرق کی عظمت کے گیت گائے اور اس وقت کی بشارت دی جب مغرب کو زوال اور مشرق کو دوبارہ عروج حاصل ہو گا۔ یہ شاعر سوکونائی

حافظ شیراز کا بڑا پرستار تھا۔

ہمارے عظیم ترین جدید شاعر ایندر راایدؔی کے کلام میں اس روحانی رشتہ کشی کی مکمل جھلک نظر آتی ہے وہ اپنے محبوب پیرس کو خدا حافظ کہہ کر اپنے دُکھیارے وطن واپس جارہا ہے ______

’گا۔پیرس۔گا۔

اجنبی جسے تو نے اپنا۔لے پالک بنایا تھا۔

اپنے وطن واپس جارہا ہے جہاں گیت پیدا نہیں ہوتے

اس پر ترس کھا

مجھے تو ہنگری کی آواز ابھی سے سنائی دے رہی ہے

فقیروں کی ٹولی کی صدا

وہاں کے پھولوں کی مہک میں موت ہے

زمین پر ایک لعنت طاری ہے

ان کھیتوں پر جنہوں نے مجھے جنم دیا

سورج کی کرنوں کا گزر نہیں

لیکن اس کے باوجود میں جاتا ہوں

کیوں کہ اپنی قسمت کو کوئی رد نہیں کرسکتا

میں وہیں پر مروں گا

وہ سونے بادل اور وحشت ناک ویرانہ

میری روح میں خنجر کی طرح اُتر رہا ہے

دوسری نظم میں وہ شیطان اور شراب کے دیوتا گویا مشرق کے مکمل اوتار سے مخاطب ہے ______

اس جدید زمانے میں میرے ساتھ بیٹھنے کے لئے

وہ اودی عبا میں ملبوس گھوڑے پر

ہاتھ میں ستار لئے صبح سویرے

مشرق سے نکل کر میرے پاس آیا
وہ ابدی کلبیت پرست ہے
مشرق مسرور تھا
لیکن موجودہ زمانے.......................
اب کہرہ مستقبل کو اپنی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں سمیٹے
شراب سے بھیگے میز پوش پر ناچتا ہے
شیطان بحث کیے جا رہا ہے

اس طویل بحث کے دوران شاعر اپنے پھٹے ہوئے کوٹ میں سکڑتا اونگھتا رہتا ہے۔ سرخ شراب بہتی جاتی ہے۔ میز پر ایک صلیب کے سامنے دو موم بتیاں جل رہی ہیں۔

ہم دونوں کے درمیان یہ جھگڑا بابل کے زمانے سے چل رہا ہے۔
میرے کسی فضول خرچ پر کرنے
اسے معلق باغات کے نیچے گاتے ہوئے سن لیا ہوگا
اور اس دن سے لے کر آج تک
ابدی کلبیت پرست
میرا خدا میرا باپ اور میرا بادشاہ ہے۔

اب شاعر اس سے کہتا ہے خدا کے لئے یہ بحث ختم کرو۔ صلے میں وہ اسے اپنا ٹوٹا ہوا دل پیش کرنے کے لئے تیار رہتا ہے لیکن ابدی کلبیت پرست حقارت سے ہنستا ہے۔ شاعر اس سے اپنی زمین اپنی آزادی واپس ملنے کی درخواست کرتا ہے وہ شراب اور مشرق کے سحر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سوچنے کی طاقت بھی سلب کر لینے کے بعد وہ ابلیس صفت اس سے رخصت ہوتا ہے ـــــــ

چنانچہ وہ مشرق سے نکل کر
اپنی کافر بے دین تلوار کے ساتھ
مغرب سے نئی لڑائیاں لڑنا چاہتا ہے
میں صلیب کو مضبوطی سے پکڑ کر

گر چکا ہوں، میرے جسم کی گرمی جاتی رہی ہے
ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے درمیان
میز کے نیچے پڑے ہوئے
میرے چہرے پر ایک منجمد مسکراہٹ ہے،

یہ نظم محض اشارتی ہی نہیں تھی اس کا ملک جس طرح براؤن جابروں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اسی طرح آج سرخ آمریت کے مظالم سہہ رہا ہے لیکن ہنگری کے روحانی ورثے کو جو مشرقی تھا۔ کوئی وطن پرست نظرانداز نہ کرنا چاہتا تھا۔ ایران کے نغمے ترکی کی مزاحیہ کہانیاں ہندوستان کی داستانیں اس کے دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مشرق اور مغرب کا فرق بالکل مصنوعی ہے عربوں کے بغیر اسپین کے آرٹ اور لٹریچر میں کیا باقی رہ جاتا ہے؟ کیا شمالی اقوام نے اسکینڈی نیویا اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک تہذیبی شاہراہ قائم نہیں کی کوئی کلچر دوسری تہذیبوں سے کٹ کر الگ تھلگ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ ایسا کرنا چاہیں تو آپ کی کلچر مرجھا کر ختم ہو جائے گی۔"

بلغاریہ کے کمیونسٹ ادیب بورس ڈیلچیف نے کہا ____

"اس وقت جب کہ ہم سب جاپان میں جمع ہوئے ہیں میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے ایک شہر کے نام کا تذکرہ کروں۔ ہیروشیما۔

پچھلے بارہ سال سے ہیروشیما محض ایک شہر کا نام نہیں رہا ہے بلکہ انسانی ضمیر کا سمبل بن چکا ہے ____ یہ ہمارے عہد کی ایک ایسی روحانی حد فاصل ہے جو تخریب کو تعمیر سے کلچر کو غیر کلچر سے انسانیت کو درندگی سے جدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس نے اچھے ادیبوں کو برے ادیبوں سے علیحدہ کر کے دکھا دیا ہے ہمارے عہد کا اچھا ادیب وہ ہے جو اس خطرے کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے جو ہزاروں انسانوں کے سروں پر ایٹمی طاقت کی وجہ سے منڈلا رہا ہے۔ یہ ادیب اپنے قلم کے ذریعے انسانیت کو ہیروشیما سے بچانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس کے سیاسی اور مذہبی نظریات چاہے کچھ بھی ہوں۔ یہ ہر انسان، ہر فنکار کا فرض ہے ہمارے عہد کے ادیب کا کام محض جذبات اور واقعات کی داستان گوئی ہی نہیں وہ اپنے لوگوں کی مصیبتوں سے بے نیاز زندگی کا غیر جانبدار تماشائی نہیں رہ سکتا جیسا کہ ڈرائنگ روم کے

ادب کے مداحین کا خیال ہے۔''

سشن کے بعد چند جنوبی کوریا والے میرے پاس آئے۔'' ہمارے ساتھ تصویر کھنچوایئے'' انہوں نے کہا۔ مشرقی جرمنی کے بوڈو یوزے میرے پاس کھڑے تھے ان سے بھی درخواست کی۔ مگر۔ مگر میں تو مشرقی جرمنی کا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا ہے۔ تصویر کھچ چکی تھی۔ نہ جانے جنوبی کوریا والے اس گروپ کا اب کیا کریں گے۔

شام کو ایک عصرانے کے دوران میں مَیں نے شری واتسائن سے پوچھا ـــــ '' آج صبح ڈاکٹر آئنگر نے ہندوستان میں اُردو ادب کی تخلیق کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ تخلیق ان حالات میں پنپ سکتی ہے جو اس وقت وہاں اُردو کے لیے پیدا ہو گئے ہیں؟'' یہی سوال میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے بھی کیا تھا وہ اس مسئلے پر بہت دُکھی تھے۔ زبان کے معاملے میں لوگ دیوانے ہو گئے ہیں بالکل دیوانے ہو گئے ہیں۔ آج برِصغیر میں زبان کے معاملے میں جس قدر نفرت سے کام لیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر دل لرزتا ہے ڈاکٹر آئنگر نے اُداسی سے کہا تھا۔

میں پارٹی سے باہر آ رہی تھی کہ لفٹ میں بوڈو یوزے مل گئے۔'' چلو!'' انہوں نے کہا۔'' کسی خاموش جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔''

ہم نے چیک ادیب کو ساتھ لیا اور امپیریل واپس آ گئے۔

تہ خانے کے گرم روم میں ابھی سناٹا تھا۔ اکا دُکا امریکن کروڑ پتی اِدھر اُدھر بیٹھے بیئر پی رہے تھے ـــــ ہم تینوں ایک خاموش کونے میں بیٹھ گئے۔'' آج تم نے کس کس کے کارٹون بنائے؟ میں نے چیک ادیب اوڈولف ہوف میسٹر سے اُداسی سے پوچھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا کاغذ کے سرویٹ پر لکیریں کھینچا کیا اوڈولف شاعری ڈرامے اور ناول کی پینتالیس کتابوں کا مصنف پراگ کی چارلس یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف لاء بین الاقوامی شہرت کا کارٹونسٹ جس کی تصاویر ماسکو کے علاوہ نیویارک کے میوزیم آف موڈرن آرٹ میں بھی موجود ہیں۔ اس وقت جانے کس گہری سوچ میں مستغرق بیٹھا تھا۔

'' مجھ کو کچھ کشمیر کے متعلق تازہ ترین صورتِ حال سے مطلع کرو۔'' اس نے اسی طرح منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری کٹھ پتلیوں کی فلموں کا کیا حال ہے؟''میں نے ذرا غصے سے جواب دیا۔

''اچھا۔اچھا۔کشمیر نہیں۔کچھ کلاسیکل رقص پر روشنی ڈالو۔''اس نے معا ہنس کر کہا۔

بوڈویوزے نے بھی بشاش نظر آنے کی کوشش کی۔

اوڈولف جنگ کے زمانے میں گشاپو سے بچ کر فرانس پہنچا لیکن وہاں جیل میں بند کر دیا گیا وہاں سے بھاگ کر مراکش اور پرتگال ہوتا ہوا امریکہ پہنچا۔ جنگ کے خاتمے پر پراگ واپس لوٹا اور ۴۸ء سے ۵۱ء تک فرانس میں جمہوریہ چیکوسلواکیہ کا سفیر رہا۔اس کے بعد کئی سال تک اقوامِ متحدہ میں چیکوسلواکیہ کی نمائندگی کرتا رہا۔اب پراگ اکیڈمی آف ڈیکوریٹو آرٹس میں متحرک کارٹونوں اور کٹھ پتلیوں کے فلمز کا پروفیسر ہے۔

کل اس نے میرے جانے بغیر میرا کارٹون بنایا تھا جو آج صبح کے اخباروں میں چھپا۔وہ خاموشی سے بیٹھا کانفرنس کے مندوبین کے کارٹون بنایا کرتا جو روزانہ ٹوکیو کے انگریزی اور جاپانی پریس میں دھوم دھام سے شائع کئے جاتے۔

بوڈویوزے مشرقی برلن میں رہتے ہیں فلم بناتے اور ناول لکھتے ہیں۔دس بارہ سال میکسیکو اور امریکہ میں رہے ہیں۔ جنگ کے اختتام پر امریکہ رہ جانے کے بجائے مشرقی جرمنی واپس آ گئے۔

''آپ نے کس قدر اُلٹی بات کی۔آپ نے آزادی کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ اچھے خاصے امریکہ میں رہتے سہتے الٹے آہنی پردے کے پیچھے واپس آ گئے۔اسے خللِ دماغ کہتے ہیں میں پوچھتی ہوں آزادی کا انتخاب کیوں نہ کیا۔آپ نے جنابِ والا؟''میں نے اور زیادہ غصے سے کہا ــــــ ''میں نے مستقبل کا انتخاب کیا۔''انہوں نے جواب دیا۔

''آپ کی امریکن بی بی نے کس طرح اپنے آپ کو کمیونسٹ سوسائٹی کا عادی بنایا۔''؟

''شروع شروع میں تو وہ بہت گھبرائی لیکن اب بے حد خوش ہے۔''

''اجی ہاں! خاک بے حد خوش ہے۔روتی ہوگی اپنی جان کو''۔میں نے کہا۔اب میری بشاشت بھی واپس لوٹ رہی تھی۔

جب میں پہلی بار امریکہ گیا۔اوڈلف نے کہنا شروع کیا ــــــ ''تو مجھے بڑا عجیب

لگا۔ مثلاً جب میں نے امریکنوں کو اپنے دوستوں سے کہتے سنا۔ آؤ میں تم کو ایک ڈنر خرید دوں' یا 'میں تمہارے لیے ایک ڈرنک خرید رہا ہوں۔' ہم لوگ کہتے ہیں' آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔' یا 'ڈرنک کرو'۔ اس میں خرید کر دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ اُن کے یہاں انسان کی قدر و قیمت ڈالر سے لگائی جاتی ہے۔ فلاں پچیس ہزار کا آدمی ہے۔ فلاں ساٹھ ہزار ڈالر کا سوال ہے۔ وغیرہ۔ مگر امریکن درحقیقت بہت اچھے لوگ ہیں دل کے برے نہیں۔ بس ان میں بچپنا ذرا زیادہ ہے اگر یہ کمیونزم کی دہشت ان کے اعصاب پر اتنی سوار نہ ہوتی تو کیا پیارے انسان ہیں۔ دنیا کے سارے دوسرے انسانوں کی طرح۔

اب برابر کی میز پر ڈوس پیسیس جان ہرسی اور اسٹین بک آن بیٹھے۔ دوسری طرف ایلمر رائس تنہا بیٹھے تھے۔ اوڈولف ان سب کو منہ لٹکائے دیکھا کیا۔

"پچھلے سال جب میں دلی گیا اور میں نے ایشیائی کانفرنس دیکھی۔" بوڈو یوزے نے کہا ___ "تو مجھے اندازہ ہوا کہ سارا ایشیا دراصل ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ سارے ادیب جو بحثیں کر رہے تھے مشاعرے سن رہے تھے دراصل ایشیائی انسان تھے گو یہ لوگ انگریزی بول رہے تھے مگر ان کی حرکات و سکنات ردِ عمل ماحول ہر چیز خالص مشرقی تھی۔ میں فیض سے بھی ملا جو پاکستان سے آئے تھے۔"

وہاں سے بات دوبارہ ہٹلر کے زمانے تک پہنچی اور عوام محاذ اور اسپین کی خانہ جنگی۔ پھر اوڈولف اور بوڈو یوزے اپنے اپنے لڑکپن کا ذکر کرتے رہے۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ میں پرشیا کے مشہور فوجی خاندان کا فرزند ارجمند تھا ___ اور" "تم" ___ بوڈو یوزے نے خوش دلی سے پوچھا۔ "تمہارے باپ کے یہاں ہاتھی جھومتے ہونگے؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ سفید ہاتھی۔ ہماری کلچر کا ایک بڑا سفید ہاتھی تھا جس پر ہم سب سوار تھے ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس نے زور سے اپنی سونڈ اُٹھا کر ایسی پٹخنی دی کہ ہمارا سونے کا ہودہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔"

میں نے جھک کر دیکھا۔ اوڈولف میز پر رکھے ہوئے سرویٹ پر ہاتھی کے اس منظر کا کارٹون بنا چکے تھے۔

اگلے روز صبح جاپان کے مصنف کوجی رویسری زادا ادبی سیشن کی صدارت کررہے تھے۔ جنوبی کوریا کے ان سوب زونگ نے کہا۔

''کوریا انیسویں صدی کے آخر میں مغربی لٹریچر سے متعارف ہوا۔ اس وقت کورین تین بڑی طاقتوں کے حملے کے خطرے میں تھی۔ چین، روس اور جاپان آخرالذکر نے اس کو اپنا غلام بنالیا۔ ۱۹۱۰ء میں جاپانی قبضے کے بعد سے حاکم قوم نے کوریا کے نیتاؤں کے علاوہ ہمارے دانشوروں پر بھی انتہا درجے کے ظلم توڑے۔ کورین لیکھکوں کو تحریر و تقریر کی آزادی سے مکمل طور پر محروم کردیا گیا۔ اس کے باوجود کورین ادیب اپنے قلم کو جاپانی شہنشاہیت کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ جدید کورین ادب آزادی کے لئے اسی جدوجہد کی پیداوار ہے۔

کوریا کی تاریخ آج سے سوا چار ہزار سال قبل سے شروع ہوتی ہے۔ کورین قوم چینیوں اور جاپانیوں سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہے لیکن ان ہی کی مانند روحانیت کی دلدادہ اور رمزیت پرست رہی ہے ہندوستان کی تہذیب کوریا ہی کے راستے جاپان پہنچی۔

جاپانی جابروں نے ہمارے لکھنے والوں پر ایسی ایسی سختیاں کیں جن کے تذکرے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہمارے جاپانی حکمرانوں نے ہمیں اپنی قومی زبان استعمال کرنے کی بھی ممانعت کردی تاکہ دنیا کی تمدنی تاریخ سے کوریا کے باب کا ایک سرے سے نام ونشان ہی مٹ جائے۔ اہلِ کوریا کو مغربی زبانیں سیکھنے کی بھی اجازت نہیں رہی۔ لیکن اس کے باوجود کورین ادیبوں نے انڈرگراؤنڈ طور پر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اسی زمانے میں ایک شاعر نے دردِ دل کے عنوان سے لکھا ____

'سمندر کے وسط میں ایک چراغ ٹمٹا رہا ہے
رات کے سمندر پر بیکراں تاریکی چھائی ہے
اور آزادی!
میری زمین پر ابدی الم کا تسلط ہے
او شاعری کے پرند!
تو سمندر پر سے روتا ہوا پرواز کررہا ہے

آج کی رات

میں نوحہ گر ایک تن بے جان کی مانند

تیرے ساتھ ساحل پر جاؤں گا۔'

چالیس سال کے اس قبضے کے دوران جاپانی غاصب کوریا کے سارے تہذیبی خزانے کو لوٹ کر اپنے یہاں لے آئے اور اپنے ماضی کی وراثت کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔ ہمیں یقین ہے کہ اب یہ چیزیں کوریا واپس لوٹا دی جائیں گی۔

جدید کورین ادب نیو آئیڈیلزم نیچرل ازم، ڈیکیڈنس، رومانیت اور کلاسیکیت کے ادوار سے گذر چکا ہے۔ غلامی کی وجہ سے الم پرستی ہماری خصوصیت رہی۔

پندرہ اگست ۴۵ء میں کوریا جاپان کی غلامی سے آزاد ہوا مگر کچھ ہی عرصے بعد ہمیں دفعتاً معلوم ہوا کہ ہماری قوم کو اڑتیسویں عرض البلد کے ذریعے تقسیم کر دیا گیا ۲۵ رجون ۵۰ء کمیونسٹوں کے حملے کے بعد سے تاریخ کی ہولناک ترین جنگوں میں سے ایک شروع ہوئی۔ بہت سے ادیب اس جنگ میں مارے گئے۔

کوریا عرصے سے پے در پے غیر ملکی مظالم اور اقتصادی مصائب کا شکار رہا ہے۔ اب کمیونسٹوں کی وجہ سے ہمیں چین نصیب نہیں۔ کمیونزم کے خلاف شدید جدوجہد ہمارے ادب کا نصب العین ہے۔''

پاکستان کے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہا ______

''یہ واقعہ ہے کہ مشرق کی ادبیات کی طرف سوا چند ایک ماہرین کے عام طور پر مغرب نے مطلق کوئی توجہ نہیں دی۔ مشرق کو مغرب نے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ غلامی بڑی آسانی سے روح کی طاقتِ پرواز سلب کر لیتی ہے۔ پچھلے دو سو سال کی بندگی میں ایشیا نے اپنی خود اعتمادی کھو دی اور عظیم ادب پیدا نہ کر سکا۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا رہا کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف بالکل ایک علیحدہ دنیا ہے۔

کل ہی کی محفل میں ایک صاحب نے یہاں فرمایا کہ ان کو جاپان میں بالکل ایک نئی کائنات نظر آئی۔

اگر یہ بات کسی عام آدمی نے کہی ہوتی تو بھی ٹھیک تھا مگر ایک مشہور دانشور کا یہ کہنا

کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف ہے بہت عجیب بات ہے! مشرق کی بھی وہی دنیا ہے جو مغرب کی ہے یہاں بھی ویسے ہی سربلند انسان بستے ہیں جیسے مغرب میں۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانی ناقابلِ فہم ہیں۔ میں یہاں ڈھائی سال سے ہوں اُن کو میں نے پاکستان یوروپ یا امریکہ کے انسانوں سے مختلف نہ پایا۔

مغرب نے ہمیں انسانی آزادی اور حقوق اور مساوات اور جمہوریت کے تصورات سے ایک وسیع پیمانے پر متعارف کرایا لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے قوم پرستی کا تصور بھی آیا۔ اور نیشنلزم خصوصاً انتہا پسند شکل میں انتہائی خطرناک چیز ہے اس کے علاوہ ہماری پرانی روایات اور عقیدے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ کوئی نئی روایت یا عقیدے نے نہیں لی جو روح کے اس خلا کو پُر کر سکے۔ کیا ہمیں مغرب کوئی عقیدہ دے سکتا ہے؟ کمیونزم یا جمہوریت ایسی چیز نہیں ہیں جو روح کو گرما سکیں۔ کوئی ادب بغیر عقیدے یا یقین کے پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تاریخِ عالم میں صرف اُن ہی ادوار نے اعلیٰ ادب تخلیق کیا ہے جن ادوار میں عقیدے راسخ تھے عقیدے کی تباہی کلچر کی تباہی ہے جو آرٹ یا لٹریچر کسی عقیدے کی بنا پر تخلیق نہیں کیا گیا اس کا حشر اچھا نہیں ہوا۔

لہٰذا وہ عقیدہ اب کہاں سے حاصل کیا جائے۔

وہ عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ انسانیت ایک ہے اور متحد۔ اگر آپ کسی رسمی عقیدے میں یقین نہیں رکھتے تو انسانیت کے ایکے میں یقین رکھتے۔'' اٹلی کے البرٹو موراویا نے کہا۔

''مشرقِ وسطیٰ روس چین اور اب جاپان کی سیاحت کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مشرق و مغرب کی تفریق بہت غیر واضح ہے اور اُن کا اختلاف اقتصادی اور صنعتی ترقی کی مختلف سطحوں کی وجہ سے ہے۔ ہم لوگ ایک زبردست صنعتی انقلاب میں گھرے ہوئے ہیں مشرق جسے پسماندہ ممالک کے عجیب و غریب نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پچھلے پچاس سال سے وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مغرب اس سے قبل کر چکا ہے یعنی زرعی معاشی نظام کی جگہ صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش۔ اس کوشش نے خوں ریز انقلاب بپا کئے۔ اسٹالنزم بھی دراصل چند سال کے عرصے میں ایک صنعتی روس کے قیام کی تکمیل تھی۔ یہی کام یوروپ نے سو سال میں کیا تھا۔ روس دوسری ایشیائی اقوام کو جس انقلاب میں گھسیٹ رہا ہے وہ نظریاتی نہیں

صنعتی ہے۔ جاپان اس انقلاب سے مدتیں ہوئیں گذر چکا لہٰذا اس وقت وہ ایشیا کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید ترین ملک ہے جب میں بیس سال قبل چین گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا اٹھارہویں صدی کی اٹلی میں واپس آ گیا ہوں۔ ہم لوگ دراصل وسعت کے بجائے وقت میں سفر کر رہے ہیں امریکن مستقبل میں رہتے ہیں (اکثر یہ ماضی زمانہ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے) جاپان میں ہمیں مستقبل اور حال اور ماضی اکٹھے نظر آ رہے ہیں۔

ایشیا صنعتی انقلاب سے دوچار ہے یہاں نئے روس کی تعمیر ہو چکی۔ نئے چین کی تعمیر جاری ہے۔

ہم ایشیا کو کیا پیش کر سکتے ہیں ____؟ اٹلی کا نظریۂ کائنات اب بھی نشاۃ ثانیہ کی ہیومنزم پر مبنی ہے۔ اس نظریے کا مرکز ملک یا مذہب یا کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ اس کا مرکز انسان ہے۔ یہ نظریہ آپ کو اٹلی کے شاہکار ادب کے علاوہ اٹلی کے فلموں اور ہم عصر تخلیقات میں بھی ملے گا۔ یہ نظریہ مشرق کے خیالات سے مختلف ہے مگر ہم اپنی طرف سے آپ کی خدمت میں اسے پیش کر سکے ہیں۔"

سشن کے بعد سانکی کائیان کی اس عمارت کے نویں فلور پر شین ٹوکیو ریسٹوران میں جاپان کے وزیرِ تعلیم اور یونیسکو کے جاپانی نیشنل کمیشن کے چیئرمین کی طرف سے لنچ تھا۔ ریسٹوران کے وسیع ہال کے دریچوں میں سے ٹوکیو کی فلک بوس عمارات نظر آ رہی تھیں۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

میری میز پر برابر میں ڈاکٹر گلینسپ بیٹھے ہوئے تھے اور فلپائن کا ایک نوجوان صحافی جو اوبزرور کی حیثیت سے آیا تھا۔ میں ڈاکٹر گلینسپ کو دیکھتی رہی۔ یہ اسّی سالہ بوڑھا انسان دوستی اور مشرق پرستی کی خاطر اتنا طویل سفر کر کے یہاں آیا وہ کسی سے بات نہیں کرتے۔ مجھ سے ہمیشہ آرکیالوجی کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کس قدر پیارے اور شفیق بزرگ ہیں۔ فلپائن کا صحافی جس کا کوئی ماضی نہیں کوئی قدیم زبان قدیم تہذیب نہیں چپ چاپ بیٹھا بنارس اور ویدانت پر ہماری باتیں سن رہا ہے اور کھانا کھا رہا ہے۔

سشن کے بعد ہر شخص یہی کہہ رہا تھا۔ کوریا کا نمائندہ جاپان میں آ کر اپنے میزبانوں کو آدھ گھنٹے تک آج گالیاں دیتا رہا۔ یہ چیز سب کے لیے بے حد خجالت انگیز تھی۔

''کوریا صرف چالیس سال جاپان کے قبضے میں رہا ہے'' فلپائن کے صحافی نے کہا۔'' مجھے دیکھو میں نے چار سو سال تک اسپین کی بدترین غلامی کا مزا چکھا ہے۔ میں امریکہ کی کالونی رہ چکا ہوں۔''

بوڑھے انڈولوجسٹ خاموش بیٹھے ہماری باتیں سنتے رہے۔

''پروفیسر۔ جنگ کے زمانے میں آپ کہاں تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں؟ بٹنگن ہی میں تھا۔ لیکن اتحادیوں کی بمباری سے میرا سارا کتب خانہ تباہ ہو گیا۔''

''مشرقی پاکستان میں ابھی ینامتی کی کھدائی جاری ہے۔'' میں نے موضوع بدلا۔

''ہاں۔''؟ انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔'' کیا کیا نئے انکشافات ہوئے۔؟''

لنچ کے بعد ایک صاحب جو پاکستان سے آئے ہوئے تھے مجھ سے آہستہ سے بولے'' دیکھا آپ نے۔ ہمارے نمائندے نے نیشنلزم کے سلسلے میں انڈیا پر کیسی چوٹ کی۔ لطف آگیا۔!!

باہر کوریڈور میں ایک نسبتاً گم نام فرنچ لیکھک اور اُن کی بیوی میرے پاس آئے۔ ہم یہاں سے واپسی پر کراچی آ رہے ہیں چند روز وہاں قیام کر کے ہمارا ارادہ ہے کہ پاکستان پر ایک کتاب لکھیں۔ ہمیں پاکستان سے شدید محبت اور ہندوستان سے دلی نفرت ہے۔ پنڈت نہرو ہمارے خیال میں ایک بے حد بے ایمان اور گھٹیا سیاستدان ہے ہمیں پاکستان بے حد پسند ہے۔''

''جی''۔ میں نے جواب دیا۔'' یہ سیاسی جھگڑے ہیں اور ہمیں اُمید کرنا چاہئے کہ بہت جلد ان کا کوئی قابل قبول حل تلاش کر لیا جائے گا۔ آپ تو انٹلکچوئیل ہیں آپ کو نفرت کے مسئلے پر زیادہ سائنٹیفک طریقے سے سوچنا چاہئے۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میرے اس رویے سے اُن کو جو مایوسی ہوئی وہ اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ انہیں توقع رہی ہو گی کہ میں یہ مژدہ جانفزا سننے کے بعد کہ وہ کراچی میں ایک ہفتہ قیام کے بعد پاکستان پر ایک معرکتہ الآراء کتاب لکھنے والے ہیں خوشی سے بے حال ہو کر انہیں کافی پلانے لے جاؤں گی۔

اب ہم لوگ جاپان کا کلاسیکل ڈرامہ نوہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بھی حسب معمول ہمیں تھیٹر کے دروازے پر تحفوں کے پلندوں سے لاد دیا گیا ہے۔ ہال میں ہماری آمد کو ٹیلی ویژن پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہال دوسرے تھیٹروں کی مانند بے انتہا شاندار اور الٹرا ماڈرن ہے۔ سامنے اسٹیج کی جگہ ایک خوبصورت چوبی مندر ایسا بنا ہے جس کے عقب میں سینری کے پردے کے بجائے ایک بہت بڑا پائن کا سبز درخت لکڑی کی دیوار پر منقش ہے یہ درخت نوہ ڈرامے کا سمبل ہے۔ مندر کے ایک طرف لکڑی کا کوریڈور ونگ کی سمت جاتا ہے۔ ایک پل ایسا آڈینس کی نشستوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ سارا کھیل ان تین راستوں پر پیش کیا جاتا ہے لہٰذا تماشائی گویا کھیل میں شامل رہتے ہیں۔

نوہ پر مغرب میں اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ نے کئی نوہ تمثیلوں کا ترجمہ کیا ہے مگر ہمارے ملک میں کسی کو اس کے وجود سے بھی واقفیت نہیں۔ یہاں تھیٹر ہی سے دلچسپی ہے۔

یہ ایک ایسا عجیب و غریب تماشا ہے جو واقعی ہماری دُنیا میں شامل نہیں معلوم ہوتا۔ سارا ڈرامہ چین کی طرح سمبلزم پر مبنی ہے سارے وقت سیاہ کپڑوں میں ملبوس کروس پس منظر میں موجود رہتا ہے۔ ایکٹر حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر مکالمہ ادا کرتے ہیں۔ یہ آوازیں بس سننے سے تعلق رکھتی ہیں مکالمے کے دوران میں کورس کے دو اشخاص تھوڑی تھوڑی دیر بعد انتہائی بے سری بانسری بجاتے اور ڈھولکی پیٹتے جاتے ہیں (معلوم ہوا کہ یہ ڈھولکی بھی نوہ کا ایک بڑا زبردست فن ہے اور اس کے چند مشہور ڈھولکی نواز گویا جاپان کے احمد جان تھرکوا اور انوکھے لال کا درجہ رکھتے ہیں۔)

جاپانی موسیقی کی افسوس میں تعریف نہیں کر سکتی۔ بے سری بے ہنگم آوازوں اور انتہائی غیر ترقی یافتہ سیدھے سادے چند سازوں پر مشتمل گویا جاپان کی قومی اور کلاسیکل موسیقی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی ایک قوم سارے ہی فنونِ لطیفہ کی استاد ہو جائے۔

نوہ کو اکثر قدیم یونانی ڈرامے سے تشبیہہ دی جاتی ہے یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اکثر ایکٹر ماسک پہنتے ہیں مرد عورتوں کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کورس میں اس ڈرامے کا بڑا نمایاں حصہ ہے جو ایکٹروں کے مکالمے کے ساتھ ساتھ روتا گاتا رہتا ہے پورے ڈرامے کی

ایک RITNAL کی سی کیفیت ہے۔

اُن کی کوسٹیومز انتہائی بھڑ کیلی اور پچھلی صدیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے والا عظیم ترین نوہ ایکٹر (جو بہت بوڑھا ہے) ماسک پہنے کوریڈور میں سے گذرتا اسٹیج پر آیا ہیروئن ہمیشہ ماسک پہنتی ہے گویا (مکمل سمبلوم) ہیرو ایک پندرہ سالہ ہے جو اپنے فن میں پورا اُستاد معلوم ہوتا ہے۔ کہانی شوگن دہد سے متعلق ہے۔

برابر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈوس پیسوسویٹ بوڑھے میاں بڑے غور اور انہماک سے ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ براڈوے کے ڈرامہ نگار ایلمر رائس بھی مبہوت بیٹھے ہیں۔

"PURE DRAMA" ہے۔ ڈوس پیسو مجھ سے چپکے سے کہتے ہیں'' ذرا ان کی اداکاری کی گہرائی تو دیکھو۔'' اپنے جذبات چہروں پر منجمد کئے ہوئے خواب کے سے عالم میں ایکٹر اسٹیج پر چل رہے ہیں اور حلق سے لرزہ خیز آوازیں نکال رہے ہیں دوسرے سین میں راکھشس کودتا پھاندتا ناچتا ہوا آیا اور میں دفعتاً اپنی مانوس دنیا میں واپس آ گئی۔ یہ تو بالکل کتھاکلی کی طرح کا ناچ تھا۔ کتھاکلی کے مقابلے میں وحشیانہ لیکن بہت کچھ اس سے ملتا جلتا۔

پچھلی قطار میں بیٹھی ہوئی کملا دیوی نے مجھے چپکے سے ٹہوکا دیا۔'' ارے یہ تو کتھاکلی ہے۔'' انہوں نے جھک کر کھس پھس کی۔

'' ہاں۔ ہاں۔ مگر چپکی بیٹھی دیکھتی رہئے ورنہ یہ ڈوس پیسو مجھے مارے گا۔ وہ اس وقت PURE DRAMA میں غوطہ زن ہے۔''

پہلے ایکٹ کے اختتام پر جانے کہاں سے خرگوشوں کی طرح بلوں میں سے نمودار ہو کر ریڈیو کے رپورٹر مائیکروفون سنبھالے ہمارے سامنے آن موجود ہوئے۔ نوہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ نوہ کی خصوصیات آپ کو کیسی لگیں۔ ایک رپورٹر نے گینگ وے میں دوزانو بیٹھ کر مائیک ڈوس پیسو کی ناک میں ٹھونس دیا۔

شام کو کیوزومی پارک میں ٹوکیو کے گورنر کی طرف سے عصرانہ، کاغذی قندیلیں اور لکڑی کی خوبصورت تفریح گاہیں جھلملا رہی ہیں ______________ دفعتاً باہر اندھیرے باغ پر جھکا ہوا آسمان روشن ہو جاتا ہے۔ بیک وقت تاریک افق پر بجلی کے قمقموں سے ایک عظیم الشان فیوجی یاما کی آوٹ لائن جگمگا اُٹھتی ہے جس کے آتش فشاں دہانے سے

انار چھپٹ چھپٹ کر سارے آسمان پر پھیل جاتے ہیں۔ رنگ برنگی آتش بازیاں آسمان پر خوش آمدید کے الفاظ لکھتی جارہی ہیں۔ سبزے پر آرک لائٹس کی زد میں ناچتی ہوئی لڑکیاں سامنے آتی ہیں۔ سبزے کے پرے خوبصورت جھیل ہے جس میں کشتیاں بندھی ہیں اور بطخیں تیر رہی ہیں اور مصنوعی پہاڑی راستے ہیں اور درختوں کے کنج جھیل کے کنارے کنارے لکڑی کے اسٹال نصب ہیں جہاں مہمانوں کو کھانے پینے کی چیزیں سروکی جارہی ہیں جھیل کے کنارے سے آسمان کے مقابل میں کھڑا ہوا برقی روشنیوں کا فیوجی یاما اور زیادہ ہوشربا معلوم ہو رہا ہے۔ آسمان کی آتش بازیوں کی روشنیوں کا عکس جھیل پر پڑ رہا ہے۔

اسی آسمان پر ناگاساکی کا دھواں پھیلا تھا۔

اگلی صبح لٹریری سشن جاری رہا۔

اسٹیون اسپنڈر نے کہا ________

''مسٹر چیئرمین۔ میں دراصل پاکستان کے سفیر سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں میرا خیال ہے کہ کل کی ان کی گفتگو اس سشن کی دلچسپ ترین تقریروں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ یہ تقریر پرسنل اور غیر سفارتی تھی۔ اس صورتِ حال کو واضح کرنے میں بہت کامیاب رہی جس کو ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ وہ صورتِ حال عقیدے کا فقدان ہے جس کا ذکر سفیر پاکستان نے کیا۔ میں ان کی راستبازی کا بھی مداح ہوں جس سے کام لیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اُن کے ہم مذہب یعنی مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کے ایمان ناقص اور اُن کے عقیدے متزلزل ہو چکے ہیں۔

میں اکثر باتوں میں اُن کا ہم خیال اور چند باتوں میں بحیثیت ایک مغربی انسان کے اُن سے متفق نہیں ہوں۔

اُن کا ارشاد ہے کہ جن زمانوں میں عقیدے راسخ تھے تبھی عظیم ادب پیدا ہوا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہ بات ہندوستان یا مڈل ایسٹ کے لئے صحیح اور وہاں ایسا ہی ہوا ہو اور اس نکتے پر مغرب اور مشرق کے درمیان فرق کرنا نہایت ضروری ہے مغرب میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس عظیم ادب کے عہد یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان ورجل کے عہد، لاطینی لٹریچر اور چودھویں اور پندرھویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کا یوروپ۔ یہ سب وہ

زمانے تھے جب عقیدہ کھویا جا چکا تھا۔ دراصل اس وقت اہلِ یوروپ نے اپنے آپ کو اسی حالت میں پایا جو حالت سفیر پاکستان کو اپنی نظر آتی ہے۔ یعنی جب عقیدہ صرف ایک سمبل کے طور پر باقی رہ گیا تھا بلکہ میں تو اطالوی حضرات سے یہ پوچھنا چاہوں گا کیا دانتے واقعی ایک مذہبی شاعر تھا۔؟ میرا خیال ہے کہ اُس نے مذہب کو محض نشاۃ ثانیہ کے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس کے علاوہ دو باتیں مغربی نقطۂ نظر سے اور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغرب میں عظیم عہد وہ سمجھے جاتے ہیں جب ایمان ڈگمگا گئے تھے عقیدے محض سمبل تھے اور سیّال۔ مذہب منجمد شاعری بن چکا تھا اور شاعری سیّال مذہب تھی۔ اگر آپ یہ استعارہ سمجھ سکتے ہوں۔

''شاعری ایک ایسا مذہب ہے۔ جس میں مذہبی دماغ ایک شاعرانہ سمبلزم کو آزادی سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن مذہب نے مغرب میں جن شاعروں کو اپنے تسلط میں لیا ہے وہ آرٹ کے لیے اس سمبلزم کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکے۔ یہی حال کمیونسٹ مذہب کا ہے۔''

''دوسری بات جو میں کہنے والا ہوں وہ یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغرب نے دُنیا کی ترقی کے لئے جو کچھ کیا ہم اس کا ذکر کیوں نہ کریں کیوں کہ ہم سب اہلِ مغرب کا یہاں پچھلے ایک ہفتے سے جمع ہو کر خاکساری کے مارے بُرا حال ہوا جارہا ہے۔ ہمارا وقت یہی روتے پیٹتے گذر رہا ہے کہ ہم مشرق کے سامنے کس قدر شرمندہ ہیں ہم بڑے سخت قصوروار ہیں مجرم ہیں ____ مشرق ہی سب کچھ ہے ہم کچھ نہیں ____ مجھے ڈر ہے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد کی نسلیں کہیں گی کہ ان کم بخت اہلِ مغرب میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اپنے کارناموں کی طرف اشارہ بھی کریں لہٰذا انہوں نے اپنے کمالات کو خود نیست و نابود ہوجانے دیا۔ میں نے کبھی لاطینی قوم کو اہلِ روما کو دو سو سال یا ایک ہزار سال تک کے لئے اہلِ یوروپ اور اہلِ برطانیہ کے سامنے اس طرح گڑگڑا کر معافی مانگتے نہیں سنا۔ ہمیں معاف کردو۔ ہم نے تمہارے لئے خوبصورت سڑکیں تعمیر کیں اور گرامر بنائی اور تمہیں اپنی زبان سکھلائی۔ اگر مغرب اس وقت اپنے احساسِ جرم میں گرفتار ہو کر دست بردار ہو گیا تو دنیا ایک ہزار سال پیچھے لوٹ جائے گی۔

''میں مانتا ہوں کہ سیاست میں ہم لوگ خطاوار مجرم ہیں مگر ہم نے اپنے آرٹ اور

سائنس کے ذریعے دنیا کو آگے بڑھایا ہے اور اگر اپنے سیاسی جرائم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ہم اپنے انٹلکچوئیل کارناموں سے بھی مستعفی ہو گئے تو یہ ہمارا سب سے بڑا سیاسی جرم ہوگا۔ یوروپ کا عظیم ترین احسان یہ ہے کہ اس نے ایسے آرٹ فارم بنائے جو سماجی اور تاریخی ارتقاء کا ساتھ دے سکیں۔ یوروپین فنون اور ادبیات کی تاریخ تبدیلیوں کے ایک تسلسل پر مشتمل ہے۔ ایسی تبدیلی اور قلب ماہیت جس میں ساری تاریخ یا اتنی تاریخ جو ذہن اور روح قبول کر سکے۔ آرٹ کی علامتی اصطلاحات میں تبدیل ہوگئی لیکن اس کے ساتھ ہی روح عصر کو روایتی فارم سے منسلک کرنے میں کامیاب رہی۔ یہ یوروپین فنکاروں کا کمال ہے کہ انہوں نے ہم عصر زندگی سے مواد اکٹھا کیا اور اسے آرٹ میں ڈھالا جو ماضی کی روایات سے علیحدہ نہیں اور یہی یوروپ کی جدید شاعری کی تحریک کا سارا ماحصل ہے یہی راں بو اور ٹی ایس ایلیٹ کے معانی اور ان کے تنقیدی نظریوں کی بنیاد ہے مشرق میں مجھے تبدیلی کے بغیر انقلاب کا خطرہ نظر آتا ہے اپنے ماضی کے فارم مسترد کر دینا انتہائی خطرناک قسم کی جدیدیت ہے جس کی تحریک ایک دفعہ یوروپ میں بھی فیوچرزم کے نام سے چلی تھی۔

اب میں اس مذہب کا ذکر کرتا ہوں جو سفیر پاکستان چاہتے ہیں۔ موجودہ مذاہب کی جگہ رائج کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں ہم نے یہاں پر عالمگیر برادری سے متعلق ضرورت سے زیادہ باتیں کی ہیں جب میں نے عالمگیر اتحاد، عالمگیر برادری کے متعلق یہ سب گوہر افشانیاں سنیں تو ایک مصنف کی حیثیت سے مجھے بے حد شرم آئی یہ انسانی برادری کا تذکرہ ایک قسم کا شوربا ہے ہمیں شوربے میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے اس شوربے میں سیاسی خیالات اور گھٹیا آرٹ سب ملا دیا گیا ہے یہ ایک نوع کی کھچڑی ہے جو میرے نزدیک بہت بدذائقہ ہے۔ اہلِ قلم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم چیزوں میں تفریق کریں چہ جائیکہ گڑھے گڑھائے مفروضے اور کلیات دہرائے چلے جارہے ہیں ہمیں یہ تفریق لازمی طور پر کرنا چاہئے۔ ہم سب ایک مخصوص جغرافیہ اور مخصوص تاریخ کے پس منظر سے نکل کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کیا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان مختلف جغرافیائی حدود اور تاریخوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے اور اُلجھنیں پیدا کریں ہم سب کو اس چیز کا بڑی شدت سے احساس ہونا چاہئے کہ ہم ایک نہیں بلکہ ایک دوسرے سے

بے حد مختلف ہیں یہ حقیقت کہ میں ایک جاپانی سے مختلف ہوں یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کے لیے ہم دونوں کو شکر گزار ہونا چاہیے یہ کہنا کہ میں اور میرے وہ کورین اصحاب یا اس ہال میں جمع دوسری اقوام کے حضرات ایک ہیں بالکل لایعنی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سب کی دو آنکھیں ہیں ایک ناک ہے وغیرہ۔ لیکن ہمارا ایک دوسرے سے مختلف ہونا سب سے اہم چیز ہے اور اگر ہم مذہب پر گفتگو کر رہے ہیں تو کم از کم یہ تو سوچ لیں کہ مذہب سے ہماری کیا مراد ہے مذاہب اور عقائد بھی مختلف اور مخصوص علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے الگ الگ سمبل رسوم اور روایات ہیں۔ میں یہاں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مغرب میں ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ عالمگیر برادری کا نظریہ اور شخصیت جغرافیہ اور تاریخ کی تفریق کا ازالہ ادب کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ والٹ وٹ مین کی قسم کے جتنے ادباً نے اس نظریے کو فروغ دیا وہ مغرب کے زوال کے باعث ہوئے۔ لہٰذا میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں کلیات میں جانے کے بجائے اختلافات پر زور دیجئے۔

اسٹیون اسپنڈر کی اس تقریر سے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ ہر ایک کو ان کا لہجہ بہت ناگوار گذرا تھا۔

اوماشنکر جوشی نے پاکستان کے سفیر ڈاکٹر عمر حیات ملک کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے کہا" کہ کل مسٹر البرٹو موراویا نے اطالوی نشاۃ ثانیہ کی انسان پرستی کا تذکرہ کیا تھا جو ان کے ملک میں آج تک زندہ ہے۔ مغربی تہذیب نے انسان کو کائنات کا مرکز بنایا ہے۔ ممکن ہے تین چار صدیوں کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ غالباً اس رویے کی اس وقت بے حد ضرورت تھی۔ یہ رویّہ بہت زیادہ خود پرستی پر مبنی تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ مشرق میں خدا کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے سارے بڑے مذاہب مشرق ہی ہیں پیدا ہوئے۔ لیکن اہلِ مشرق روحانیت کے اتنے دلدادہ نہیں ہیں جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے یہ کہنا اہلِ مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ روحانیت پرست ہیں۔ مبالغہ ہے۔

اور چونکہ مذاہب مشرق میں پیدا ہوئے اور مذہبی جنون کو بھی مذہب کا نام دیا جاتا ہے لہٰذا چند مقتدر پروپیگنڈہ باز حضرات کمیونزم کو بھی ایک مشرقی مذہب کا نام دے رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کمیونزم کو جو مغرب کے صنعتی انقلاب کی جائز اولاد ہے مشرقی کیوں

قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ملک نے انسانیت کے اتحاد پر زور دیا ہے۔ ٹیگور نے بھی انسانیت پرستی کے نئے مذہب کا پرچار کیا تھا۔

یہ نیا عقیدہ کہیں باہر سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ یہ ہمارے اپنے اندر پیدا ہوگا۔

''بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے لکھنے والے مشرق و مغرب کے باہم اثرات کی اتنی پروا نہ کریں اور محض فن کے مکمل پن پر زور دیں ممکن ہے وہ کہیں کہ ایک فن پارہ اگر وہ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکا پھر بھی فن پارہ ہی رہے گا۔ نیگرو مجسمے موڈرن آرٹ کو متاثر کرنے سے پہلے بھی بڑے فن پارے تھے لہٰذا اصل چیز یہ ہے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ایک قوم اپنی اندرونی جمالیاتی حِس کا کس طرح مظاہرہ کرتی ہے اور اگر ہم میں اتنا ظرف موجود ہے تو ہم دوسروں کی جمالیاتی حِس کے مظاہر خود ہی پسند کر سکیں گے۔''

''مسٹر موراویا نے صحیح کہا تھا کہ مشرق کو اپنی انفرادی جینیس پہچاننے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ ہم لوگ ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جو یورپ نے تعمیر کی ہے۔ بحیثیت ایک آرٹسٹ کے مجھے اندازہ ہے کہ ابھی تو مجھے اپنے گھر ہی میں چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کرنا ہے۔ آرٹ کی اپیل عالمگیر ہے مگر فن پارہ ایک ایسی منفرد شے ہے جو اپنے مخصوص زمان و مکان کے سیاق و سباق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات ابھی مسٹر اسپنڈر نے کہی مگر سنسکرت کے نقاد صدیوں پہلے یہ نظریہ پیش کر چکے ہیں۔ کروچے کا مطالعہ کرتے وقت مجھے اس کا نظریہ فن سمجھنے میں دقت ہوئی کروچے کے نزدیک آرٹ روحانی ہے اور آرٹ کے نمونے محض PHYSICAL REMINDERS ہیں۔

لیکن پڑھنے والے اس تجربے میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں جس کے نتیجے میں آرٹسٹ نے اپنا فن پارہ تخلیق کیا۔؟

سنسکرت کے نقادوں نے ہزاروں سال قبل یہ مسئلہ حل کر لیا تھا اور اس میں کروچے والی اُلجھن شامل نہیں۔''

ابھی برازیل کا نمائندہ تقریر کر رہا تھا جب اینگس ولسن، کریمز ینگ اور میں او پر لوبی میں آ کر ریزولیوشن کی تیاری میں مصروف ہو گئے کام بہت تھا اور ہمیں جلدی سے چائے پینے کے بعد پھر باہر جانے کے لئے تیار ہونا تھا۔ شام کو گورنر ٹوکیو نے ہم سب کو کابکی تھیٹر کے لئے

مدعو کیا تھا۔

جاپان کے ہر چھوٹے اور بڑے شہر میں ان گنت تھیٹر ہیں جہاں جدید ڈرامے اوپیرا، میوزیکل کامیڈیز اور بیلے دکھائے جاتے ہیں اداکاری اور اسٹیج کرافٹ کے لحاظ سے جاپان کا تھیٹر یوروپ اور امریکہ کے تھیٹر کا مقابلہ کرسکتا ہے درحقیقت ایک جاپانی کھیل دیکھتے ہوئے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پیرس یا میلان یا لندن کے کسی تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔

لیکن کابکی نوہ کی طرح یہاں کا پانچ سو سال پرانا قومی تھیٹر ہے۔ کہانیاں مشرقی انداز کی ہیں۔ اداکاری کی طرز بھی خالص مشرقی ہے لیکن اسٹیج۔ کابکی کی اسٹیج دیکھ کر ہم سب انگشتِ بدنداں رہ گئے۔ یہ ریوالونگ اسٹیج مغرب کی اسٹیج سے دوگنی بڑی اور چوڑی تھی اور بیک گراؤنڈ میں جس طرح کی منظر کشی کی جارہی تھی وہ ہم میں سے کسی نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ایک جگہ ایک جنگل کا سین تھا۔ ایک کونے میں پُل تھا اس کے پیچھے بہت چوڑی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ جانے ان لوگوں نے روشنیوں کے استعمال سے کیا ترکیب کی تھی یا کیا کرامت تھی کہ پورے وقت ندی کا پانی بہت فاصلے اور بلندی سے پس منظر کی پہاڑیوں میں سے نکلتا شور کرتا چاندنی کی روشنی میں جھلملاتا پل کے نیچے سے گذر کر جانے کہاں غائب ہوتا رہا۔ اس میں پانی کی پھواریں اُڑ رہی تھیں۔ جگہ جگہ پس منظر کی وسعت اور گہرائی میں کہرہ اُڑ رہا تھا۔ چاند پر دھند تیر رہی تھی۔

دوسرے مناظر بھی اس طرح حیرت انگیز حد تک حقیقی تھے۔ ایک مرتبہ اسٹیج پر پورا محلّہ آباد ہو گیا۔ بارش ہوئی کیچڑ پھیلی پھر جاڑے آئے برف گری۔ بہار آئی۔ گاؤں کی چوپال کے آس پاس درخت چیری کے پھولوں سے لد گئے۔

آخری ایکٹ میں ساری ایکٹرسیں اور ایکٹر جو پچاس کے قریب تھے۔ تماشائیوں کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ اُن کا چیف ایکٹر اسی طرح سجدے میں گرا گرا سر اُٹھا کر اپنے ساتھیوں کا تعارف کراتا رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کا تعارف کرایا جو اس ڈرامے میں سیکنڈ ہیرو بنا تھا۔ اور آج پہلی بار اس اسٹیج پر آیا تھا۔ پندرہ منٹ تک سب اسی طرح ساکت و صامت سجدے میں پڑے رہے اس کے بعد اُٹھ کر اداکاری میں مشغول ہو گئے۔

کابکی کی کہانیاں بہت لمبی ہوتی ہیں کھیل صبح سے شروع ہوکر رات تک جاری رہتا ہے۔ ہم لوگوں نے شام کو آخر کے ڈرامے دیکھے جن میں سے ایک ٹریجڈی تھی اور دوسری کامیڈی۔ دونوں ڈرامے ایڈو عہد سے متعلق تھے۔ ان کا ماحول اور جذبات خالص مشرقی تھے۔ ہیروئن کا رونا ہنسنا ہر چیز اپنے یہاں کے پرانے تھیٹروں کی یاد دلاتی تھی۔ یہاں بھی نوہ اسٹیج کی طرح کا پُل بنا تھا اور اداکار برابر پُل پر آتے جاتے رہتے تھے۔

جاپانیوں نے جدید مغربی تھیٹر کو پوری طرح اپنا لیا لیکن اپنا قومی تھیٹر بھی اسی طرح برقرار رکھا ہے اس کی روایتی اور مصنوعی اداکاری بھی نہیں بدلی۔ کیا ہم کبھی اپنے یہاں طالب بنارسی اور آغا حشر کے ڈرامے اس اعلیٰ پیانے پر اتنے الٹرا موڈرن اسٹیج کرافٹ کے ساتھ پیش کریں گے؟ کیا ہم کبھی اتنے فخر اور چاؤ کے ساتھ نل ومنیتی یا صیدِ ہوس غیر ملکیوں کو دکھا سکتے ہیں؟ ہم تو اپنے پرانے تھیٹر کا مذاق اُڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنے اس تہذیبی ورثے سے شرم آتی ہے۔

نوہ اور کابکی دونوں میں کومک عنصر بھی ہوتا ہے طنز اور مزاح کا نشانہ عموماً مندر کا کاہن ہوتا ہے جو اپنی چار سو بیسیوں سے جاہل اور خوش عقیدہ عوام کو بیوقوف بناتے تھے جس طرح ہمارے یہاں بنارس کے پنڈے اور ملّا جی ایک خاص کردار تھے۔

اہلِ جاپان اداکاری میں بڑے ماہر ہیں۔ اُن کے فلم ایکٹنگ اور ٹکنیک کے لحاظ سے فرنچ اور سوئیڈش فلموں کے مانند ہیں۔ اُن کی میوزیکل کامیڈی امریکہ کی طرح بے حد LAVISH ہے۔ بیلے یہاں کا قومی آرٹ بن گیا ہے (غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کا اپنا رقص اس لائق نہیں کہ اسے آگے بڑھایا جا سکتا۔)

اگلی صبح مسٹر اسپنڈرسن کی صدارت فرما رہے تھے۔

جاپانی ڈوس پسیس نے بتایا کہ اسٹین بک ابھی تک اپنے کمرے میں مقیّد ہیں۔ ہوا یہ کہ اُن کو مقامی انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ مگر ڈاکٹر کوئی اور مرض سمجھ کر علاج کرتا رہا۔ اب اس کا علاج ہو رہا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ بحران میں مبتلا تھے۔ اس وقت انہوں نے یہ چند باتیں لکھی ہیں جو میں اُن کی طرف سے آپ کو سناتا ہوں۔ '' مجھے معلوم نہ تھا کہ میں سیاسی عزائم بھی رکھتا ہوں۔ اب پتا چلا کہ ایسا ضرور ہوگا۔ میں بیمار ہوں۔ مار کھانے کا خطرہ ہی ہمیں تمیز سکھاتا

ہے۔ اگر اکثر قوموں کے پاس ہائیڈروجن بم ہو گئے تب وہ لامحالہ امن کے جٹ کبوتر بن جائیں گے۔ گفتگو سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے خاموشی نے کبھی غلط اطلاعات مہیا نہیں کیں۔ گورنمنٹ اس بات کا آخری ثبوت ہے کہ فرد کامیاب نہیں ہوا، سارے انسانوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے یعنی یہ کہ وہ خود بہت اچھے ہیں الو کے پٹھے دوسرے ہی ہیں اچھی زندگی گزار سکنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان مرجائے بُرا آدمی اپنے حق میں اتنا بُرا نہیں ہوتا جتنا اچھا آدمی اپنے حق میں ہوتا ہے۔ خیالات کی قومیت یا نسل نہیں ہے۔'' اسٹین بک کے فقرے سنانے کے بعد ڈوس پیسس نے کہا۔'' اس ریمارک کے سلسلے میں مَیں اپنے دوست اسٹیون اسپنڈر سے جھگڑنا چاہتا ہوں جن کو عالمگیر برادری پر اعتراض تھا جو شخص بھی ساری دنیا گھوم چکا ہے اسے یہ اندازہ ہوگا کہ کلچر اور زبان سے قطع نظر کوئی چیز ایسی ہے جو بالکل اجنبی جگہوں میں بھی ہم کو موجود ملتی ہے اور جس سے ہم بار بار دوچار ہوتے ہیں۔''

''عرصہ ہوا میں ایک کارواں کے ساتھ شام کا ریگستان عبور کر رہا تھا۔ کارواں میں ایک ترک کے علاوہ سب عرب تھے۔ مجھے ترکی نہ آتی تھی اور ترک انگریزی سے ناواقف تھا۔ ایک روز عربوں کے ایک اور گروہ نے کارواں پر حملہ کر دیا لڑائی شروع ہوئی جو سنجیدہ نہ تھی میں نے اور ترک نے اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کیا کہ ہم اس جنگ میں باہر والوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گئے اور جب کہ ہمارے سروں پر گولیاں سنسنا رہی تھیں ہم دونوں نے جانے کس طرح ایک دوسرے سے کمیونی کیٹ کیا کہ اس آدھ گھنٹے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی سوانح حیات سنا ڈالی اور اپنے خاندانوں اور بیوی بچوں کا ذکر کیا اور کسی نامعلوم طریقے سے ہم کو محسوس ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس طرح کا تجربہ مجھے بار بار ہوا کیوں کہ اس کائنات کے باشندوں میں یقیناً کوئی چیز مشترک ہے جو اس خالص ذہن اور خطابت سے مختلف اور بلند تر ہے جس سے اعلیٰ ادب پیدا ہوتا ہے وہ انسانیت کی کوئی خصوصیت ہے یہ خصوصیت ان انسانوں نے پیدا کی ہے جو اس دنیا میں رہتے ہیں۔ جہاں اپنے اختلافات کے باوجود کسی نہ کسی طرح کمیونی کیٹ کر لیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے یوروپین ادباء کہتے تھے کہ وہ ادب کی ری پبلک کے ممبر ہیں کیا ہم لوگ آج کی دنیا میں ایک ادب کی ری پبلک بھی پیدا نہیں کر سکتے؟''

اس کے بعد سلطان تقدیر علی سبحان نے کہا ____

''ہر جگہ مشرق و مغرب اس وقت یکجا موجود ہیں۔ آفاقیت کے رویّے نے موڈرن آرٹ کو تباہ نہیں کیا۔ ہم جدید انڈونیشین لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا کی تہذیب کے قانونی وارث ہیں آج کل دنیا میں جغرافیائی حدود اور مخصوص روایات کے بجائے افراد اور گروہوں کی آزادی اظہارِ بیان اور انتخاب کی خودمختاری آرٹ کی محرک ہے۔ دوسری جنگِ عظیم تجزیہ نفسی مذہب کے متعلق نیا رویّہ پرولتاری ادب موڈرن شاعری۔ یہ ساری چیزیں سارے ممالک کی ادبیات پر یکساں طور پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ ادب اب یقیناً پروشل نہیں رہا۔ ساری دنیا کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ لہٰذا میں اسپنڈر کے خیالات سے متفق نہیں آج کے فنکار کو اپنی سادہ لوحی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ اتنے دنوں تنگ نظر سیاستدانوں کی بازی گری کا شکار رہا۔''

اپنی تقریر میں انہوں نے گوئٹے کا بھی ذکر کیا۔ جس پر مسٹر اسپنڈر نے فرمایا کہ اس کانفرنس میں بار بار گوئٹے کا حوالہ خوب دیا گیا ہے۔ جاپان کے کنزونا کاجی نے کہا۔

''اب تک میں پس منظر میں بیٹھا مترجموں کی ٹولی میں آپ کی تقاریر کا آپ لوگوں کے کانوں کے لئے فوری ترجمہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگوں کے سامنے کمیونی کیشن کا کس قدر زبردست اور دقّت طلب مسئلہ ہے۔

اب انہوں نے بھی اسپنڈر کو مخاطب کیا۔ ہنگری کے موسیقار بیلا برتوک کی موسیقی اپنی نسلی اور قومی خصوصیات سے بھرپور ہے۔ لیکن اس سے اس کی عالمگیر اپیل میں کمی نہیں آئی اور اسے امریکہ اور یوروپ اور جاپان میں بے انتہا پسند کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اہلِ ہنگری کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ باہر والے بھی اُن کے قومی موسیقار کی تخلیقات کی اسپرٹ میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

انگلستان کے کریمز ینگ نے کہا ____

''پروفیسر کنزونا کاجی اور میں نے کل رات گئے تک کل کی تقاریر کا مطالعہ کیا جو وقت کے ٹائپ رائٹرز پر سے نکل کر ہمیں ملتی رہیں۔ ہم لکھنے والے دوسروں کے لئے کتنے دردِ سر کا موجب بنتے ہیں! مترجموں اور مختصر نویسوں نے کل رات بھر اس طرح کام کیا ہے جس

سے کسی بڑے اخبار کے دفتر کی فضا پیدا ہوگئی جہاں صبح کا ایڈیشن نکالنے کے لئے رت جگا منایا جاتا ہے۔ اس پوری کانفرنس کی کارروائی پڑھنے کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچے (جو بے ہمت افزا نتیجہ تھا) اس کی بنیاد پر ہم ایک ریزولیشن آپ کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔

ترجمہ کا معاملہ بے حد کڈھب ہے جس پر ہم لوگ یہاں بہت طویل تبادلۂ خیالات کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایذرا پاؤنڈ نے حال میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا عنوان انہوں نے رکھا ہے ANTHOLOGY DEFINED BY CONFUCIUS یہ گویا قدیم چینی کلاسک کتاب نغمات کی تین سو نظموں کا ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ پاؤنڈ کی قابلیت سے کون منکر ہو سکتا ہے مگر کنفیوشس کے اوریجنل سے اسے دور دور واسطہ نہیں۔ دراصل لگتا ہے جیسے جدید امریکن طرزِ بیان میں پاؤنڈ نے چینی شاعری کی پیروڈی کی ہے اور جنگِ عظیم کے بعد سے آج تک مزاحیہ شاعری کی اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

مترجم کتنا ہی ماہرِ زبان کیوں نہ ہو اُس کے سامنے سب سے بڑا پروبلم یہ ہوگا کہ مثال کے طور پر اُردو یا جاپانی روزمرہ کو کس طرح اپنی زبان میں منتقل کرے کیا ٹوکیو کی بولی ٹھولی کو انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت لندن کی کوکنی کا لباس پہنایا جائے۔؟ یا کیا کیا جائے۔؟

اس کے بعد یونیسکو کے سامنے رکھنے کے لئے انطونی سلوتی مسکی اسٹیون اسپنڈر اینگس ولسن کریمز ینگ اور میری طرف سے تراجم کے متعلق ریزولیشن پیش کیا گیا جو اسی روز صبح ہم نے فائنل طور پر ڈرافٹ کیا تھا۔ مسٹر اسپنڈر نے تجویز میں ایک جگہ لفظ انڈر ڈیویلپڈ ممالک لکھا تھا۔ اس پر میں نے اُن سے کہا کہ پسماندہ سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ممالک تہذیبی طور پر بھی پسماندہ ہیں۔ اینگس ولسن نے بشاشت سے فوراً اقتصادی طور پر پسماندہ کا اضافہ کر دیا۔ اسپنڈر تیوری پر بل ڈال کر خاموش ہو گئے مصر کے ڈاکٹر محمد عوض کی اس ترمیم کے ساتھ کہ اس تجویز میں ایشیا کے ساتھ شمالی افریقہ بھی شامل کر لیا جائے۔ ریزولیشن بالاتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔ اس میں ہم نے ایک اہم شرط یہ بھی رکھی تھی کہ مشرقی شاعری کے تراجم کو جو شروع میں آسانی سے فروخت نہیں ہونگے یونیسکو خود SPONSOR کرے۔

آخر میں میں نے کہا کہ ان ساری تقریروں سے جو مغرب کے مشرق پر اثر کے

متعلق یہاں کی گئی ہیں یہاں یہ امپریشن پیدا ہوا ہے کہ ایشیا نے اپنی ادبی روایات کو بالکل مسترد کر دیا ہے ایسا نہیں ہے، یوروپ میں جدید شاعری نے تاریخِ احساس کو متعارف کیا۔ ہمارے یہاں ممکن ہے یہ احساس موجود نہ ہو کیوں کہ ہمارا نظریۂ کائنات تاریخ اور وقت کے بجائے ابدیت پر مبنی ہے مگر بھگتی اور صوفی تحریکوں کے زیرِ اثر انسان پرستی کی ہمارے یہاں بڑی عظیم روایت موجود ہے۔ برِ صغیر کی ساری علاقائی زبانوں میں انسان پرستی کی بیک گراؤنڈ موجود ہے۔ پچھلی صدیوں میں شمالی ہند بنگال پنجاب سندھ مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے شاعروں، صوفیوں اور سنتوں نے اپنی ہیومنیزم کی بنا پر اعلیٰ ترین ادب کی تخلیق کی۔ لٰہذا یہ خیال بھی غلط ہے کہ مشرق انسان پرستی کے خیالات سے نابلد تھا۔ یوروپ کی حالیہ خونریز جنگوں کے زمانے میں وہاں کے بیشتر فنکار انسان پرستی وغیرہ کو بھول چکے تھے لیکن ہمارے ادیبوں نے زبردست ترین کرائسس کے موقع پر جب کہ سارا برِصغیر آگ وخون اور نفرت کے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ اس وقت بھی اُردو ادیبوں نے انسان پرستی کی روایت کو زندہ رکھا۔ اور آج بھی ان تاریک سیاسی حالات کے باوجود پاکستان کے ادیبوں کی تخلیقات ہندوستان میں شائع ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے اُردو ادیب پاکستان میں مقبول ہیں۔ ان کا فن ان جغرافیائی تاریخی اور قومی خصوصیات سے بالاتر ہے جو مسٹر اسپنڈر کا آئیڈیل ہیں۔

البرٹو راویا سادہ مزاج اور خاموش طبیعت انسان تھے۔ لنگڑا کے چلتے ہوئے ادھر آ کر بیٹھ گئے۔ سیدھے سادے انداز میں کوئی بات کی اور پھر چپ ہو گئے۔ ان کے مقابلے میں اسٹیون اسپنڈر طرح طرح کی ذہنی اُلجھنوں میں گرفتار معلوم ہوتے تھے اللہ اس شخص کو رات کو نیند کیسے آتی ہوگی۔ ڈوس پیسو جن میں انتہائی انکسار تھا اور شفقت اور نرمی بوڑھے کونر ڈلف میاں بیوی جو کیلیفورنیا سے آئے تھے دونوں محبت اور اخلاق کے پتلے تھے ہر ایک کی بات کان لگا کر سنتے چونکہ بے حد بوڑھے تھے لٰہذا عام طور پر ہر جگہ پیچھے رہ جاتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اینگس ولسن جن میں شدید مزاحی حس موجود تھا۔ موسیو آندرے شازوں فرانسیسی اخلاق کا مجسمہ۔ ڈاکٹر محمد عوض جو بے حد خوش مزاج تھے اور بات بات پر لطیفے سناتے انڈونیزیا کا ایک نوجوان افسانہ نگار لڑکا جس کے چہرے پر بڑی بے کسی برستی اور جو لگتا جیسے یہاں آ کر کھو گیا ہے لبنان کے عیسائی کمیل ابوصوان جو شکل وصورت اور رلب و لہجے سے

فرانسیسی معلوم ہوتے'' (نہیں میں عرب نہیں ہوں۔عرب قوم کا کوئی وجود نہیں عربی زبان بولنے والی اقوام کہو) برازیل کا شاعر جس کے خوبصورت چہرے پر خالص لٹن امریکن اُداسی برستی الیکس واہ (ایولین واہ کے بھائی مگر کیتھولک نہیں) سید ھے سادے اور چپ چاپ الگ تھلگ رہنے والے (سنا ہے بھائی صاحب اتنے ہی مغرور ہیں) جارج مکیشن ان ہی کی طرح سید ھے سادے لیکن بے حد خوش مزاج۔کامیابی نے اُن کا دماغ تو ذرّہ بھر بھی خراب نہیں کیا۔ان دنوں گوسپ اس قسم کی ہوتی تھی ـــــــ

''گرہم گرین اس قدر موربڈ کیوں ہیں؟'' (میرا سوال)

مذہب تبدیل کیا تھا۔اس کے بعد شادی کی وہ ہوگئی فیل۔اب رومن کیتھولک عقیدے کی رُو سے طلاق نہیں دے سکتے یہ وجہ ہے۔''

اسپنڈر کیتھولک نہیں مگر اس قدر موربڈ کیوں ہیں؟'' (میرا سوال)

''بوجہ ان پریشانیوں کے جوان کے ضمیر کا لاحق ہیں۔اُن کے مارے چین نہیں ملتا ان کو ـــــ''

''تو پھر ضمیر درست کرلیں'' (میری رائے)

''یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔''

''جی ہاں! اور ذرا ملاحظہ کیجئے گائیں تک کس آرٹسٹک طریقے سے گھاس چر رہی ہیں۔''

''گڈ آفٹرنون ـــــ خواتین وحضرات ـــــ بس کے سرے پر کھڑی ہوئی لڑکی نے مائیک ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا۔

''میرا نام ـــــ ہے جس کے معنی ہیں بارش کی ہزاروں بوندیں۔'' میں آج کی شام آپ کی گائیڈ ہوں۔''

اب ہم لوگ شاہی خندق کی ریلنگ پر جھکے پانی کی شفاف لہروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اسکولوں کے صحت مند بچے یونیفارم میں ملبوس بسوں میں سے اتر کر شہنشاہ کے محل کی زیارت کر رہے ہیں (یہ لوگ اپنی قوم پرستی کس حد تک فراموش کرسکیں گے یہ کون کہہ سکتا ہے) ٹوکیو کی سینٹ صوفیہ یونیورسٹی کا ایک استاد میرے قریب کھڑا ہے۔وہ آپ سے آپ کہنا شروع

کرتا ہے'' تم کو معلوم ہے۔ شکست کے بعد ہمارے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں تھے۔ کھانے کو چاول نہیں تھے۔ ہم گھاس اُبال اُبال کر کھاتے تھے۔ فلپائن کے جنگلوں میں مجھے اطلاع ملی کہ شہنشاہ کو شکست ہوئی ہے۔ میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ ہم نے خوشی سے اپنی ہار کو منظور کرلیا اور اسی وقت سے فوراً تعمیر نو میں مصروف ہو گئے۔''

جنرل مک آرتھر نے لکھا ہے کہ شکست کے بعد وہ شہنشاہ کی توہین کے خیال سے معمولی بش شرٹ پہنے اس سے ملنے کے لئے گیا۔ شہنشاہ نے اس سے کہا کہ اصل مجرم میں ہوں۔ جنگ میری وجہ سے ہوئی۔ میں اس ساری تباہی کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے پھانسی دے دی جائے۔

دوبارہ جب مک آرتھر اس سے ملنے گیا تو قاعدے کے مطابق درباری لباس میں اسی طرح پہنچا جس طرح ایک شہنشاہ کے سامنے جانا چاہیے۔

یہ پرانا ٹوکیو ہے۔ لکڑی کے چوبی مکان چھوٹی چھوٹی دوکانیں بازار مندر کے باہر جم غفیر ہمارے منتظر ____ گیشا لڑکیاں پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لئے کھڑی ہیں۔ ٹیلی ویژن کیمرے چل رہے ہیں۔ مندر میں نوجوان پروہت سیاہ لباس میں ملبوس مائیکروفون پر نہایت فصیح و بلیغ انگریزی میں استقبالیہ تقریر کر رہا ہے۔

چھوٹی چھوٹی کاغذی قندیلوں میں موم بتیاں جلا کر ہم لوگ مندر کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ میں اور مادام وادیا اندر چلے گئے جہاں گوتم بدھ کی عظیم الشان مورتی نیم تاریکی میں جگمگا رہی تھی۔

مادام وادیا بدھ کی مورتی کے آگے جھکی آنکھیں بند کئے پالی میں اشلوک پڑھ رہی ہیں۔ میں نے مورتی کے عقب سے ان کو دیکھا ایک عورت جو برازیل کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئی۔ پیلی ریشمی ساری پہنے ماتھے پر بڑا سا قم قم کا ٹیکہ لگائے آنکھیں بند کئے پالی میں اشلوک پڑھ رہی تھی۔

جس کو جدھر روشنی مل جائے۔

قندیلیں سنبھالے ہم سب کے سب باہر نکلے اور سیڑھیاں اتر کر آنگن میں آ گئے جہاں عود ولوبان سلگ رہا تھا۔ ہم کو تحفے کے طور پر مزید کاغذی قندیلیں اور مذہبی کتابیں دی

گئیں۔ ایک کتاب کے سرورق پر بڑا سا اوم اور سنسکرت کے منتر منقش تھے اندر دس ہاتھ والے دیوتاؤں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ مہایان اور تانترک بدھ ازم جو بنگال سے چلی چین اور کوریا کے راستے یہاں پہنچی۔ اس دور افتادہ سرزمین میں اوم کا نقش ـــــ بڑا عجیب سا لگا۔

ہزاروں انسان روز اس مندر میں پوجا کے لئے آتے ہیں۔ آس پاس کچھ کچھ بنارس کا سا ماحول ہے سوا اس کے کہ یہاں کے چیتھڑوں میں ملبوس فقیر اور غلاظت اور سانڈ اور پان کی پیک اور شور وغل نہیں ہے۔

افسوس کہ فقیر اور بھک منگے بچے مجھے اب تک کہیں نظر نہ آئے (شکست کے عین بعد جب اُن کی بے حد خستہ حالت تھی اس وقت بھی کوئی ایک انسان بھیک مانگتا دکھلائی نہ دیا تھا۔ کسی نے مجھے بعد میں بتایا۔) غالباً ۱۸۸۵ء میں ایک امریکن اخبار نویس لڑکی نیلی بلائی پچھتر دن میں ساری دنیا کا سفر کرتی یہاں پہنچی تو اُس نے لکھا تھا کہ کوڑھیوں، بھوکوں اور بھک منگوں کی اس سرزمین مشرق میں صرف جاپان ایک ایسا حیرت انگیز ترقی یافتہ ملک ہے جہاں اندھے بھی بھیک نہیں مانگتے۔ سارے اندھوں کو تیل مالش کے کام پر لگا دیا گیا ہے۔

رات۔

گنزا (چاندی کا شہر) حسب معمول نیون روشنیوں میں نہا رہا ہے۔ اندھیرے آسمان کے مقابل میں اشتہار برقی روشنیوں سے طرح طرح کے پیٹرن بنا رہے ہیں۔ گنزا جو پکیڈلی اور شان زی لی زے اور براڈ وے کی مانند ہے جاپان کی موڈرن زندگی کا تاریک ترین رُخ ان روشنیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

سڑکوں پر کھڑی ہوئی اسٹریٹ واکر لڑکیوں کی ٹولیاں۔ پیرس کی طرح کے شاندار نائٹ کلب جہاں اسٹرپ ٹیز ہو رہا ہے۔ الٹرا موڈرن ریسٹوران امریکن سپاہیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان سپاہیوں کی سرپرستی کی وجہ سے اسٹرپ ٹیز جاپان کی قومی انڈسٹری بنتا جا رہا ہے۔

پھر یہاں کی لرزہ خیز انڈر ورلڈ۔ بوہیمیا۔ طوائفیں ـــــ

''جاپانیوں کا اخلاقیات سے متعلق بڑا عجیب وغریب رویہ ہے۔ رات کو یہ لڑکیاں

نائٹ کلبوں میں ناچتی ہیں۔ دن میں یونیورسٹیوں میں پڑھتی ہیں۔ اُن کے والدین اسے معیوب نہیں سمجھتے۔'' کسی نے مجھے بتایا ______

''مشرق کی مشہور و معروف شرم وحیا کہاں گئی۔ یہ جاپانی عورتیں جن کی نسائیت کی تعریف کرتے کرتے ہم لوگ مرے جارہے ہیں۔ ان کی بہنیں یہاں ناچ رہی ہیں ______ ''؟ میں کہتی ہوں۔

''اسلامی ممالک کی شرم وحیا بھی تو بہت مشہور و معروف ہے۔لیکن قاہرہ کے نائٹ کلب تم نے نظرانداز کردیئے اور وہ واہیات ترین بیلی ڈانس۔'' وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔

گنزا کی سڑکوں کے کنارے آرٹ اسکولوں کے طالب علم لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے ایزل سنبھالے تصویریں بنانے میں مصروف ہیں نیم تاریک گلیوں میں بیٹھے ہوئے مصوران راہگیروں کے منتظر ہیں۔صرف ایک سو'' ین کے بدلے میں اُن سے اپنے اسکیچ بنوالیں۔

مصوّروں کی برادری عالمگیر ہے!!

ایک روز میں ایک سوہو اور پکیڈلی کی اعلیٰ ترین تفریح گاہوں کی مانند عظیم الشان کئی منزلہ ریسٹوران میں گئی۔معلوم ہوا کہ یہ تو محض نچلے متوسط طبقے کے لئے ہے، مختلف منزلوں پر نچلے اور مزدور طبقے کی لڑکیاں اور لڑکے چاروں طرف بیٹھے چینی چائے پی رہے تھے۔ دیواروں پر دبیز ریشم منڈھا تھا۔چھت پر مصنوعی ستارے جگمگا رہے تھے جن کی مدھم سی روشنی میں کہیں نیچے سے گانے کی آواز آرہی تھی اتنے میں ہال کے سرے پر جہاں خلا تھا رفتہ رفتہ آرکسٹرا کے سازوں اور سازندوں کے سر ابھرتے نظر آئے۔چند لمحوں بعد آرکسٹرا کا تخت اور مائک پر گاتی ہوئی لڑکی فلور کے برابر آگئی۔کچھ دیر تک آرکسٹرا کا تخت اس منزل پر رکا رہا۔اس کے بعد وہ اسی طرح اوپر کی فلور پر چلے گئے اور کچھ دیر بعد آرکسٹرا نیچے اترتا چلا گیا مستقل یہی ہوتا رہا۔

یہ ایک ایسا معمولی درجے کا ریسٹوران تھا جہاں اعلیٰ سوسائٹی نہیں آتی۔

ڈپارٹمنٹ اسٹورز میں بقول شخصے سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک کی خرید و فروخت

جاری ہے۔ ان دکانوں میں سلفر یجز اور ہیرڈز سے زیادہ سامان موجود ہے۔ اُن کے اپنے ریلوے اسٹیشن ہیں۔ دوسری فلور پر ٹرین آ کر رکتی ہے لوگ خریداری کرتے ہیں اور سامان لے کر باہر سڑک پر نکل آتے ہیں۔ دروازوں پر اُن کے ٹکٹ کی چیکنگ کوئی نہیں کرتا۔ ٹکٹ کے معاملے میں بے ایمانی کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختلف فلورز پر لفٹ گرلز دروازوں پر کھڑی بار بار تعظیماً جھک رہی ہیں۔ برقی سیڑھیوں کے نیچے استادہ لڑکیاں اناؤنسمنٹ کے ساتھ متواتر جھکتی جارہی ہیں۔ یہ لوگ اس قدر جھکتے جھکتے تھکتے بھی نہیں۔

مانی چی دنیا کا سب سے بڑا اخبار کا دفتر ہے دن بھر میں جس کے ستر جاپانی ایڈیشن نکلتے ہیں اس کا اپنا ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے۔ اپنے ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر اور کبوتر سروس۔ چھت پر کبوتر پلے ہیں جن سے خبر رسانی کا کام لیا جاتا ہے پریس کلب اپنی آرائش کی وجہ سے اچھا خاصا بکنگھم پیلیس معلوم ہوتا ہے۔

خلاف توقع اس ملک میں امریکن زدگی نظر نہیں آئی۔ لڑکیاں جینز نہیں پہنتیں۔ مرد نہ رنگ برنگے بش شرٹ پہنتے ہیں نہ چوئنگ گم کھاتے ہیں اُن کا معاشرتی ماحول زیادہ تر انگلستان کی طرح کا ہے مجھ سے ایک اخبار نویس نے کہا کہ یہاں کمیونزم کا زبردست انڈر کرنٹ موجود ہے۔ پتہ نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے۔

ان لوگوں کے اصل جذبات کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔

کمیونسٹ لیڈروں سے ملاقات بھی شاذونادر ہی ہوسکتی ہے جارج میکش جاپان کے سب سے بڑے کمیونسٹ لیڈر اور پارٹی سکریٹری کا انٹرویو کرنا چاہتے تھے۔ بڑی دقتوں کے بعد اُن سے ملاقات کا وقت طے کیا گیا۔ لیکن ہر مرتبہ وہ کمیونسٹ لیڈر پیغامبروں کے ذریعے اپوائنٹمنٹ ملتوی کرواتے رہے۔ اسی چکر میں جارج مکیش ہمارے ساتھ ٹوکیو نہ جاسکے۔ انہوں نے حال ہی میں ہنگرین انقلاب پر کتاب لکھی ہے اور اب مشرق بعید میں کمیونزم پر معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے آخر بہت انتظار کے بعد اُن کو ایک پارٹی ممبر کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ لیڈر اُن سے نہیں مل سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے وقت ملک میں کمیونزم زوروں پر تھی اور بہت ممکن تھا کہ انقلاب بپا ہوجاتا مگر عین وقت پر امریکن امداد نے اس نازک صورتِ حال

پر قابو پایا۔

کوئی جاپانی اپنے چہروں پر غصّے کے آثار نہیں لاتا۔ کئی دفعہ میں نے دیکھا سڑک پر سائیکل والے کی ٹکر ٹھیلے والے سے ہوگئی (یہ تین پہیوں والے بڑے اور چھوٹے موٹر ٹھیلے ہیں ہاتھ کے ٹھیلے کوئی نہیں دھکیلتا) ان دونوں نے اُتر کر ایک دوسرے کا گریبان نہیں پکڑا، نہ گھونسے تانے نہ گالیاں دیں خاموشی سے افسوس کا اظہار کیا اور اسی سکون کے ساتھ اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ ساری قوم صدیوں سے لکڑی کے ایسے مکانوں میں رہتی آرہی ہیں جن کی پتلی پتلی کاغذی دیواریں ہوتی ہیں۔ دروازے سرے سے ہوتے ہی نہیں وہی دیواریں اِدھر اُدھر کھسکا کر گھر بند کرلیا جاتا ہے تالوں اور چٹخنیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر نہ چوریاں ہوتی ہیں نہ سیند لگتے ہیں جب کہ حالت یہ کہ عام طور پر مکان ایسی نفیس چیزوں سے سجے ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ چوری کرنے کو جی چاہے۔

ٹوکیو کے جھل جھل کرتے ریلوے سٹیشن کی دیواروں پر چوبی اور روغنی فریسکو بنے ہیں ٹرین کی ساری کوچیں ائیر کنڈیشنڈ ہیں اور پہلو کے بجائے درمیانی کوریڈور کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں سارے ڈبوں میں قالین بچھے ہیں۔

صبح کے دھند لکے میں دو سو کے قریب کانفرنس کے مہمانوں کو لے کر ٹرین ٹوکیو کی طرف روانہ ہوئی۔ چار کوچیں مہمانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ٹرین کے چلنے کے بعد سب نے اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا لوگ دریچوں کے پاس گروہ بنا بنا کر بیٹھ گئے۔

باہر حدِ نظر تک کارخانے پھیلے ہیں جن کی چمنیوں سے دھواں اُٹھ رہا ہے سبزے پر بارش شروع ہوگئی ہے منظر کے بھورے اور سبز رنگوں کا یہ امتزاج انگلستان کے صنعتی کنٹری سائڈ کی یاد دلا رہا ہے ہر طرف فیکٹریاں ہیں اور آگے نکل کر تیز ہری گھاس کے میدان اور گھاٹیاں پہاڑیاں اور دیودار اور پائن کے جنگل جن کے درمیان لکڑی کے مکان بنے ہیں یہاں چاروں اور اتنا حسن ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اصل مناظر ہیں یا کابکی اسٹیج کی سیٹنگز۔

جگہ جگہ سانچی کے پھاٹک کھڑے ہیں۔ ان کے اندر باغات ہیں اور شرائن۔ چھتریاں لگائے عورتیں گڑیوں کی طرح چلتی لکڑی کے پلوں پر سے گزر رہی ہیں۔ پائن سے

ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر بادل تیر رہے ہیں۔ بادل جھک کر گاؤں پر چھا گئے ہیں۔ دھان کے کھیتوں پر بہتے پھر رہے ہیں ٹرین کے شیشوں سے ٹکرار ہے ہیں۔

پائن کا درخت صرف صاف ہوا میں بڑھتا ہے یہ شفاف ہوا ہے جو بانس کے جھنڈوں میں سرسرا رہی ہے۔ اس قبرستان پر سے گزر رہی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی قبروں میں مرے ہوئے جاپانیوں کی راکھ دفن ہے چاروں اور پہاڑیوں پر پائن کے سیدھے درخت کہرے میں چھپے کھڑے ہیں کولتار کی سڑکیں بل کھاتی سرسبز گاؤں میں سے گزر رہی ہیں۔ برساتیاں اور نل بوٹ پہنے کسان کھیتوں میں کام کر رہے ہیں بر جس نما سفید پائجامے پہنے اور سر پر سفید رومال باندھے کسان عورتیں پگڈنڈیوں پر سے گزر رہی ہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی اسٹیشنوں پر مسافر برساتیاں پہنے چھتریاں سنبھالے مغربی پوشاک میں ملبوس خاموشی سے ٹرین کے منتظر کھڑے ہیں بالکل انگلستان کے دیہاتوں کا سا منظر ہے۔

ٹرین دیودار کے درختوں اور بے تحاشا طویل سرنگوں میں سے گزر رہی ہے۔

"الو ــــ"

"او ــــ بلوژآں ــــ"

"وہ منہ لٹکا کر ایک نشست کے ہتھے پر ٹک جاتا ہے میں زین کے مطالعے سے دست بردار ہو چکا ہوں۔"

"بہت اچھی خبر ہے۔"

"وہ دیکھو۔ وہ رہا فیوجی یاما۔"

یہ مانتا ہوں کہ ان لوگوں کا آرگنائزیشن محیر العقول ہے۔"

"درست!"

"تو تم اس طریقے سے تعریفیں قبول کر رہی ہو گویا تمہارا ہی ملک ہے۔"

"ایشیا تو ہے۔"

لبنان کے کیتھولک عرب کمیل ابوصوان سر اُٹھا کر مسکرائے۔ "ادھر دیکھو۔" انہوں نے دفعتاً کہا۔

اب ٹرین سمندر کے کنارے کنارے جا رہی ہے۔ ریل کی پٹری اور لہروں کے

درمیان صرف چند گز کا فاصلہ ہے دوسری طرف پہاڑیوں پر بانس کے جھنڈ ہیں جن کے ہلکے ہلکے ہرے پتے آبشار کی طرح نیچے گرتے ہیں سمندر کے کنارے کنارے کولتار کی شفاف سڑک پر سے اکا دکا موٹر سائیکل گزر جاتی ہے سمندر پر چھایا ہوا کہرہ پہاڑیوں پر تیرتے بادلوں سے مل جل کر ایک ہو گیا ہے۔

ہاماتسو کے قریب اسکول کے بچوں کا ایک گروہ دھان کے کھیتوں میں سے گزر رہا تھا۔ اسٹیون اسپنڈر نے کہا۔ "ان کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آرہا ہے جب میں دکانوں کی کھڑکیوں میں اندر رکھے ہوئے کھلونوں کو حیرت سے دیکھتا تھا۔"

مادام شازوں کہنے لگیں۔ "ان مناظر میں کس قدر رنسائیت ہے۔! پہاڑوں کو دیکھ کر بھی کر ختگی کا احساس نہیں ہوتا۔"

اتامی میں گرم پانی کے چشمے ہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر خوبصورت ہوٹل ہر طرف جھرنے گر رہے ہیں۔

آٹھ گھنٹے گزر گئے اب ہم کیوٹو کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

اس ٹرین کا نام مسکورا ہے اور یہ بیوا جھیل کے کنارے کنارے تیزی سے کیوٹو کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اوساکا یا سرنگ کو عبور کر لیا اور اب کا مودریا کے پل پر سے گزر رہی ہے۔

کیوٹو۔ سرسبز پہاڑیوں پر پھیلا ہوا جاپان کا قدیم دارالسلطنت۔ یہاں بمباری نہیں ہوئی اس لئے اولڈ ورلڈ ماحول اب بھی برقرار ہے۔ ہمارا وکٹورین طرز کا مکایو ہوٹل ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایستادہ ہے جس کے دریچوں میں سے سارا شہر نظر آتا ہے کچھ کچھ مسوری کا سا منظر ہے ہوٹل کے عین عقب میں آبشار گر رہے ہیں۔ بارش اب تیزی سے برسنا شروع ہو چکی ہے۔

شام کو ہم لوگ چاء کی رسم کے گرینڈ ماسٹر یوراسینکے کے یہاں مدعو تھے۔ موسلا دھار مینہہ میں ہم لوگ مسٹر یوراسینکے کی ولا کی طرف روانہ ہوئے وہاں باغ کے پھاٹک پر چھتریوں کے انبار سنبھالے لڑکیاں ہماری منتظر کھڑی تھیں کیچڑ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے بارش کے ریلے میں بہتے ہم اپنے میزبان کی خالص جاپانی وضع کی ولا میں پہنچے حسب دستور اندر پہن کر

جانے کے لئے چپلیں پہلے ہی سے برآمدے کے نیچے موجود تھیں اس وقت ان بڑے بڑے دانشوروں کو جاپانی چھتریاں اُٹھائے پانی میں شرابور بڑی بے کسی کے عالم میں لڑھکتے پڑھکتے قطار اندر قطار وِلا کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

جاپانی مکانوں میں فرنیچر بالکل نہیں ہوتا۔صرف چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں۔جا بجا گلدان نظر آتے ہیں۔دیواروں پر پینٹنگز یا لمبے اسکرول آویزاں ہوتے ہیں۔مہمانوں کی آمد پر گھر کی بی بی دیوار کے اندر بنی ہوئی نیچی الماریوں کا پٹ کھسکا کر کشن نکالتی ہیں جو چٹائیوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔چوکی کے گرد فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔

یہ کیوٹو کے قدیم ترین ارسٹوکریٹک خاندان کا مکان تھا مگر اس کی سادگی کا بھی یہی عالم تھا۔

چائے کی رسم کے متعلق ہم کو پہلے سے بہت سے لیکچر پلائے جا چکے تھے۔ٹرین ہی میں اس کی ہسٹری کے متعلق ایک کتابچہ پڑھا دیا گیا تھا۔ یہ بتلایا گیا تھا کہ یہ ایک ایسا RITUAL ہے جس کی بہت سخت روحانی مذہبی اور تہذیبی اہمیت ہے یہ جاپانی آداب محفل کا نچوڑ ہے۔ یہاں کے معاشرتی اخلاق کا سمبل ہے پھول سجانے کے فن کے اسکولوں کی طرح یہاں چاء بنانے اور پیش کرنے کے فن کے اسکول بھی ہوتے ہیں جہاں جائے بغیر اعلیٰ خاندانوں کی لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہیں سمجھی جاتی۔اس رسم کا باقاعدہ ایک پورا فلسفہ ہے وغیرہ وغیرہ یوراسینکے اس ملک کے گرینڈ ماسٹر ہیں ایک قسم کے سجادہ نشین۔

اور اس کی آبائی سندان کے خاندان میں یہی کوئی آٹھ نو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔

اُن کی بی بی اور بیٹے اور فرنچ بولتی ہوئی بے حد خوبصورت بہو نے ہم لوگوں کا سواگت کیا اور حسب دستور بات بات پر ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی رہی یہ لوگ سب کیمونو میں ملبوس تھے ہمیں مختلف کمروں میں بٹھلا دیا گیا۔ایک کمرے میں ڈونگر کیری وادیا اور میں مزے سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے مگر یوروپین خواتین و حضرات کی فرش پر بیٹھنے میں بڑی کمبختی تھی پھر نہایت اہتمام سے کمرے کے سرے پر ایک خاص طرح کی کیتلی میں چاء تیار ہوئی اس کا چولہا فرش کے اندر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں بنا تھا۔ہم سب دم سادھے بیٹھے رہے کہ دیکھئے

اب کیا ہوتا ہے فضا پر زبردست تقدس کا ماحول تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ میں کمرے کے کونے میں بالکل دیوار سے لگی بیٹھی تھی میں نے ذرا پیچھے مڑ کر دیکھا ___ اس کونے کی دیوار ذرا کھسکا دی گئی۔ اور اس میں سے باغ کا ایک گوشہ نظر آ رہا تھا درختوں کے پتے، باغ کے فرش کے پتھر اور بارش کی پھواریں اوپر سے نکلتی ہوئی روشنیوں میں جھل مل کر رہی تھیں۔

رنگ برنگے کیمونو میں خوبصورت لڑکیاں سخت سنجیدہ شکلیں بنائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہمارے سامنے آئیں۔ دوزانو جھک کر رکوع میں گئیں سامنے ایک پلیٹ رکھی جس میں ایک عدد لڈو بانس کے ٹکڑے پر پتے میں لپٹا ہوا دھرا تھا سجدے میں گریں جواباً ہم بھی تعظیماً جھکے پھر وہ اُٹھ کر اسی طرح چلتی ہوئی واپس گئیں۔ لڈو بے حد بدذائقہ تھا لیکن خاموش رہے۔ معاملہ روحانیت اور تہذیب کی اعلیٰ ترین سمبلوم کا تھا۔ دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔

ابھی کلائمکس باقی تھی وہی لڑکیاں دوبارہ نمودار ہوئیں۔ ہمارے سامنے آ کر سجدے میں گریں ایک چینی کے پیالے میں ایک ہرے رنگ کا گاڑھا سا جوشاندہ سامنے رکھا دوبارہ سجدہ کیا ہم بھی جھکے وہ واپس گئیں۔ میں نے مادام وادیا سے چپکے سے پوچھا۔

''اب کیا ہوگا۔؟''

''اسے پی جاؤ اور کیا ہوگا۔ منہ ہرگز نہ بنانا۔''

''مگر یہ ہے کیا شے۔ خیر ابھی چاء آتی ہوگی۔ اس سے حلق صاف ہو جائے گا۔''

''ارے یہی تو چائے ہے۔'' کملا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ پوری پینا پڑے گی۔ ایک بوند پیالے میں نہ چھوڑنا ورنہ انتہائی بداخلاقی سمجھی جائے گی۔''

لہٰذا بہادری سے کام لیتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کیں اور انتہائی نفاست سے پیالہ ہاتھ میں اُٹھا کر وہ کڑوا ملغوبہ جسے جاپانی ستم ظریفی سے چاء کہتے ہیں میں نے ھوالشافی کہہ کر پی ڈالا۔ کملا اور مادام وادیا بھی اس فرض سے سبکدوش ہو چکی تھیں اور بڑی متانت سے بیٹھی تھیں یقیناً اس وقت ہم تینوں کے چہروں پر گھڑوں نور برس رہا تھا۔

اس کڑوے کسیلے جوشاندے کے لئے اس قدر دھوم دھام جب سے اس ملک میں آئے تھے مارسب جاپانیوں نے مل کر ناک میں دم کر رکھا تھا چائے کی رسم ایسی ___ اور

چائے کی رسم ویسی۔

بہت شور سنتے تھے ہاتھی کی دُم کا۔

اس جان لیوا چائے کے بعد چھوٹا سا حقہ پیش کیا گیا۔ سب نے باری باری کش لگائے۔

"اب کیا حقہ بھی پینا ہوگا؟" میں نے لرز کر مادام واد یا سے پوچھا۔

مگر شکر کہ حقہ آتے آتے کچھ ایسا کنفیوژن ہوا کہ ہم تینوں جلدی سے اُٹھ کر جھک جھک کر میز بانوں کو BOW کرتے اوپر کی منزل پر پہنچ گئے جہاں جاپانی طرز کی ضیافت کا انتظام تھا ہم کئی بار خالص جاپانی دعوتیں کھا چکے تھے لہٰذا اس خوفناک کھانے کی بھی عادت پڑ گئی تھی۔ ایک طرف اسٹیج پر لڑکیوں نے نوہ کا ایک ڈرامہ شروع کر دیا۔ امریکن نے بتایا کہ ہمارے میز بان کا جاپان کی سوسائٹی میں وہی درجہ ہے جو راک فیلر خاندان کو امریکہ میں حاصل ہے ہمارا یہاں مدعو کیا جانا بے حد فخر کی بات ہے یہ عزت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

کھانے کی چوکی پر میرے اور کملا دیوی کے برابر میں چند فرنچ اور ڈینش مصنفین بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر حسب معمول سیاسی گفتگو شروع ہوگئی ایک فرانسیسی نے دوسرے سے کہا ـــــ "ہندوستان اور پاکستان والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں تو صلے میں جنت ملتی ہے۔"

"ہاں ـــــ دوسرے نے جواب دیا ـــــ "اسی وجہ سے پاکستان میں اب تک ایک ہندو باقی نہیں سب قتل ہو چکے ہیں اور انڈیا میں چن چن کر مسلمانوں کو بھون ڈالا گیا ہے۔"

وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سنی ان سنی کرنا چاہی کیوں کہ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی گفتگو سے بری طرح عاجز آ چکی تھی مگر کملا دیوی کے آگ ہی تو لگ گئی اپنا غصہ چھپا کر انہوں نے رسان سے فرانسیسیوں سے کہا۔ "آپ تو بڑے دانشمند لوگ ہیں اور یہ آپ کی جہالت کا عالم ہے ہم کو تو آپ کے بھائیوں انگریزوں نے لڑوایا ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ آپ تو عیسیٰؑ کو ماننے والے ہیں سارے کے

سارے یوروپین اور آپ نے کس طرح ایک دوسرے کو تباہ کیا ہے اپنے ہی گرجاؤں پر بمباری کی ہے۔

لاکھوں کو پچھلی جنگ میں موت کے گھاٹ اُتار دیا ____ آپ جو بڑے تہذیب اورانسانیت کے ٹھیکیدار بنتے ہیں۔''

''مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ نہرو پاکستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں ____؟'' ڈنمارک کے ناولسٹ نے کملادیوی کو مخاطب کیا ____ ''نہرو کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان کو غلام رکھے۔ پاکستان صدیوں سے ہندوستان سے علیحدہ قوم ہے جسے انگریزوں نے برٹش انڈیا کے نام سے ہندوؤں کے ملک سے ملا رکھا تھا۔ اب نہرو کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے۔ پاکستان کی انڈیا سے بالکل جداگانہ پانچ ہزار سال قدیم تہذیب ہے ____ کیا یہ صحیح نہیں ____؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''کملادیوی'' ____ میں نے ان سے کہا ____ ''ان سب باتوں کا جواب آپ اُن کو دیجئے میں کھانا کھاتی ہوں۔ چائے نے الگ منہ کا مزہ کرکرا کردیا۔ جانے اس میں دھتورہ ملا تھا یا کیا ____''

دُوسرے روز صبح تین ریوجی مندر میں کانگریس کا آخری سشن تھا۔ کیوٹو کے اخبارات نے ٹوکیو کے اخباروں کی طرح ہمارے متعلق اسپیشل ایڈیشن نکالے تھے ایک انگریزی میں HEMING BECK HOAX کے عنوان سے ایک مزاحیہ مضمون چھپا تھا جو کسی نے ''ملٹن براؤن'' کے فرضی نام سے لکھا تھا۔

''ولیم ہیمنگ بک نوبلٹز پرائز ونر ناولسٹ ابھی تک جاپان میں ہیں اس وقت وہ ٹوکیو سے سینڈائی آنے کے لئے ایکسپریس ٹرین میں سوار ہیں۔ سینڈائی میں وہ وہاں کے اتک کلب کے مہمان ہوں گے حسبِ معمول اپنے میزبانوں اکیرا یونو اور ملٹن براؤن کے ہمراہ ہیں۔ ٹرین کے دریچوں سے بارش کی پھواریں ٹکرا رہی ہیں۔

ہمینگ بک:۔ جون اور جولائی کی بارش کے بعد آپ کے یہاں اگست کا مہینہ بھی ہوتا ہے؟۔

یونو:۔ آیئے بشاشت کی باتیں کریں۔

ہیمنگ بک:۔اچھا! جاپان میں فاکنر کی مقبولیت کی کوئی ایک قابل قبول وجہ بتاؤ۔

براؤن:۔ایک وجہ میں بتاتا ہوں جو یونہی سی ہے۔فاکنر مشکل بہت ہے۔

یونو:۔ موصوف مشہور ہیں۔جنس اور قتل کی اُن کے یہاں فراوانی ہے اور مشکل ہیں۔

ہیمنگ:۔مشکل _____ !!

براؤن:۔کیا آپ کو یہ معلوم نہ تھا؟

ہیمنگ بک:۔خداوند! فاکنر کی شرابی تحریر سے تیر کر سونا باہر نکل آتا ہو تو بڑا شکر ادا کرتا ہوں۔کیا جاپانیوں کو اس قسم کی نشہ آور عبارت پسند ہے انگریزی ایسے ہی بہت مشکل سے اُن کی سمجھ میں آتی ہوگی تمہارا مطلب ہے کہ جاپانی طالب علم جو چیز اُن کے پلّے بالکل نہیں پڑسکتی اسے بھی ایڈ مائر کرتے ہیں ____ ؟''

یونو:۔اکثر۔

براؤن:۔اور اکثر اس لئے زیادہ ایڈ مائر کرتے ہیں کہ ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

ہیمنگ بک:۔میں یہ بات نہ سمجھ سکتا ہوں نہ ایڈ مائر کرتا ہوں۔

یونو:۔آہ _____ پراسرار مغرب!

ہیمنگ بک:۔جاپان میں مقبول ترین ناولسٹ کون کون ہیں ____ آج کل؟

یونو:۔فاکنر، ہمینگ وے اسٹین بک اور آپ۔

براؤن:۔ڈوس پیسو۔

یونو:۔ارسکن کاڈویل اور پرل بک۔

براؤن:۔اور آپ کی مقبولیت کی چند معقول وجوہات ہیں چند نامعقول۔

ہیمنگ بک:۔لیکن ہم سب تو مشکل ادیب نہیں ہیں۔ہیمنگ وے اور اسٹین بک اوسط فاکنر کی مانند دقیق نہیں ہیں نہ کمتر ہیمنگ بک کی مانند۔

براؤن:۔''مشکل'' ہونا یہاں مقبولیت کے لئے لازمی نہیں لیکن ایک حد تک فائدہ مند ضرور ہے گو چند طالب علم اور اسکالر چھچھورے بھی ہیں کہ جو چیز آسانی سے سمجھ میں آجائے اسی کو پسند کر لیتے ہیں۔

ہیمنگ بک:۔(بڑبڑاتے ہوئے)مشرق کی طرح مغرب میں بھی۔

یونو:۔آہ پراسرار ___ ایں ___ آپ کا کمتر ہیمنگ بک سے کیا مطلب تھا؟

ہیمنگ بک:۔میری تحریریں جب بہت زیادہ فاکنر کی طرح ہوں تب بے حد معمولی اور جب زیادہ مشکل پسندی پر نہ اتروں تو بہتر ہوتی ہیں۔یہ ایک مشہور نقاد کے الفاظ میں۔

براؤن:۔بالکل صحیح۔

یونو:۔لیکن ہم جاپانی آپ کی ادق تحریروں پر عاشق ہیں خصوصاً FOR WHOM ABSOLOM, FOR WHOM ۔

ہیمنگ بک:۔غضب خدا کا ___ اب ایک راز سنو ___ جب میں یہ راز لوگوں پر منکشف کرنا چاہتا ہوں تو لوگ مانتے ہی نہیں ___ (وہ باہر لینڈ اسکیپ پر برستی ہوئی بارش کو دیکھتے ہیں۔) جاپان میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے اپنی تحریروں کے متعلق راز عیاں کردینے پر آمادہ کئے ڈال رہی ہے؟

براؤن:۔ایک غیر قوم کو اپنی فطرت کی عادتوں کے لئے موردالزام نہ ٹھہرائیے۔ اپنی ماسٹر پیس چیزوں کے متعلق اعترافات کرنے میں آپ کو کب تکلف ہوا ___؟

ہیمنگ بک:۔لیکن اب کے سے تو میں اپنے MINOR PIECE کے متعلق اعتراضات کرنا چاہتا ہوں؟

یونو:۔یاالٰہی ABSOLOM کو آپ مائنر پیس کہتے ہیں تو پھر ماسٹر پیس کون سے ہیں۔؟

ہیمنگ بک:۔ DUST ALSO RISES

FAREWELL TO

GRAPES, OF MICE AND WOMEN

یونو:۔لیکن ہم جاپانی تو محض اسی لئے آپ کی دوسری کتابیں بھی پڑھ لیں گے کہ آپ نے ABSOLOM لکھا ہے۔

براؤن:۔ یہ حضرات آپ کا بہترین ادب اس لئے گوارا کرلیں گے کیوں کہ آپ کے بدترین ادب پر عاشق ہیں۔

یونو:۔آپ کو ABSOLOM کیوں پسند نہیں _____ ؟

ہیمنگ بک:۔ایک تو یہ کہ مجھے کچھ پتہ نہیں اس کا مطلب کیا ہے۔

یونو:۔آپ ہی نے لکھا تھا اسے۔

ہیمنگ بک:۔ میں مانتا ہوں کہ یہ کتاب میری سمجھ سے بالاتر ہے میں نے اسے مذاقاً لکھا تھا لیکن لوگ اس کے متعلق سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے محض یہ دیکھنا چاہا تھا کہ جس طرح کالٹریچر میرے دوست اور دشمن لکھنے میں جٹے ہیں اور اس کی بدولت شہرت اور دولت حاصل کر رہے ہیں ایسا میں بھی لکھ سکتا ہوں یا نہیں۔ چنانچہ میں بھی ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر جو الفاظ دماغ میں آئے لکھتا چلا گیا۔

BESTIAL ABSOLOM BEATING BUSHES

ABOUT DAVID WITH & FOUNTAIN

PAN STOCKINGS IN THE DARK RUNS OF FISH-NETS

SWEN WITH TINY HAIRS, CURLY INTESTINAL FLOPPING.

یہ تو گویا اسٹائل ہو گیا اور جو پرانی ناکارہ ادھوری کہانیاں درازوں میں پڑی تھیں ان میں سے چھان پھٹک کر پلاٹ نکال لیا۔ ABSOLOM تیار تھا۔ میں تم سے کہتا ہوں یہ سب مذاق تھا پیروڈی ہوکس۔

براؤن:۔یعنی نثر کی پیروڈی HOAX A MATER میں۔

یونو:۔اس اطلاع سے جاپان کی ادبی دنیا میں زلزلہ آجائے گا۔

ہیمنگ بک:۔اگر تم لوگوں نے میرا یقین کیا جبھی مغرب میں تو سمجھا جاتا ہے کہ میں تہلکہ خیزی کے لئے سب کہہ رہا ہوں تاکہ کتاب زیادہ بکے (وہاں بالکل نہیں بکتی)

براؤن:۔ یہاں بھی مشکل ہی ہے کہ آپ کی بات مان لی جائے کیوں کہ یہاں کے ریسرچ اسکالرز پر بڑی ایکیٹوٹی ہو جائے گی آدھا درجن کے قریب اسکالرز کو میں جانتا ہوں جو ABSOLOM پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

یونو:۔ آہ ____ پراسرار مغرب ____ جاپانی اسکالرز پر یہ ستم نہ ڈھایئے۔

براؤن:۔ غم نہ کرو۔ اس کتاب میں اگر کوئی معنی ہیں تو یہاں کے اسکالرز ضرور ڈھونڈ نکالیں گے اس سے مصنف کو بھی فائدہ ہوگا۔

یونو: (چہرہ زرد ہوجاتا ہے) مگر وہ تو معنی پہلے ڈھونڈ چکے ہیں۔

ہیمنگ بک:۔ یہ بڑی زیادتی ہے میرے ریسرچ اسکالر مجھ سے زیادہ چارسوبیس نکلے ____ عظیم تر ہوکس ____ کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں ہوکس ہوں ____؟

براؤن:۔ اب تک نہیں ____ دیکھو ٹوکیو کے ایک بڑے بھاری نقاد نے اس مضمون میں تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ مندرجہ ذیل ____ مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں۔

تھیوڈور ریڈیس جان ہے ووڈ مسز افرا بن جیک لنڈن فیودوتیو چیف، پرنسٹن کے طلبائے قدیم کا میگزین کینوسورا یو کی ایڈمنڈ بلنڈن اور وولف ایم فان اٹخن باخ۔

یونو:۔ (میرے سر میں درد ہو رہا ہے) ____ آہ ____ پراسرار مغرب کس کے لئے سنڈائی ____ ABSOLOM کس کے لئے یونو ____

(لڑکی اناؤنسمنٹ لاؤڈ اسپیکر پر، ہم تہذیبی شہر سینڈائی پہنچنے والے ہیں۔)

ہیمنگ بک:۔ یونو کو اسپرین دو۔

براؤن:۔ بیکار ہے بے ہوش ہو چکا ہے غریب۔ آیئے۔ سینڈائی آ گیا۔ اِنک کانفرنس میں آپ کا انتظار ہوگا۔

میں نے اخبار تہہ کر کے اینگلس ولسن کو دے دیا۔

ہم لوگ تین ریوجی مندر کی سمت رواں تھے جہاں کانگریس کا آخری سشن ہونے والا تھا۔

اس جگہ روشومون کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ گائیڈ لڑکا ڈرائیور کی سیٹ کے قریب

کھڑا مائیک میں کہہ رہا تھا ____ ہوئی ہوگی بھئی میں کیا کروں ____ میں نے دل میں کہا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟" اینگس ولسن نے بات جاری رکھی۔

"ہوتا کیا میں نے ناول ختم کر لیا مگر وہ مسئلہ پھر بھی حل نہ کر پائی۔ کیا لکھنے سے حل مل جاتا ہے ____ ؟ پتہ نہیں ____ دراصل ____"

میں اور اینگس ولسن حسبِ معمول ایک اور بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔

"نفرت کا مسئلہ میری تمام تر توجہ کا مرکز ہے۔ میں نے امریکن ناولسٹ جیمز فریل سے بھی ایک مرتبہ اس کے متعلق سوال کیا تھا۔ جاپان آنے سے چند روز قبل میں نے ایک طویل ناول بعنوان "آگ کا دریا" لکھ کر ختم کیا تھا جس میں مَیں نے نفرت کا مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی ہے مگر محض حل تلاش کرنے سے حالات تو نہیں بدل جاتے ____

اب بارش ختم ہو چکی تھی مگر آسمان ابر آلود تھا۔

کتنی خوبصورتی ہے یہاں پر ____ اینگس ولسن نے کہا۔

"ایسے پیارے ملک میں رہنے والے حسن کار تو لامحالہ ہونے چاہئیں مگر ساتھ ساتھ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا"۔ میں نے کہا ____

"اُن لوگوں میں بڑی سادگی ہے۔" اینگس ولسن نے جواب دیا۔

"مگر تمہیں معلوم ہے سادہ طبیعتیں بڑی ظالم ہو سکتی ہیں۔ اُن کے آرٹ میں اُن کی شاعری میں کسی چیز میں گہرائی یا مابعد الطبیعات کا دخل نہیں۔ یہ چین یا ہندوستان کی طرح گمبھیر لوگ نہیں ہیں۔"

"جرمن تو بڑے گمبھیر لوگ ہیں فلسفہ اور موسیقی اور مابعد الطبیعات۔ اور انہوں نے انسانیت کے ساتھ ساتھ کیا کیا ____ شدید طور پر مہذب اور متمدن انسان اتنی ہی شدت سے وحشی بھی ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا ____ اس کی کیا وجہ ہے ____

"میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انسانوں نے ظلم اور آرٹ کو کس طرح

ملایا ہے۔ میں جرمنی میں بھی یہی جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن وہاں کنسنٹریشن کیمپوں کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتاتا ____ یہ کیا اسرار ہے ____"

"مجھے جاپان سے آئے اتنے دن ہو گئے مگر یہ لوگ کھل کر بات کرنا ہی نہیں چاہتے ____" میں نے کہا ____ "یہ عظیم الشان کانگریس میرے لئے بہت ڈراؤنی ثابت ہوئی ہے۔ اس میں مَیں نے نفرت کے بڑے زبردست انڈر کرنٹ محسوس کئے ہیں ____ بہت سے دھارے جو سطح کے نیچے متواتر رواں تھے۔" اینگس ولسن نے کہا ____

"بنیادی مسائل کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا ____ کل میں نے اسرائیل اور لبنان اور مصر کے نمائندوں سے علٰیحدہ علٰیحدہ بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کے بجائے وہ مجھے اپنی کھینچی ہوئی تصویریں دکھانے لگے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"پتہ نہیں"۔ میں نے دوبارہ کہا ____ "انسان کی فطرت کے راز سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کل ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس کانگریس کی مہمانداری کے لئے جس پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوا ہے اس میں امیروں، وزیروں، تجارتی اداروں اور یونیورسٹیوں کے عطیات کے علاوہ اسکولوں کے بچوں کسانوں اور ہسپتالوں میں لیٹے ہوئے مریضوں کا چندہ بھی شامل ہے ____ یہاں ہر انسان واقعی یہ محسوس کر کے خوش ہو رہا ہے کہ دنیا کے ادیب اس کے ملک میں جمع ہوئے ہیں ____ اسے ایک انتہائی اکتا دینے والا نعرہ سمجھا جاتا ہے مگر یہ واقعہ کہ دنیا کے عوام امن چاہتے ہیں۔"

"یہ ہمارا سب سے بڑا ڈپارٹمنٹ اسٹور ہے ____" ڈاؤن ٹاؤن کیوٹو میں سے گزرتے ہوئے گائیڈ نے فخریہ اطلاع دی ____ "نہ جانے یہ لوگ اپنے ڈپارٹمنٹ اسٹورز دکھانے پر اس قدر مصر کیوں ہیں ____؟" اینگس ولسن نے اُداسی سے کہا ____

"غالباً اس لئے کہ اس وقت ہمیں مندروں سے زیادہ بجلی کے کارخانوں اور ڈپارٹمنٹ اسٹورز کی ضرورت ہے۔ آپ ایشیا کو اب تک ٹورسٹ رویے سے دیکھنا چاہ

رہے ہیں۔''مَیں نے کہا۔

''یہ ٹورسٹ رویہ نہیں۔'' اینگس ولسن نے جواب دیا۔'' مگر قسمیہ یہاں گھر گھر ٹیلی ویژن دیکھ کر مجھے بے انتہا کوفت ہوئی کہ یہاں بھی روحانی بے اطمینانی اور ذہنی تنہائی کا وہی عالم ہوجائے گا جو ہمارے مغرب میں ہے۔''

''جی! لہٰذا ہم لوگوں کو موم بتیوں کی روشنی میں بانسریاں بجانی چاہئیں ____ آخر ہمیں اس پرانی رومینٹک دنیا کو تباہ کرنے کا کیا حق ہے۔ !! باقی یہ کہ SUBSIDISED انٹلیجوئیلز۔''

''ٹھیک ۔ بہت اچھی ترکیب استعمال کی تم نے۔'' انہوں نے میری بات کاٹی۔ مگر بتاؤ'' آج کل انٹلکچوئیلز کو ایک حد تک SUBSIDISED ہوئے بغیر کام چل سکتا ہے؟''

''میں پچیسویں بار آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آج کے برطانوی ادیب کا مقصد کیا ہے ____ احساسِ جرم ____ ؟ یہ پچھتاوا کہ آپ نے ٹیلی ویژن جاپان میں متعارف کر کے یہاں کا روحانی سکون تباہ کردیا؟ اس کا پرائیسچت کہ آپ نے اسپین کی خانہ جنگی میں حصہ لیا؟ مغربی یوروپ کی مسیحی تہذیب اور بازنطین کی روایات کی تجدید؟ کیتھولک عقیدہ؟ ہیومنزم؟ ہیومنزم آج کی دنیا کے CONTEXT میں سخت بوگس لفظ ہے ____ لہٰذا جنابِ والا آپ اس سوال کا آج قطعی طور پر اطمینان بخش جواب عنایت فرمایئے اس لئے کہ آپ پوسٹ دار انگلستان کے ان دو یا تین نئے ادیبوں میں سے ہیں جن کو میں اہم سمجھتی ہوں۔ گرہم گرین کو مذہب ہی سے فرصت نہیں۔ ڈیلن طامس مر گئے مسز اسپنڈر کو ان کے جہاد نے کہیں کا نہ رکھا ____ آخر جہاد کاہے کے لئے کیا جا رہا ہے ۔کمیونزم سے ایشیا کو بچانا چاہتے ہیں ____ آپ ایشیائی ادیبوں کو اپنے مسائل سے آپ ہی نپٹنے دیجئے ____ ادب میں آزادی کے قائل ہیں ____ ؟ برطانیہ آزادی کا ہمیشہ سے زبردست علمبردار رہا ہے مگر ایک امریکن رسالہ انگلستان سے چھپتا ہے تو اس پر اصرار کیا جاتا ہے کہ اسے انگریزی رسالہ سمجھو ____ میں یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں آپ آزادیِ افکار کے حامی کس حد تک

SUBSIDISED ہونا پسند کریں گے۔"

اب بادل بہت نیچے جھک آئے تھے ہم پیچ دار راستوں سے نکلتے مندر کے باغات میں داخل ہوئے جن کو سرسبز پہاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔چاروں اور بالکل آسام کے ایسے مناظر بکھرے ہوئے تھے۔فرنچ اور جاپانی ادیب اُٹھ کر پیچھے چلے گئے۔

"جاپانی"۔اینگس ولسن نے اصل موضوع پر پلٹتے ہوئے کہا۔"فرانس کو اپنا کلچرل اور ذہنی گرو مانتے ہیں حالانکہ فرانس آج کی دنیا میں بے انتہا غیر حقیقت پسندی کا ثبوت دے رہا ہے۔"

ہم مندر کے نزدیک پہنچ گئے باغ کی سیڑھیوں پر کیوٹو کے باشندوں کا ہجوم کیمرے کے لئے منتظر تھا۔اس ملک کے ہر ذی ہوش کے ہاتھ میں ایک کیمرہ ہوتا ہے۔ مندر کے برابر میں ایک اور باغ تھا۔ہم میں سے چند لوگ ٹہلتے ہوئے اس کے پھاٹک کے اندر چلے گئے۔

"جاپانی خانقاہ کے باغ میں۔یہ تو کسی سمفنی کا نام ہوسکتا ہے____" میں نے کہا۔پلٹ کر دیکھا تو اسپنڈر واقعی دیواروں کے نیچے فکر شعر میں مبتلا ٹہل رہے تھے۔ دوسری طرف ڈونلڈ کین ایک پتھر پر بیٹھا جاپانی میں نظم لکھنے میں جٹا تھا۔

اسپنڈر نے لکھا۔

GRAY TEMPLE IN GREEN MOSE
NATURE PURE YET DESIGNED,
THE WELL UNDER THE ROCK,
SPRING RENEWING THE MIND.

اب دُھوپ نکل آئی ہے۔تین ریو۔جی مندر سے چند گز کے فاصلے پر فر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں کھڑی ہیں مندر کے عقب میں پہاڑیوں کے کنارے کنارے تو ّے ایکڑ پر پھیلی ہوئی جھیل کنول کے پھولوں سے پٹی پڑی ہے صاف شفاف لکڑی کا بنا ہوا یہ مَندر دھوپ میں جگر جگر کر رہا ہے اس کے باغات کی صناعی زین فلسفے کی سمبل ہے پہاڑی کے دامن میں درختوں اور پھولوں میں چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے

معبد خوبصورت چوبی کوریڈورز کے ذریعے بڑے مندر سے ملحق ہیں اس کے فرش آئینے کی طرح شفاف ہیں درختوں اور پھولوں اور جھیل کی لہروں کے رنگوں نے منظر کے حسن کو خالص لرزہ خیز بنادیا ہے باغ کی مصنوعی چٹانیں اور جھرنے سونگ عہد کی چینی پینٹنگز کی یاددلاتے ہیں۔ سونگ عہد کے زین مذہب کی بنیاد پر مندر ایک جاپانی وار لارڈ کے حکم سے ۱۳۳۹ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مندر کے برآمدے کی دیواریں تیرہویں اور چودہویں صدی کے چینی پروہتوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطاطی کے نمونوں اور پرانے شہنشاہوں کی تصویروں سے مزین ہیں۔ کچھ لوگ برآمدے کے باہر لکڑی کے جنگلے پر ٹک گئے ہیں کچھ پہاڑیوں کے دامن میں گھوم رہے ہیں چاروں طرف ٹیلی ویژن کیمرے چل رہے ہیں۔

اب کانگریس کا آخری سشن شروع ہو چکا ہے سب لوگ بڑے ہال میں فرش پر بیٹھ گئے ہیں۔ پہلو میں برآمدے کے باہر پہاڑیاں اور جھیل ایک عظیم الشان پینٹنگ کی طرح نظر آرہی ہیں۔

اینگس ولسن مائیک پر جا کر کہہ رہے ہیں ___

یہ بڑی امپریشنسٹک دنیا ہے۔ منظر بدلتے ہیں۔ ایک ایک درخت ایک بادل کی جھلک دکھلائی دیتا ہے پھر دفعتاً منظر بدل جاتا ہے ماحول کے ماورائی رنگ تبدیل ہوجاتے ہین کیوٹو سے یہاں آتے ہوئے مسٹر اسپنڈر اور مسٹر موراویا نے کہا کہ یہ جگہ سوئٹزرلینڈ کی ایسی ہے۔ مس حیدر نے کہا ان مناظر میں آسام کی جھلک ہے مگر ان باغوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ جاپان اور صرف جاپان ہے اس کانفرنس میں بڑی اونچی اونچی باتیں طے کی گئی ہیں مجھے اب صرف اتنا کہنا ہے کہ حس مزاح ایک قوم کی ذہنی اور جذباتی پختگی کی سب سے بڑی علامت ہے کل شام جب ہم چاء کی رسم کے لئے جا رہے تھے اس وقت بڑے بڑے بین الاقوامی شہرت کے لوگ پانی میں بھیگتے عجب مسخرے لگے۔ ایک بے حد مشہور شخصیت کو میں نے عجب کومک حالت میں افتاں و خیزاں ولا کی طرف بڑھتے دیکھا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کی توقیر اور عزت کو قائم رکھنے کے لئے میں نے اپنی ہنسی روکی اور آگے بڑھ گئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ مجھ پر

ہنس رہا تھا۔ میری توقیر برقرار رکھنے کی خاطر اپنی بے تحاشا ہنسی چھپانے کی کوشش کرتا کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔

''یہ اپنے اوپر اور دوسروں کے اوپر ہنس لینا بہت بڑا وصف ہے حالات میں مضحکہ کی صورت پہچان کر اس سے محظوظ ہونے، اپنا مذاق آپ اُڑانے اور اپنا مذاق اُڑائے جانے پر برا نہ ماننے کی اہلیت سب سے بڑی نعمت ہے''۔ مندر کے بڑے ہال میں بھکشوؤں کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا کھانے کے بعد ہم نے بسوں میں لد پھند کر شاہی محلات کا رُخ کیا۔

جاپانی ذہن میں اختراع کا مادہ بہت ہی کم ہے یہاں کی ہر چیز چین اور ہندوستان کی تقلید میں بنائی گئی۔ کیوٹو کا لے آؤٹ بالکل چینی شہروں کا ایسا ہے جن لوگوں نے بیکنگ کے شاہی محلات دیکھے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ کیوٹو کے یہ امپریل مکانات اُن کے پاسنگ بھی نہیں۔ یہاں کے شہنشاہ بھی کس قدر سادگی سے رہتے تھے۔ ساری شاہی عمارتیں لکڑی کی ہیں کارونیشن ہال کے دروں پر چقیں پڑی ہیں معمولی سا ایک ایوان جسے دیوانِ خاص یا دیوانِ عام جو چاہئے کہہ لیجئے اس کی ساری آرائش چینی فلسفیوں کی قد آدم تصویروں پر مشتمل ہے جو دیوار منقش ہیں بادشاہ سلامت کے معمولی سے تخت کے دونوں طرف دو شیر بنے ہیں جن کو یہاں چینی کتے کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ جاپانیوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ شیر کس جانور کا نام ہے شیروں کے یہ مجسمے بھی چین سے آئے تھے۔ محلات کی ان گنت ڈیوڑھیاں، صحن اور چہار دیواری ہمیں بے حد مانوس معلوم ہوئی ہم واقعی مشرق میں ہیں۔

کیوٹو میں مہاتما بدھ کے چودہ سو مندر اور باغ ـــــ جاپان کے لینڈ اسکیپ باغات کی خوبصورتی کو آسانی سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کستورا محل ہے۔ سولہویں صدی کے شہزادے ٹوشی ہی ٹو کی ولا جس کے خوبصورت باغ کے وسط میں بہت بڑی جھیل جس کے چاروں اور پہاڑی راستے ہیں۔ پہاڑیوں پر پائن کے درختوں میں ٹی ہاؤس چھپے ہیں جہاں یہ شہزادگان عالی مرتب سر پر چٹیاں رکھائے دوزانو بیٹھے وہ کڑوا جوشاندہ پی پی کر خوش ہوتے ہوں گے پگڈنڈیوں

کے کنارے پتھر کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت لالٹینیں نصب ہیں جو جاپان کی خاص چیز ہے چھوٹی چھوٹی مصنوعی ندیوں پر پل بنے ہیں معطر کنجوں میں آبشار گر رہے ہیں کیمرہ مین کی پوری پلٹن حسبِ معمول ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے (ہم سے مراد ہم تین ساری پوش خواتین ہیں) اب تک ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کانگریس کی مندوبین مغربی خواتین کو ہماری پبلسٹی مطلق پسند نہیں آئی مگر دراصل ہماری وجہ سے نہیں ہماری ساریوں کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ تھا اس میں ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم تینوں نے ساریوں کے بجائے خدانخواستہ فراک پہنے ہوتے تو ہرگز اتنا نوٹس نہ لیا جاتا۔ اس تصویروں ہی کے سلسلے میں ہم تینوں مرتے مرتے بچے۔

کستورا محل کے باغات کا چکر لگاتے ہوئے ہم جھیل کے ایک بہت اونچے پُل پر چڑھے جو دو چھوٹی پہاڑیوں کو ایک دوسری سے ملاتا تھا بغیر جنگلے کا یہ پل اتنا تنگ تھا کہ بمشکل دو آدمی اس پر سے ساتھ ساتھ گزر سکتے تھے۔ بہت احتیاط سے قدم رکھتے باتوں میں مصروف میں اور مادام وادیا آگے آگے جا رہے تھے۔ کملا چند حضرات کے ساتھ ذرا پیچھے تھیں یک لخت دائیں طرف ہماری نظر پڑی اور نیچے پانی کے کنارے کوئی پچیس کیمرہ مین اور فوٹو گرافر اپنے کیمروں کا رُخ ہماری طرف کئے ڈٹے ہوئے تھے۔ ''ذرا رُکئے گا۔'' انہوں نے چلاّ کر کہا۔ شکریہ۔ ہم لوگوں نے دوسرا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اسی لمحے دوسری طرف سے آواز آئی۔ صرف ایک منٹ۔ ہم نے چونک کر ادھر دیکھا پُل کے بائیں طرف جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک اور پلٹن اسی طرح مستعد کھڑی تھی (یہ لوگ غالباً مخالف ٹیلی ویژن اور اخباروں کے نمائندے تھے) آواز پر چونک کر دوسری طرف مڑنے میں ہم تینوں گرنے سے بال بال بچے ورنہ غڑاپ سے جاتے نیچے جھیل میں سارا آرٹ وارٹ کلچر ولچر دھرا رہ جاتا۔

شام کو بہت امیر کبیر آدمی کے گھر میں ضیافت ہے جو کیوٹو کا بہت بڑا ٹائیکون ہے بہت ساری چہاردیواریوں اور ڈیوڑھیوں کو طے کرنے کے بعد ہم ایک اور وسیع لینڈ اسکیپ گارڈن میں پہنچے ہیں جو ہمارے میزبان کے گھر کا پائیں باغ ہے پھاٹک پر گیشا لڑکیاں استقبال کے لئے موجود ہیں گھر کی بیبیاں مکان کے اندر

ہیں (جاپان میں الٹرا موڈرن اور فیوڈل تہذیبوں کا یہ امتزاج عجیب وغریب ہے۔)

گھر کے اندر جا کر میں نے اور مادام وادیا نے کڑوا جوشاندہ پیا۔ پھر باہر آ کر ٹہلنا شروع کیا۔ سارا باغ گھوم ڈالا۔ نیم تاریک راستے جھیل کے کنارے خوبصورت پویلین سارے پویلین چھان مارے مگر کھانے کے لئے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دفعتاً میں نے مادام وادیا سے کہا۔ "بڑا سناٹا ہے سب لوگ کہاں غائب ہو گئے؟"

"اتنا بڑا باغ ہے۔ اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"چلو اس طرف چلیں شاید کچھ ٹھکانے کی چیز کھانے کو مل جائے پُل عبور کر کے ہم اُس پویلین پر پہنچے جہاں بہت بڑا مجمع تھا مگر وہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ قریب ہی کشتیاں بندھی تھیں۔ چاند بہت نیچے جھک آیا تھا۔"

"کتنا دلفریب منظر ہے۔" کسی نے کہا ___

"بے حد۔ مگر مجھے سخت بھوک لگی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "یہاں کیا چیزیں ہیں کھانے کی۔"

مگر وہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ لوگ باگ غیر معمولی طور پر خوش نظر آ رہے تھے بھائی اسٹیون اسپنڈر تک کی شکل پر شگفتگی برس رہی تھی۔ ایک تخت پر کاک ٹیل ڈریس میں ملبوس بے حد خوبصورت جاپانی لڑکیوں کا ایک پرا بیٹھا تھا۔ دوسرا پرا مجمع میں رل مل کر مہمانوں سے مصروف گفتگو تھا۔ دفعتاً ہم نے محسوس کیا کہ یہ گفتگو ذرا زیادہ بے تکلف قسم کی تھی جو عام طور پر پارٹیوں میں نہیں کی جاتی۔ ذرا آگے جو بڑھے تو دیکھا بڑا ابڑا بین الاقوامی شہرت کا مغربی دانشور اس وقت تخت پر راجہ اندر بنا بیٹھا ہے اور گیشا لڑکیاں اسے پنکھیاں جھل رہی ہیں۔

مادام وادیا نے چپکے سے مجھ سے کہا۔ "یہاں سے چلو۔ یہاں ہم لوگوں کا کوئی کام نہیں۔" ہم لوگ سارا فاصلہ عبور کر کے پھر جھیل کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ درختوں کے نیچے پھل اور کافی کے اسٹال تھے اور سناٹا ____ صرف ایک درخت کے نیچے بوڑھے جمبوناتھن اکیلے بیٹھے ناشپاتی کھا رہے تھے۔

"آپ لوگ کچھ کھا پی آئیں؟"

''جی نہیں ہم آپ کے ساتھ یہیں بیٹھیں گے۔'' ہم نے جواب دیا اور صبر کر کے چند پھل کھائے پانی کا گلاس پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

''کملا کو ڈھونڈیے جانے غریب کہاں بور ہو رہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ لہٰذا بے چارے شری جمونا تھن کو اندھیرے میں اکیلا بیٹھے چھوڑ کر ہم نے کملا کی تلاش شروع کی اس وقت ہمیں پُلوں اور پگڈنڈیوں پر جھیل کے کنارے درختوں کے کنجوں میں مصنوعی پہاڑیوں کے نیچے بہت سے جانے پہچانے حضرات نظر آئے جو کاک ٹیل لباس والی لڑکیوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ کملا کو ڈھونڈ لینے کے بعد ہم ابھی یہی طے کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے اتنے میں کانگریس کی سکریٹری ہمیں تلاش کرتی ہوئی مل گئیں۔ باغ کے ایک حصے میں پرانا مندر تھا۔ اس میں اس پارٹی میں آئے ہوئے چند مہمانوں کو ٹیلی وائز کرنا تھا۔ وہاں سے بھی چند منٹ بعد فراغت ہوگئی۔ اب پھر بوریت شروع ہوئی کیوں کہ بھوک کے مارے الگ حالت خراب۔ اسٹالز پر یہ گائے کا گوشت تھا یا پورک یا کچی مچھلی یا شراب ہم تینوں دقیانوسی اولڈ فیشن مذہبی پابند صوم وصلوٰۃ بیبیاں کریں تو کیا کریں۔ پھل کھانے سے کہیں بھوک بھرتی ہے۔

جھیل کے کنارے والی اسٹال پر حسبِ معمول ہجوم تھا۔ ''یہ لوگ مسرّت کی تلاش میں جُٹے ہیں ہم کلچر کی۔ آیئے اس میوزک پویلین ہی کو ایڈ مائر کریں۔ لگے ہاتھوں میں نے منہ لٹکا کر تجویز کیا۔ وہاں ملک کی بڑی مشہور رقاصہ مادام یا چیوانا اپنے حساب سے ناچ رہی تھی۔ یہ انو ڈانس کہلاتا ہے۔ بتایا کہ موسیقی چین، ہندوستان، منچوریا اور کوریا سے یہاں پہنچی (خدا نہ کرے جو یہ موسیقی ہندوستان سے یہاں پہنچی ہو۔ ہندوستان غریب کو کیوں بدنام کر رکھا ہے خواہ مخواہ۔)''

''ڈانس بھی دیکھ لیا۔ اب کیا کریں۔'' ہم نے کہا۔ پھر میوزک پویلین کی سیڑھیوں سے اُتر کر گھاس کی ڈھال پر آن بیٹھے۔ ہمارے وہاں بیٹھنے کے چند لمحوں بعد دفعتاً ایک درخت میں چھپی ہوئی آرک لائٹ کا رُخ ہماری طرف کر دیا گیا۔

''اب بتایئے اگر یہ میم لوگ کہتی ہیں ہم تینوں کی حد سے زیادہ پبلسٹی کی جا رہی ہے تو کیا غلط ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلیئے یہاں سے بھی اُٹھیں۔''

ہم وہاں سے اُٹھ کر ایک درخت کے نیچے نسبتاً تاریکی میں جا بیٹھے۔ سامنے کچھ فاصلے پر نشیب میں اسٹال تھی جہاں مہمانوں کا مجمع تھا۔ خوب شور مچ رہا تھا۔ پانی پر سے گٹار کی آواز آ رہی تھی۔ بارہ دری میں رقصاں لڑکیوں کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔

"بے شمار لاشیں اب پانی میں تیر رہی تھیں۔ گیند کی طرح پھولی ہوئی اور سفید۔ بڑی عجیب بات کہ مردوں کی لاشیں منہ کے بل تیر رہی تھیں اور عورتوں کے چہرے اوپر تھے۔ عرصہ ہوا میں نے ہیملٹ میں مری ہوئی اوفیلیا کو اس طرح تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کس قدر صحیح تھا۔

پویلین میں گٹار زور زور سے بجنا شروع ہو گیا جس وقت بجلی کا کوندا لپکا دفعتاً گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا۔ میرے چہرے کی کھال جدا ہونے لگی اور دھجیاں بن کر چہرے سے لٹک گئی سامنے ہسپتال تھا۔ یک لخت اس کی ہر کھڑکی سے سفید دھواں باہر نکلنا شروع ہوا اور دوسری اور تیسری منزلوں سے مریض اور سفید پوش نرسیں کود کود کر دھوئیں میں گرنے لگیں وہ سب سے نیچے سیمنٹ کی سڑک پر گرتے ہی ختم ہو گئے ہوں گے ہم سب نے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا اور دریا تک پہنچے۔ وہاں سینکڑوں زخمی اور جلے ہوئے آدمی پانی میں اپنے چیتھڑے بھگونے کی کوشش کر رہے تھے ایک شخص پانی پانی چلاّ رہا تھا اس کا چہرہ جل کر سیاہ کوئلہ ہو چکا تھا صرف دانتوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔

جھیل کے کنارے ایک برطانوی ادیب گلاس اُٹھا کر امریکن ادیب کے گلاس سے ٹکرا رہا تھا۔ باغ کا منظر کسی تصویر کے مانند مکمل تھا جس وقت بجلی کا سا کوندا لپکا میں باورچی خانے میں کھڑی برتن دھو رہی تھی میری بہن کالج گئی ہوئی تھی۔ جب دوسرے لمحے مکان کے پرخچے اُڑنے سے آگ لگی یہ سب ایسا معلوم ہوا جیسے کسی خاموش فلم میں ہو رہا ہے میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آئی میں سماعت سے مکمل طور پر محروم ہو چکی تھی اگلے سال جب ہم نے اس کالج کے کھنڈر میں میموریل سروس منعقد کی تو ہمیں ملبے میں صرف چاکلیٹ کا ڈبہ ملا جس پر میری بہن کا نام لکھا تھا۔ جس میں وہ لنچ لے جایا کرتی تھی۔ اس کالج میں تین سو لڑکیاں تھیں سب کی سب اسی لمحے ختم ہو گئیں متعدد نرسنگ اسکولوں ہائی اسکولوں اور میڈیکل اسکولوں کا ایسا صفایا ہوا کہ اُن کا ایک طالب علم زندہ نہیں بچا۔ سب آنِ واحد میں ختم

ہو گئے ____ "

چاند پائن کے درختوں پر تیر رہا تھا۔ پتوں میں چھپے ہوئے لاؤڈ اسپیکرز میں سے مدھم موسیقی نشر ہونے لگی۔ سانحہ کے دوسرے روز ہمارے ہسپتال کے آنگن میں ایک اندھا گھوڑا بھٹکتا ہوا آنکلا۔ اس کا چہرہ جل چکا تھا اور آنکھیں پگھل گئی تھیں وہ آنگن میں چکر کاٹتا رہا اور سامنے کی دیوار سے جا ٹکراتا۔ دریچوں میں سے ہم اسے دیکھ کر اپنی تکالیف بھول کر اس کے لئے بہت دُکھی ہوئے گویا وہ گھوڑا اور ہم ایک دوسرے کے غمگسار تھے۔

"کتوں کی حالت کتنی تکلیف دہ تھی وہ RADIATION SICKNESS کے شکار ہو چکے تھے۔

موسیقی رات کی ہوا میں پھیلنے لگی۔

میں نے بوڑھی عورتیں دیکھیں جن کے چہروں کی چمکدار نیلی رنگت تھی اور اُن کے چہروں بھوؤں سے لے کر ہونٹوں تک درمیان سے آدھے پھٹ گئے تھے۔ نو جوان عورتیں جن کے بازو ان کے جسموں سے علیحدہ ہو کر لٹک رہے تھے۔ ایک موٹا فوجی کرنل جو پاگل ہو گیا تھا اور اسے ایک بچہ گاڑی میں ٹھونس کر کہیں لے جا رہا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر پر کسی نے ایک جذباتی فرنچ گیت شروع کر دیا "پیرس کے پُلوں کے نیچے تمہارے ہمراہ۔"

"دریا کے اوپر سے شعلے بھڑکتے ہوئے اُڑتے رہے۔ جب پائن کے درختوں میں آگ لگ جاتی تو کنارے پر پڑے ہوئے زخمیوں کی فلک شگاف چیخیں بلند ہوتیں میں اور میرے والد کسی نہ کسی طرح شعلوں سے بچتے پانی میں پہنچ گئے برابر میں کچلے ہوئے لوگ مرے پڑے تھے۔ طرح طرح کی چیزیں پانی میں بہتی ہوئی آ رہی تھیں۔ گھاٹ پر کسی نے کہا تھا کہ پیاز کھانے سے طاقت آتی ہے پانی میں گلی سڑی پیاز نما چیز بہتی آ رہی تھی میں نے وہ اُٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ دفعتاً آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے۔ ایک بے حد خوفناک جھکڑ اُٹھا اور سیاہ تیل کی مانند بارش برسنا شروع ہو گئی۔ دریا میں طوفان سا آیا اور پائن کے درخت جڑ سے اُکھڑ کر آسمان پر اُڑتے چلے گئے جب طوفان اور بارش کا قہر ختم ہوا تو میں نے دیکھا جتنے لوگ آگ سے پناہ لینے کے لئے گھاٹ پر بیٹھے تھے وہ سب غائب ہو چکے تھے موجیں اور آندھی

اُن کو اپنے ساتھ بہا لے گئی۔

رنگ برنگے فراک پہنے لڑکیوں کا ایک گروہ پل پر سے گزر رہا تھا اُن کے ساتھ تین چار حضرات بھی تھے۔ وہ سب قہقہے لگا رہے تھے۔ مرد سارے یورپین اور امریکن تھے وہ سب گیت میں شامل ہو گئے تھے۔

"میں حسب معمول لیبر سروس کے لئے ڈیوٹی پر گئی ہوئی تھی جب دفعتاً بجلی کوندی اور بڑی سخت بدبو سارے میں پھیل گئی جب مجھے ہوش آیا تو میں ملبے میں دبی ہوئی تھی۔ میرے ساتھی چاروں طرف دبے ہوئے چلا رہے تھے ____ اماں ____ ابا ____ خداوندا ____ ایک چھوٹی بچی جو عفریت معلوم ہو رہی تھی مجھے دیکھ کر چیخی ____ میں میاکے ہوں مس مورائے ____ میں میاں کے ہوں ____ مجھے بچایئے ____ مس مورائے میں نے اسے کھینچنا چاہا لیکن وہ میرے ہاتھوں سے پھسل گئی وہ چیختی رہ گئی ____ مس مورائے ____ مس مورائے ____ مجھے یقین ہے کہ وہ خوب صورت لڑکی مس میاکے جس کا عفریت میں بچا نہ سکی وہیں ختم ہو گئی ہو گی ہم لوگ بمشکل آلو کے کھیت تک پہنچ سکے۔ ہوا میں آگ کے شعلے اُڑتے ہوئے آتے اور ہمارے بال جل جاتے ہم سب نے بارہ مربع فیٹ کی پانی کی ٹنکی میں گھسنا چاہا جو کھیت کے وسط میں تھی۔ چند لمحوں میں ہمارے خون کی وجہ سے پانی سرخ ہو گیا۔ فوراً لوگوں نے اُسی میں اُلٹیاں کرنی شروع کر دی پانی کی تہہ میں سے غلیظ کیڑے اُبھر کر اوپر آ گئے اور ہمارے جسموں پر رینگنے لگے پیاس سے بے تاب ہو کر ہم نے وہی غلیظ پانی جس میں ہمارا خون اور کیڑے اور قے شامل تھے بے تحاشا پینا شروع کر دیا آسمان انگارے کی طرح سرخ تھا اور ہر شے آگ کی ایسی جل رہی تھی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ دن ہے یا رات ____ میں پوری طاقت سے اپنا نام چلائی ____ اور پھر بے ہوش رقاصہ نے ہاتھ میں گھنگھرو اُٹھا کر تیزی سے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ بے سُری بانسریوں کا شور اونچا ہو گیا۔ پس منظر میں ڈھولکی یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔ میوزک پویلین کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے کسی نے ایک طویل جمائی لی۔"

"میں اپنی بہن کی تلاش میں سڑکوں پر دیوانہ وار بھاگی بھاگی پھر رہی تھی۔ جب ایک سڑک پر میں نے بہت سی کھپریلیں ایک قطار میں رکھی دیکھیں ہر کھپریل پر ایک انسانی

ہڈی دھری تھی۔ چند پر سے ہڈیاں غائب تھیں۔ غالباً لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی ہڈیاں سمجھ کر اُٹھا لے گئے تھے۔ چند ہڈیاں ابھی تک اس قدر گرم تھیں کہ اُن میں سے بھاپ نکل رہی تھی سارے میں نا قابلِ برداشت بدبو پھیلی تھی۔"

"قریب ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے فادر ایکس نے جھک کر چند خوشبودار پھول توڑے اور میری دوست یوکو مارا کو پیش کئے۔ اس وقت آسمان پر ایک بے انتہا خوبصورت روشنی پھیلی اس کے بعد گرد کا طوفان اُٹھا اور سب اس میں اُڑ گئے۔ اس سے درد یا تکلیف کے بجائے بڑا سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب قسم کی ہمت سی ہم میں آ گئی اور ہم نے قومی اور فوجی گیت بھی گانے شروع کر دیئے۔ لیکن اس کے بعد ہماری کھال جھڑنے لگی اور تکلیف سے بیتاب ہو کر چوہوں کی طرح چکر لگانے اور کودنے لگے پھر رفتہ رفتہ ہم نے اندھا ہونا شروع کیا۔ مجھے اور میرے ہم جماعتوں کو ایک ٹرک میں بھر کر اوجینا بھیج دیا گیا جہاں ہسپتال میں پڑے پڑے ہم چیخا کرتے۔ خدا کے لئے مجھے مار دو کسی نے میری ماں کو بتا دیا تھا کہ ککڑی کی پھانک زخموں پر ملنے سے فائدہ ہو گا لہٰذا وہ بے چاری ککڑیوں کی ٹوکری اُٹھائے سارے میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ بارہ دن کے بعد اس نے مجھے تلاش کر لیا۔ میرے ساتھ کے طالب علم اس وقت تک ایک ایک کر کے مر چکے تھے۔ لیکن میں زندہ رہا۔ گو میرے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے اور میں تڑپ تڑپ کر مرنے کی دُعائیں مانگتا تھا۔ اب میں یونیورسٹی میں اکنومکس پڑھ رہا ہوں۔ لیکن میری اصل زندگی تو چھ اگست کو ختم ہو چکی۔

اب مجھے محض یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک مہیب سائے کے نیچے زندہ ہوں اور روز بروز وہ سایہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر ٹراموں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو جن کے چہرے بگڑ چکے ہیں دوسرے لوگ گھورتے ہیں تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے کیوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں۔ دنیا کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ جنگ کی ایٹم بم کی تباہ کاری کے کیا معنی ہیں۔ میرا وجود اب محض ایک پرچھائیں کی حیثیت میں باقی ہے اکثر سوچتا ہوں کہ اگر دُنیا کی بڑی طاقتوں نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ آئندہ یہ قہر نہ برسائیں گے تو میری یہ دوسری سائے کی ایسی زندگی سکون سے ختم ہو سکے گی کیوں کہ مجھے اب موت کا واقعتاً کوئی خوف نہیں ہے۔

ہوا درختوں سے معلق قندیلوں کو جھلکورے دیتی رہی۔ اب باغ کو نیند سی آ چکی تھی۔

''جب میں خود بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی میں نے چار اسکول کے لڑکوں کو دیکھا جو سڑک کے کنارے گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ چاروں بُری طرح جل چکے تھے۔'' اُن میں سے ایک نے کہا ____

'' ____ خاتون ____ شاید میری ماں اور بہن بھی اسی طرف سے ہیں۔ اگر آپ کو وہ ملیں تو اُن سے کہئے کہ فوراً آئیں کیوں کہ ہم چند منٹ میں دم توڑنے والے ہیں۔''

''ہم چاروں اکٹھے مریں گے۔'' دوسرے نے کہا'' ہمارے اوپر تھوڑا سا سایہ کر دیجئے بڑی سخت گرمی ہے۔''

میں نے چند لکڑیاں اور کاٹھ کباڑ اُن کے چاروں اور کھڑا کر دیا اور اُن سے پوچھا کہ اُن کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ''نہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ہم تو مرنے والے ہیں ہمیں کاہے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ میرے پاس دو ٹماٹر تھے۔

میں نے اُن کے چار ٹکڑے کر کے اُن کے حلق میں تھوڑا تھوڑا سا عرق نچوڑا اور اُن سے پوچھا ____ کیسا لگا ____ بے حد مزیدار ____ شکریہ انہوں نے کہا۔ ایک بچے نے کہا۔'' اگر ذرا سا پانی مل جاتا ____ '' میں نے اُن کو پانی پلایا اور دُعا مانگی کہ کوئی امدادی پارٹی اِدھر آ نکلے۔

دُوسرے روز صبح جب میں اپنے شوہر کو لے کر وہاں پہنچی تو میں نے چاروں کو اسی طرح سر جھکائے گھیرے میں بیٹھے پایا۔ چاروں کب کے ختم ہو چکے تھے۔''

اب باغ پر رفتہ رفتہ سناٹا اُتر رہا تھا۔ پھول سو چکے تھے۔ پانی پر برتی ہوئی موسیقی اونگھ رہی تھی مہمانوں کے قہقہے مدّھم ہو چکے تھے۔ شراب کا اثر تیز ہو رہا تھا۔ گیشا لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں میں اور مادام وادیا گھاس کی ڈھلوان پر بیٹھے رہے۔ ہم دونوں ایک گھنٹے سے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اب خنکی بڑھتی جا رہی ہے۔ دفعتاً بوڈ ویوزے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''ہلو''۔

میں نے سر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ کامریڈ بوڈوویزے ہاتھ میں گلاس لئے کھڑے تھے۔ ''بے حد اورنٹیل پارٹی ہے ــــ ایسی اورینٹل ــــ'' ''اورینٹل نہیں ــــ فیوڈل ــــ'' میں نے جواب دیا۔'' پچاس سال پہلے ہمارے یہاں بھی طوائفیں امراء کی دعوتوں میں مہمانوں کو گا بجا کر اور باتیں کر کے محظوظ کرتی تھیں لیکن پچاس سال پہلے ــــ'' میں نے اُنگلی ہوا میں لہرائی۔'' یہ اورینٹل تہذیب نہیں ہے۔''

''فیوڈل ــــ فیوڈل ــــ'' ہٹاؤ اب کون بحث کرے۔ میں نے مزید اُکتا کر سوچا۔ وہ گلاس لئے لئے پھر ڈھال سے اُتر کر اسٹال کی سمت لوٹ گئے۔

کچھ دیر بعد یہ سب لوگ یہاں سے چلے جائیں گے مکمل خاموشی اور مکمل تنہائی یہاں چھا جائے گی۔ رات کو اس باغ میں کیا ہوگا۔

دُنیا بھر کے باغوں میں جب سب چلے جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے کیسا سناٹا چھا جاتا ہے جھیل کشتیاں، پھول، مندر، سامنے کچھ فاصلے پر پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر مندر میں روشنی جل رہی ہے۔ یہاں ہَون ہوتا ہے تانترک منتر دُہرائے جاتے ہیں۔

باغوں اور پہاڑوں کے اسرار ــــ چلو ہم لوگ ہوٹل واپس چلیں۔ یہاں تو آدھی رات تک شرابیں پی جائیں گی ــــ میں نے دفعتاً بشاشت سے تجویز کیا۔

کملا کو ساتھ لے کر ہم ڈھال سے اُترنے لگے۔ جھیل کے کنارے پل پر انڈونیشیا کے سلطان تقدیر مل گئے۔ وہ بھی بے حد پریشان نظر آ رہے تھے ــــ بیچارے شریف مسلمان حاجی آدمی ــــــــ پھاٹک پر آ کر ہم نے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور ہم کاروں کی طرف بڑھے عین اس وقت ایک مشہور یوروپین مصنف کی بے حد خوبصورت بیوی ہمارا تعاقب کرتی بھاگتی ہوئی آئی۔'' آپ تینوں کہاں جا رہی ہیں''۔ اُس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

''واپس ــــ؟''

''میں ساتھ چل سکتی ہوں ــــ؟''

''ضرور ــــ مگر کیوں ــــ؟''

''میرے شوہر نے ساری شام مجھ سے بات تک نہیں کی۔ بس ان کم بخت لڑکیوں میں گھرا بیٹھا ہے ریشہ خطمی ہوا جا رہا ہے۔ میں ساری شام جل بھن کر کباب ہوا کی۔ مجھے اپنے ہمراہ یہاں سے لے چلو۔''

''ابھی نو بجا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم لوگ ذرا ڈاؤن ٹاؤن جا کر شاپنگ کرنے کی فکر میں ہیں۔''

''بس میں تمہارے ساتھ گھوموں گی۔ میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں سے ہوٹل واپس جا کر سر پٹکے گا۔ کمرے کی کنجی میرے پاس ہے۔'' وہ ٹیکسی بلانے کے لئے آگے بڑھ گئی۔ ایک بس کے پاس آنند شنکر رئے کھڑے تھے۔ وہ بھی بڑے خاموش تھے۔

''اس ملک میں عورتوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ جنگ میں لاکھوں مرد کام آ چکے ہیں۔ فالتو عورتیں کہاں جائیں ____'' کسی نے کہا۔ عموماً ہر متمول جاپانی ایک مسٹریس رکھتا ہے۔

یہ کاک ٹیل فراک والی بے حد دلکش اور اسمارٹ لڑکیاں پوسٹ وار زمانے کی گیشا گرلز تھیں اُن کو امریکہ میں آداب محفل کی ٹریننگ دی جاتی ہے تا کہ غیر ملکی مہمانوں کو اُن کے قاعدے کے مطابق محظوظ کر سکیں۔

شاپنگ کر کے کیوٹو کے بازار سے جب ہم چاروں ہوٹل واپس لوٹے تو وہاں آفت مچی ہوئی تھی۔ برساتی میں بہت سے لوگ پریشان کھڑے تھے۔ ٹیلی فون دوڑائے جا رہے تھے لوگ پارٹی سے واپس آ چکے تھے اور ایک کرائسس کا عالم نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی ہماری ٹیکسی برآمدے کے سامنے جا کر رُکی بہت سے افراد ہماری طرف دوڑ پڑے۔ فرانسیسی اور سنٹرل یوروپین حضرات نے انتہائی ڈرامائی انداز سے ہاتھ ہوا میں پھیلا دیئے۔ او ماموزیل ____ اور مادام ____ انہوں نے جھک کر کہا ____ آپ نے مادام فلاں کو دیکھا ہے ____ اوو ____ مادام ____ آپ آ گئیں ____ آپ کہاں چلی گئی تھیں، کدھر غائب ہو گئی تھیں ____ آپ کا شوہر رو رو کر بُرا حال کیئے دے رہا ہے ____ اپنے کمرے کے دروازے پر بیٹھے واقعی موسیو فلاں ____ اپنی بی بی کی پُر اسرار گمشدگی کے غم میں زار و قطار رو رہے تھے۔

دوسری صبح بے حد خوشگوار تھی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ہم لوگ بسوں میں بیٹھ کر نارا جا رہے تھے جو جاپان کی قدیم ترین راجدھانی ہے۔ راستے میں چاء کے باغ تھے اور تنکوں سے بنی ہوئی نوکیلی بڑے چھجے والی ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ بالکل مشرقی بنگال کا ایسا منظر۔

نارا آٹھویں صدی کے بنے ہوئے مندر الوکی تیشور کے مجسمے پگوڈا بوڑھے ایبٹ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہمارا سواگت کر رہے ہیں۔

مانوس فضائیں سارناتھ اور تکسشلا اور اجنتا کی صدائے بازگشت بیل، ہاتھی، کنول کے پھول، فریسکو کی تصاویر، اجنتا اور باغ کی تقلید میں بنائے گئے ہیں۔ پگوڈا استوپوں سے مستعار لئے گئے ہیں۔

بارش کا ریلہ بڑے زور سے آ گیا۔ بوڑھے پروفیسر لوگوں کی گفتگو اور تبادلۂ خیالات سے بے نیاز آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ ایک مشرقی جرمنی کا ایک شاعر دیبی تارا قدموں میں بیٹھا نظم لکھ رہا ہے یہ بدھ کا عظیم مجسمہ ہے کئی سو فیٹ اونچا۔ اس کے نیچے کھڑے ہوئے انسان دراصل کتنے حقیر اور غیر ضروری معلوم ہو رہے ہیں۔ مندر کے باہر رنگ برنگی چھتریوں کا ایک بڑا زبردست سیلاب امنڈتا آ رہا ہے۔ بارش میں اخباروں کے نمائندوں نے ڈاکٹر گلینسپ کو گھیر لیا۔

یہ برِّصغیر کی ایک نوجوان آرکیالوجسٹ خاتون ہیں۔ یہ بات تو اُن سے پوچھو۔

ڈاکٹر میری طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اُن سے بارش میں نہیں چلا جا رہا مگر ہمارے ساتھ گھسٹتے ہوئے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر گلینسپ جیسے لوگوں نے انسانی تہذیب کو زندہ رکھا ہے یہی ہمارے لئے قطب اور ابدال ہیں۔

بارش تیز ہو گئی۔

اس کنول والے تالاب کے اس سرے پر جو سنہرا پانچ منزلہ پگوڈا ہے۔ اسے چند سال ہوئے ایک دیوانے راہب نے آگ لگا دی تھی۔

ایک بھکشو جس کی ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ خاموشی سے درخت کے نیچے کھڑا این بٹور رہا

ہے۔ جنگل کی ڈھال پر سے سادھو نیچے اُتر رہے ہیں۔ کنجوں میں کیسا امٹ سکون ہے۔

اب ہم لوگ ایک شنتو مندر میں پہنچے جہاں چاروں اور سرخ ستون ہیں۔ چڑھائی پر دونوں طرف پتھر کے چھوٹے چھوٹے سُرخ ستونوں کا ایک جنگل سا کھڑا ہے ان ستونوں میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ چاروں اور اونچے نیچے عجیب وغریب ہیبت ناک شکلوں کے درخت بارش میں جھوم رہے ہیں۔ واقعی پرکھوں کی ارواح ان درختوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ بڑا عجیب لرزہ خیز ماحول ہے۔

بدھ کے مندر ہماری اپنی دنیا میں موجود ہیں۔ شنتو معبد کسی خوف ناک پر اسرار انجانی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں PAGAN, PRIMITIVE نہ جانے کیا قدیم مصر اور قدیم میکسیکو اور قدیم عراق کے ہیکلوں میں شاید ایسا ہی ماحول ہوتا ہوگا یا شاید یہ بحرالکاہل کے اجنبی جزیروں کا مذہب ہے جو روحوں کے کہرے سے نکلا ہے اور اسی کہرے میں موجود ہے۔ شنتو دنیا کا عجیب ترین مذہب ہے۔

برآمدے میں دیوداسیاں رقصاں ہیں۔ سنجیدہ چہرے گریس فل انداز سفید عجیب و غریب لباس، ہاتھوں میں گھنگھرو لئے جن کو وہ کھڑتال کی طرح بجاتی ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چقوں کے پیچھے دو شنتو راہب کالی گول ٹوپیاں اور کالے چوغوں میں ملبوس ڈھول اور بانسری بجا رہے ہیں۔ بارش تیزی سے برس رہی ہے۔ چاروں اور اونچے اونچے راستے ہیں اور سیڑھیاں اور گلیارے اور بے شمار چراغوں کے ستون، ایک پتلی گلی میں سے گزرتے ہوئے اسٹیون اسپنڈر ڈاکٹر عوض سے پوچھ رہے ہیں۔ آپ کو یہ سب کیسا معلوم ہوتا ہے؟

''یہ سب۔؟ یہ سب تو ہمارے میں خون میں شامل ہے۔ ہزاروں برس تک PAGAN رہے ہیں۔!! ہم ان علامتوں کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔''

اسٹیون اسپنڈر اس جواب پر خاموش ہو جاتے ہیں تو گویا جاپانی اور مصری تک ایک نکلے۔ اب غالباً انہیں مغربی تہذیب مغربی روح کے جداگانہ ہونے کا احساس زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

مندر کی پہاڑی کے نیچے بارہ سو سال پرانا وسیع ڈیر پارک ہے جہاں سینکڑوں ہرن پلے ہیں (بنارس میں ایک ڈیر پارک تھا جہاں مہاتما بدھ گھوما کرتے تھے) ہمارے بلانے پر

ہرن بھاگے بھاگے ہمارے ساتھ آتے ہیں۔ ڈوس پیسو دوکان سے بسکٹ خرید خرید کر مجھے دیتے جارہے ہیں جو ہرن نہایت ندیدے پن سے کھائے چلے جارہے ہیں۔ باغوں میں بگل بج رہا ہے۔ بگل کی آواز پر ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں بھرتی بھاگی جارہی ہیں۔ یہ اُن کا لنچ ٹائم ہے۔ کتنے چٹورے ہرن ہیں۔

''جل پریوں کی جھیل'' پر بارش ہورہی ہے۔

نارا ہوٹل عقبی باغ میں بارش سے پناہ لے کر ایک سنہرا ہرن جھاڑی کے اندر مزے سے پڑا سو رہا ہے۔

واپسی۔

نارا اور اوساکا اور ہیروشیما کا چکر لگا کر اب لوگ باگ مختلف سمتوں میں جارہے ہیں۔ اسباب بندھ گئے ہیں۔ خدا حافظ کہے جا چکے۔ ڈوس پیسو اور صوفیہ وادیا اور بوڑھے ڈاکٹر گلینسپ سب اپنے اپنے راستے لوٹ گئے بوڈو یوزے ملک راج آنند کی دعوت پر بچوں کی فلم بنانے بمبئی گئے باقی سب لوگ اپنی اپنی دنیاؤں کو لوٹ رہے ہیں۔ پیرس اور بیروت اور نیویارک اور کلکتہ اور وارسا اور لندن۔

بادل مکاتیو کے ڈائننگ ہال کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے ہیں عقب کے دریچوں سے چند فیٹ کے فاصلے پر آبشار گر رہے ہیں۔ اُن کے پانی کی پھواروں سے دریچوں کے شیشے دھندلا گئے۔ ڈائننگ ہال میں خاموشی ہے۔ صرف ایک میز کے چاروں طرف کملا دیوی اور اوماشنکر جوشی اور آنند شنکر رے اور سیرنواس آئنگر اور جمبوناتھن خاموش بیٹھے ہیں۔

میں ان پانچوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر آجاتی ہوں۔

باہر جہاں ایک عظیم خلا ہے جس میں دھند تیر رہی ہے۔

بیل پر بیٹھا چرواہا بالآخر گھر واپس پہنچ گیا۔ اے لو۔ بیل تو غائب ہے لڑکا قناعت سے اکیلا بیٹھا ہے۔ اس کا سونٹا اور رسہ پھونس کے چھپر تلے دھرا ہے۔

صرف خلا ہے نہ سونٹا ہے نہ رسی نہ چرواہا نہ بیل فضائے بسیط کو کون ماپ سکتا ہے۔؟

چرواہا مایا کے تغیر اور تبدیلیوں کو دیکھتا ہے۔ ندیاں بہہ رہی ہیں ان کا رُخ کدھر ہے؟ سُرخ پھول کس کے لئے کھلے ہیں؟ اس کے جھونپڑے کا پھاٹک بند ہے۔ بڑے بڑے

گنوان بھی اس کو نہیں جان سکتے۔اپنا ڈنڈا سنبھالے وہ بازار میں داخل ہوتا ہے اپنے عصا پر جھکا وہ گھر واپس لوٹتا ہے۔

بیل جو نتھنوں سے چنگاریاں نکالتا پہاڑیوں پر دیوانہ وار پھر رہا تھا۔لڑکے نے بالآخر اسے قابو میں کرلیا۔اب بیل ندی کے کنارے گھاس چر رہا ہے۔سورج ڈوبنے والا ہے اور دھند لکا چھا رہا ہے۔سفید بیل اب سفید بادلوں میں گھر گیا ہے چاندنی ابر میں سے چھنتی ہے بیل غائب ہو چکا ہے اب چرواہا اپنے وقت کا مالک ہے۔وہ اس بادل کی مانند ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر تیرتا نظر آتا ہے۔

اب چرواہا اور بیل دونوں غائب ہو گئے۔روشن چاندنی خالی ہے اس کا کوئی سایہ نہیں۔صرف ایک خلا ہے۔اگر اس کا مطلب جاننا چاہو تو ان سفید کلیوں کو دیکھو جو معطر گھاس میں کھل رہی ہیں۔(ایک جاپانی زین نظم)

بحرالکاہل پر پھیلے ہوئے بادل گہرے ہو گئے خوفناک سمندری طوفان پر سے گزرتا ہوا طیارہ اس وسیع دھند لکے میں سے نکل کر منیلا کے ائیر پورٹ پر اُترا۔

میں باہر آئی۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے خستہ حال بچوں نے بخشش مانگی۔ٹیکسی ڈرائیور نے بے ایمانی کر کے زیادہ پیسے وصول کرنے کی کوشش کی مچھروں نے کانوں میں بھنبھنانا شروع کیا۔

میں جنوب مشرقی ایشیا واپس پہنچ چکی تھی۔سرسبز ٹروپیکل جنگل کھمبوں پر استادہ لکڑی کے جھونپڑے، کیلے اور اناناس کے باغ خستہ حال انسان شاندار عمارات، خلیج منیلا جہاں کا غروب آفتاب کا منظر دنیا کا بہترین غروب آفتاب کا منظر کہلاتا ہے فلپینو لوگوں کی بے مثال سادگی اور خوش خلقی۔

یہ ایشیا کا واحد عیسائی ملک ہے گرجاؤں میں ماس ہو رہا ہے۔جگہ جگہ صدّیقہ مریم کے مجسّمے نصب ہیں۔اتوار کے روز میں اپنی چند دوستوں کے ہمراہ ماس میں شامل ہوئی جہاں سیاہ اسکارف اوڑھے سُرخ گلاب کے پھول لگائے لڑکیاں اور ہسپانوی گاؤن میں ملبوس فلپینو خواتین دوزانو جھکی تسبیح پھیر رہی تھیں۔ ہسپانیہ کی تہذیب جنوبی ایشیا میں فرانس کی تہذیب انڈوچائنا میں برطانیہ کی تہذیب ہانگ کانگ ملایا اور برّصغیر ہندو پاکستان میں مغرب کے اس

بے پایاں تسلط کا ذرا اندازہ تو کیجئے۔

اب میں نے حسبِ معمول جنوب مشرقی ایشیا اور پسماندہ ممالک کے مسائل کے سمندر میں تیرنا شروع کیا۔ وہی ساری باتیں جوان ممالک کے جرنلسٹ، سائنسدان اور سرکاری پبلسٹی کے ماہرین کرتے ہیں۔

افلاس، کاہلی، گندگی، وبائی مرض نوجوان ذہن پرستوں کا فرسٹریشن کمیونزم کا خطرہ آزاد دنیا کا اتحاد امریکن امداد غیر جانب دار ممالک کی سیاست۔

منیلا کی گلیوں میں اندلسی طرز کے مکان ہیں۔ لوہے کی جالی دار بالکنیاں مورش محرابیں سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی بسیں چل رہی ہیں۔ اکا دکا قدیم ہسپانوی وضع کی گھوڑا گاڑی دکھائی دے جاتی ہے۔ اندلسی محلات گھنے ٹروپیکل درختوں میں چھپے کھڑے ہیں جن میں فلپائن کا اعلیٰ طبقہ رہتا ہے۔ شکستہ فصیل کے اندر پرانا شہر ہے جو ہسپانیوں نے قرونِ وسطیٰ کے یوروپین شہروں کی طرز پر تعمیر کیا تھا۔ یہ سارا شہر جاپانی بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔ اور اس میں کھنڈروں کے علاوہ کچھ باقی نہیں سارے شہر میں افلاس زدہ لوگوں کے جھونپڑے پھیلے ہیں۔

جاپان میں ہر طرف امریکن بمباری کے نشانات دکھائے جاتے تھے۔ یہاں ہر طرف جاپانیوں کی بمباری کے نشانات نظر آرہے ہیں۔ خوبصورت قدیم کیتھڈرل کو شہنشاہ ہیرو ہیٹو کے جانبازوں نے بم گرا کر تباہ کیا۔ خوبصورت مکانات پرانے میوزیم۔

اہل انڈونیزیا کی طرح ان لوگوں کو بھی جاپانیوں سے نفرت ہے۔

اُن کو اہلِ ہسپانیہ سے بے اندازہ نفرت ہے جنہوں نے چار سو سال انتہائی جابرانہ حکومت کی۔ فلپائن میں امریکن بے انتہا مقبول ہیں۔ گویا یہ ملک امریکہ کی کولونی رہا لیکن امریکن آقاؤں نے یہاں تعلیم پھیلائی فلپنو قوم کو برابری کا درجہ عطا کیا اور آخر میں بڑے پُرامن اور دوستانہ طریقے سے آزاد کر دیا۔

فلپنو نفسیاتی طور پر اُلجھے ہوئے لوگ نہیں ہیں میں جاپان میں فلپنو صحافی کو چڑایا کرتی تھی کہ تمہاری کوئی قدیم تہذیب نہیں اور آج کل قدیم تہذیبوں کا بڑا زبردست ریکٹ چل رہا ہے لہٰذا اَب تم بھی اپنی ایک پرانی تاریخ ایجاد کر ڈالو۔ نِک اداسی سے خاموش ہو جایا کرتا تھا۔

ہسپانوی عجیب وغریب لوگ ہیں۔انہوں نے دُنیا کی تہذیبوں کی جس طرح بیخ کنی کی ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی۔اپنے ملک میں انہوں نے ہسپانوی تہذیب کے معمار عربوں کو نیست و نابود کیا۔میکسیکو پہنچ کر وہاں کے پرانے تمدن کا قلع قمع کر ڈالا مگر فلپائن آ کر انہوں نے یہ ستم ڈھایا کہ اس قوم کا پورا پس منظر ہی مٹا دیا۔فلپنو دنیا کی وہ واحد متمدن قوم ہیں جن کو یہ خبر نہیں کہ اُن کی تاریخ کیا ہے کیا وہ سولہویں صدی سے قبل جنگلوں میں بسنے والے تھے یا اُن کی بھی میکسیکو کی طرح کوئی کلچر تھی جسے ہسپانوی فاتحین نے تباہ کیا۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے چڑانے سے بِنک کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی میرا خیال تھا۔ہونہہ۔مصنوعی ہسپانوی امریکن زدہ دوغلی تہذیب کا وارث بھلا اس کو مشرقیت کا کیا احساس ہوسکتا ہے اس کی جڑیں تو رامائن یا مہا بھارت یا زین یا بغداد کے بجائے میڈرڈ اور سان فرانسسکو میں پلانٹ کی گئی تھیں اور بنک اُداسی سے مسکراتا تھا۔

فلپنو نسلاً ملایائی ہیں۔اُن کے آباؤاجداد ہندو اور منگول اقوام تھیں جو انڈونیزیا سے یہاں پہنچیں انہیں اقوام میں شمال سے چینی تاجر آن ملے۔ ۱۵۲۱ء میں ہسپانیوں نے ان جزیروں کا انکشاف کیا۔(۱۴۹۸ء میں ایک پرتگالی ہندوستان کو پہنچ چکا تھا) انہوں نے ان جزیروں کو اپنے بادشاہ فلپ دوم کے نام پر معنون کر دیا۔اُن کے چار سو سالہ دورِ حکومت میں فلپنو قوم کی رگوں میں تھوڑا سا ہسپانوی خون بھی شامل ہوگیا۔

مجموعی طور پر فلپائن تمدنی اعتبار سے وسیع پیانے پر گوا ہے فرق صرف یہ ہے کہ فلپنو لوگ اپنے ہسپانوی ترکے اور اس دورِ غلامی سے شرمندہ اور متنفر ہیں اور اپنی موجودہ آزادی سے بے حد خوش۔

۱۸۹۸ء میں امریکہ اور اسپین میں جنگ چھڑی اور اسپین کی شکست کے بعد فلپائن امریکہ کے قبضے میں چلا گیا۔اُنیسویں صدی میں فلپنو قوم نے آزادی کے لئے شدید جدوجہد کی۔اُن کے عظیم ترین قومی ہیرو ڈاکٹر رزال کو ہسپانیوں نے ۱۸۹۶ء میں پھانسی پر لٹکا دیا۔فلپنو لوگوں کو ڈاکٹر رزال سے بڑی شدید عقیدت ہے چپے چپے پر آپ کو اُن کے تذکرے اور یادگاریں ملیں گی۔دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے فلپائن پر قبضہ کیا۔۱۹۴۶ء میں امریکہ نے ان جزیروں کو مکمل طور پر آزاد کر دیا۔

جزائر فلپائن میں تیس مختلف مقامی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ خوبصورت جزیرے اور پہاڑیاں سرسبز جنگلوں سے ڈھکی ہیں۔ جنوب کے چند جزیروں میں مسلمان بستے ہیں جو ہسپانوی زمانے سے مورو کہلاتے ہیں۔ فلپائن میں جو سب سے شکستہ حال اور پسماندہ انسان آپ کو ملے۔ سمجھ لیجئے کہ مسلمان ہوگا۔ مسلمان بھائی اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے ساری دُنیا میں الگ پہچانا جاسکتا ہے نہ وہ تعلیم حاصل کرتا ہے نہ ترقی کی اسے فکر ہے وحشیوں کی طرح مچھلیاں پکڑتا ہے اور عمیق جنگلوں میں رہتا ہے اور ڈاکے ڈالتا ہے اس ملک میں زیادہ تر ڈاکوؤں کا طبقہ مسلمان[۱] فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ فلپنو مسلمان کو منیلا کی یونیورسٹیوں اور ٹیلی ویژن اسٹیشنوں اور تعمیری پروگراموں سے کوئی مطلب نہیں۔

نہ جانے اکثریت کے رومن کیتھولک تعصب کو اس کی اس حالت میں کہاں تک دخل ہے۔

چونکہ اہلِ فلپائن کیتھولک ہیں لہٰذا سخت کٹر مذہبی اور قدامت پسند ہیں۔ امراء کی خواتین ہسپانوی وضع کی پھولی ہوئی آستینوں کے گاؤن اور منٹیلا پہنتی ہیں۔ سرینیڈ تک ہوتے ہیں۔ بس بُل فائٹ کی کسر ہے۔

تعلیم کا چرچا بھی کافی ہے افلاس عام ہے پریس کو بڑی آزادی حاصل ہے۔ چوراہوں پر آنے والے الیکشن کے سلسلے میں ہر طرف دھواں دھار تقریریں۔ انگریزی عام طور پر بولی جاتی ہے اور یہاں کی قومی زبان ہے لوگ بے انتہا کاہل ہیں۔ ایک تو جنوبی ایشیائی صفت اوپر سے ہسپانوی اثر ــــ سٹیا کی عاشق اسپینش قوم یوں ہی بہت زیادہ پھرتیلی نہیں تھی لہٰذا کڑوا کریلا نیم چڑھا اہل گوا کی طرح بے حد میوزیکل ہیں۔

شہر کے باہر سرسبز گھاس پر فلپائن یونیورسٹی کی جدید وضع کی عالیشان عمارات دور دور تک پھیلی ہیں۔ اُن کی دوسری مشہور یونیورسٹی سانتو طوماس ہے جو ۱۶۱۱ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس میں اولڈ ورلڈ ماحول برقرار ہے منیلا میں ۲۲ ریڈیو اسٹیشن ہیں اور ان گنت اخبار۔

منیلا کے مضافات میں کروڑ پتیوں کا محلّہ ہے ہرے بھرے ایوینو خوبصورت جدید ترین طرزِ تعمیر کی کوٹھیاں شاندار کنٹری کلب۔ درختوں کے سائے میں طویل امریکن کاریں

---

[۱] یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے ممکن ہے اب ایسا نہ ہو۔ ۱۵۱

کھڑی ہیں۔ کچھ کچھ لاہور کی گلبرگ کالونی کا سا نقشہ ہے درختوں کے پرے لکڑی کے جھونپڑے ہیں جن کے دروازوں پر بیٹھی خستہ حال عورتیں بچوں کو گود میں لئے چاول پھٹک رہی ہیں۔

فلپینو فلم دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی اس بناسپتی ہسپانوی اور امریکن تہذیب کے باوجود یہ لوگ واقعی مشرقی ہیں اُن کے اس فلم کی کہانی عین مین کسی پاکستانی یا ہندوستانی فلم کی مانند تھی ہیروئن کا انداز، چال ڈھال، ہیروئن کی ماں گویا ہو بہو کانعم البدل تھی باپ مستقل ڈریسنگ گاؤن پہنتا تھا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ پیتا رہتا تھا۔ ہیرو ظالم سماج کے ہاتھوں نالاں تھا ویلن اجمل کا بڑا بھائی تھا۔ ویمپ آشا بھونسلے تھی۔ بات بات پر گانا اور رونا جاری تھا۔ یہ فلم دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ہمارے ہی بھائی بہن ہیں معلوم ہوا کہ اس بے حد مقبول فلم کی ہیروئن سینوریتا لولیٹیا گویا اس ملک میں صبیحہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ہیرو ایک قسم کا سنتوش کمار تھا۔ ہیرو کا باپ غلام محمد۔ قسم خدا کی بڑی تقویت ہوئی۔

اُن فلموں کی زبان ٹگولوگ ہے جو فلپائن کی دیسی اور عوامی زبان ہے۔

منیلا کا پریس کلب عالمگیر صحافی برادری کی طرح وہاں جمع ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی بے تکلف اور خوش خلق ہیں۔ ایک روز ان لوگوں نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ ایک نیوز پیپر کا مالک اور اس کی بی بی جو میز بان تھے۔ ایک لڑکی جو ایک روزنامہ اخبار میں کالم نویس تھی ایک ناولسٹ لڑکی جو بہت پُر مذاق تھی۔ ایک بے حد ذہین لڑکا پیڈرو وہاں کا مقبول ترین اور شعلہ بیان اخبار نویس تھا۔ دو تین اور صحافی جو ٹیلی ویژن اور مختلف اخباروں کے لئے لکھتے تھے۔

پیڈرو ہندوستان اور نہرو کا بے حد معتقد تھا۔ وہ سب اپنے ماضی سے متنفر تھے۔ امریکنوں کو پسند کرتے تھے۔ شروع میں مَیں نے امریکن امداد، فلپینو کمیونزم کے متعلق چند بے ڈھب سوال کئے مگر کچھ دیر بعد مجھ میں اور میرے میز بانوں میں بڑی دوستی ہوگئی۔ آخر ہم سب ایک ہی کشتی میں تو سوار ہیں۔ ان کو جاپان سے شدید نفرت تھی جواب اُن کی خام پیداوار خرید کر کے اپنی صنعتی اشیاء اُن کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔ کیوں کہ فلپائن بھی انڈر ڈیولپڈ ملک ہے۔ پھر وہاں سیاسی انتشار ہے۔ بے شمار سیاسی جماعتیں ہیں۔ سب پریذیڈنٹ میگے

سے سے کو یاد کر کے روتے ہیں اور امریکن ڈالر کے سہارے زندہ ہیں۔

پیڈرو غصّے سے بولتے بولتے جذباتی ہوگیا۔ اس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ میں تم کو سچ بتاؤں اس نے کہا یہ سب فراڈ ہے یہ ساری ہسپانوی تہذیب اور امریکن تعلیم میم! ہم سب۔ میں تم کو سچ بتاؤں۔ ہم فلپینو مشرق اور مغرب کی ناجائز اولاد ہیں پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات گہری ہوتی گئی۔ دور دور سے اداس رومینٹک موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ نیچے بولنگ ایلی میں نوجوان صحافی لڑکے لڑکیاں بولنگ کر رہے تھے۔ ٹیلی ویژن کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ صبح سویرے میں اُن پیارے لوگوں کو خیر باد کہہ کر منیلا سے جا رہی تھی۔

ہانگ کانگ میں مَیں کریتمر بنگ کے خوبصورت فلیٹ میں بیٹھی اُن کی بی بی سے باتیں کرتی رہی مسز کریتمر بنگ بھی کیمبرج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ملایا میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی ایک سالہ بچی کو چینی آیا کھلا رہی تھی۔

خدا کا شکر کہ میں مدتوں بعد برطانیہ کے زیرِ سایہ موجود ہوں میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ سامنے یونیورسٹی کی عمارات، سرسبز پہاڑیوں پر دُور دُور تک پھیلی تھی۔ میرے میزبان کریتمر بنگ یہاں فار ایسٹرن ہسٹری پڑھاتے ہیں اور ٹوکیو کی کانگریس میں اسپنڈر اور اینگس ولسن کے ساتھ برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے اپنے والد کی طرح یہ بھی مستشرق ہیں اور اپنی نوعمری کے باوجود بہت متوازن طبیعت کے بڑے عمدہ آدمی ہیں۔ یونیورسٹی میں خالص انگریزی ماحول ہے۔ شعبۂ انگریزی کے صدر مشہور برطانوی شاعر ایڈمنڈ بلنڈن ہیں۔

فلیٹ کی بالکنی سے میں نے نظر ڈالی ــــــ چاروں اور بل کھاتے پہاڑی راستے دور نشیب میں شاندار بازار تھے جہاں لاکھوں کروڑوں کا کاروبار ہو رہا تھا۔ ہندو سندھی تاجر دوکانیں سجائے بیٹھے تھے چوراہوں پر سکھ سپاہی ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔ لندن کی طرح سرخ ڈبل ڈیکر بسیں چل رہی تھیں۔ بولر ہیٹ والے انگریز متانت سے بنکوں کو جا رہے تھے چینی قلی رکشا کھینچ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پیروں والی بوڑھی عورتیں تاریک

گلیوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ مکاؤ میں افیم کا کاروبار جاری تھا۔ ریسٹورانوں میں بے ہودہ ترین کیبرے ہو رہا تھا۔

ری پلس بے میں سوئمنگ کرتے ہوئے یا کسی اعلیٰ درجے کے برطانوی کلب کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے کون مردود یہ سوچ سکتا ہے کہ اس قوم کا ایک بڑا حصہ اب ایک دوسری فضا میں سانس لے رہا ہے۔ آزاد دُنیا کا چینی تو اب بھی مزے سے افیم کھاتا ہے اور دندناتا ہے جیب کترتا ہے۔ جگہ جگہ غیر ملکی سیاحوں کو خبردار کرنے کی نوٹس لگے ہیں کہ جیب کتروں سے ہوشیار رہئے۔

شنگھائی کا سارا رنگ و بو عیش و عشرت تو کمیونسٹوں نے لوٹ کر تاراج کر دیا۔ وہاں کی طوائفیں سڑکیں کوٹنے کے کام پر لگادی گئیں مگر یہاں خدا کے فضل سے ابھی بڑی رونق ہے۔ مین لینڈ چائنا میں لوگوں کا جو حشر ہوا اگر یقین نہ ہو تو ان پناہ گزینوں سے پوچھ لیجئے جو ہانگ کانگ میں بھرے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے یہاں سلمز کی آبادی بڑھ گئی ہے۔

مگر برطانیہ بہر حال بہت حقیقت پسند ہے۔ پیکنگ میں برطانوی قونصل خانہ ہے۔ مین لینڈ سے زوروں میں تجارت ہو رہی ہے۔ ایکٹوٹی امریکنوں پر ہو گئی کہ جو چینی نوادر عوامی چین سے یہاں امپورٹ کئے جاتے ہیں اور کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔ امریکن سیاح ان کو خرید نہیں سکتے کیوں کہ اُن کی حکومت کی طرف سے اس کی مناہی ہے۔ ان چینی اشیاء کے خریدنے کا مطلب یہ ہوا گویا وہ دُشمن ملک سے تجارت کر رہے ہیں۔ ایلمر رائس کو بے حد کوفت تھی کہ اس وجہ سے وہ کچھ نہ خرید پائے۔

آج کلب میں ملکہ معظمہ کی تصویر دیکھی تو آنکھوں میں تراوٹ آ گئی اور گورنمنٹ ہاؤس پر لہراتے ہوئے یونین جیک پر نظر ڈال کر قسم خدا کی جی بھر آیا میرا۔

مشرق میں برطانیہ عظمیٰ کی آخری کولونی۔ پائندہ باد!

کریتیمر بنگ نے کہا۔ ''ریڈیو ہانگ کانگ والے بے حد اکسائیٹڈ ہیں کیوں کہ اس کمرشل شہر میں تمہاری قسم کے لوگ ذرا کم ہی آتے ہیں لہٰذا وہ تمہارا انٹرویو کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔''

''میری طرح کے لوگ کی ذرا وضاحت کرو۔''

ریڈیو اسٹیشن پر آج کل بی بی سی کی ہوم سروس کا ایک اناؤنسر ٹرانسفر ہو کر آیا ہوا ہے۔ پرانے ساتھیوں کی خیریت دریافت کی۔ یہ بھول ہی گیا کہ اسے میرا انٹرویو کرنا تھا وہ ہانگ کانگ میں اس قدر مگن ہے کہ بُش ہاؤس واپس جانا نہیں چاہتا۔

ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سمندر ہے ہر طرف سمندر ہے اور سرسبز پہاڑ اور ہری بھری وادیاں۔

ہانگ کانگ کی خوبصورتی کا کیا کہنا۔ ساری دُنیا میں مشہور ہے فلک بوس عمارات، دلفریب کولونیل کوٹھیاں غلیظ ترین محلّے پیچ در پیچ راستے خالص مشرقی پرل بک کے ناولوں والا پراسرار ماحول مکاؤ پرتگالی علاقہ ہے لہٰذا اور زیادہ پراسرار اور زیادہ رومینٹک کشتیوں پر ایک پورا شہر آباد ہے شمپانوں میں ریسٹوران ہیں جہاں سلیٹ فراک پہنے حسین لڑکیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔

وائی ڈبلیو سی اے کی عالیشان عمارت کے برابر سے ایک سڑک ڈھلوان پر فیشن ایبل شاپنگ سنٹر کی طرف جاتی ہے جو گویا یہاں کی ریجنٹ اسٹریٹ ہے۔ سامنے پہاڑی ــــــ اوپر سے بندرگاہ نظر آتی ہے۔

یہاں بڑے دلچسپ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک امریکن مشنری خاتون جو سال بھر جنوبی ہند کے ایک مشن میں رہنے کے بعد وطن واپس لوٹ رہی ہیں دو آسٹریلین لڑکیاں جو ماسکو کے یوتھ فیسٹول سے آئی ہیں اور سڈنی واپس جارہی ہیں کئی بد دماغ انگریز لڑکیاں جو سرکاری دفاتر میں ملازم ہیں۔ پھر چینی عیسائی خواتین ہیں اور مسز لم وائی ڈبلیو سی اے کی چینی سکریٹری جو بے انتہا خوش اخلاق ہیں۔ ٹوکیو اور منیلا کی پر تکلف فضاؤں کے بعد یہ کالج ہوسٹل کا ایسا ماحول بہت آرام دہ ہے۔

آسٹریلین لڑکیاں مارگریٹ اور پالا عوامی چین کی تعریفیں کرتے کرتے بے حال ہوئی جارہی ہیں۔ یہ دونوں چند سال انگلستان میں پڑھتی رہیں۔ ماسکو کے تہوار میں شامل ہونے کے بعد چین ہوتی ہوئی یہاں پہنچی ہیں۔ اُن کے ہمراہ ان امریکن طلباء کا گروہ بھی ماسکو سے ٹرین کے ذریعے پیکنگ آیا تھا۔ جن سے امریکی حکومت بے حد ناراض ہے مارگریٹ اور پالا دونوں کمیونسٹ نہیں ہیں۔ مارگریٹ سڈنی کی کئی عیسائی نوجوانوں کی انجمنوں کی عہدیدار

ہے۔ پالا ایک مشن کالج میں پڑھاتی ہے لیکن مارگریٹ عوامی چین سے اس قدر متاثر ہو کر آئی ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے اُس نے وہاں کی بکھان کرتے کرتے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چئیر مین ماؤ ایسے اور چئیر مین ماؤ ویسے امریکن مشنری خاتون مس بنگ کو وہ ہر وقت بتاتی رہتی ہے کہ عوامی چین میں وائی ڈبلیو سی اے کی تحریک نے انقلاب کے بعد کس قدر ترقی کی ہے اور کیا کیا کمالات ہوئے ہیں۔ مس بنگ بے چاری چپ چاپ بیٹھی سنتی رہیں۔ یقین کریں یا نہ کریں۔ راوی ریڈ نہیں بلکہ خود ایک جوشیلی کرسچین ورکر ہے مس بنگ بیشتر امریکن مشنریوں کی مانند بے حد سوئیٹ بڑھیا ہیں مسز لہم کو جو قوم پرست چینی ہیں مارگریٹ کی باتیں بہت ناگوار گزرتی ہیں۔ یہ سب پروپیگنڈہ ہے جھوٹ بالکل بکواس۔ میں تم کو اُن پناہ گزینوں سے ملواؤں گی جو سرخ چین سے آئے ہیں۔

مارگریٹ اکثر بڑی اُداسی سے مس بنگ سے کہتی ہے۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ آپ کا ملک اتنی عظیم قوم کے وجود ہی سے منکر ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

مس بنگ کیرالا کے ایک مشن میں سال بھر رہ چکی ہیں آپ تو خود ایک کمیونسٹ حکومت کا تجربہ کر کے آ رہی ہیں ذرا وہاں کے غلط حالات بتائیے۔ پالا معصومیت سے پوچھتی ہے۔

"عوامی چین کے لوگوں میں کتنا وقار ہے کتنا توازن ____ انہوں نے برسوں برس کس قدر شدید تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔" مارگریٹ کہہ رہی ہے۔ "جب میں سرحد عبور کر کے ہانگ کانگ پہنچی اور مَیں نے یہاں کی غلاظت یہاں کے سلمز یہاں کی آوارگی فری ورلڈ کی ساری نعمتیں دیکھیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چین فری ورلڈ میں نہیں۔ برطانوی کراؤن کولونی! ہونہہ۔ جب میں نے یہاں دُکانوں پر انگریزی نام دیکھے چینی لڑکیوں کو مغرب کی اسٹریٹ واکرز کی طرح گھومتے دیکھا۔ برطانوی جہاز نظر آئے برطانیہ کو کیا حق ہے کسی ایشیائی رقبے پر حکومت کرے۔؟"

ہیلنا مے کے اونچے دریچوں اور شاہ بلوط کی دیواروں والے ایوان نشست میں دو برطانوی اپر کلاس لڑکیاں میرے ساتھ بیٹھی ہیں۔ تذکرہ شہزادی مارگریٹ کے رومان گریس کیلی کی بچی اور مارلن برانڈو کے فلموں کا ہو رہا ہے۔ مودب چینی بٹلر (لکھنؤ کے محمد باغ کلب

کے ہیڈ آبدار عبدل کا روحانی کزن خاموشی سے کھانا سرو کرنے میں مصروف ہے دریچے کے باہر عمیق اندھیرا ہے) میری میزبان جیلین یہاں کولونیل سروس میں عہدیدار ہے اس کا باپ انڈین آرمی میں بریگیڈیر تھا اور دوسری جنگِ عظیم سے قبل لکھنؤ چھاؤنی میں رہا کرتا تھا۔ دوسری لڑکی پیملا بھی جیلین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور اسی کی طرح یہاں ملازم ہے غیر معمولی طور پر بے وقوف لڑکی ہے اس کا باپ افریقہ کی کسی برطانوی کولونی کا گورنر ہے یا تھا۔ مجھے تفصیلات یاد نہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اعلیٰ درجے کے اقامتی کلب ہیں رہتی ہیں جو ہانگ کانگ کے کسی انگریز سابق گورنر کی بیوی کے نام پر معنون کیا ہے۔ تیسرے پہر کورٹی پلس بے میں سوئمنگ کرتی ہیں۔ رات کو اعلیٰ سرکاری طبقے کی دعوتوں میں شامل ہوتی ہیں اسی ڈھب سے ان کی زندگی گزر رہی ہے۔ اُن کی تعلیم انگلستان اور سوئٹزرلینڈ کے فنشنگ اسکولوں میں ہوئی ہے اُن کا مطالعہ لندن کے سوسائٹی رسالوں تک محدود ہے اُن کو بسنت کی کچھ خبر نہیں مارگریٹ اُن کو دیکھ پائے تو ہنسی کے مارے دیوانی ہوجائے۔ یہ بے چاری لڑکیاں جو برطانوی امپریلسٹ اپر کلاس کے آخری چراغ ہیں۔

صبح مارگریٹ کہہ رہی تھی کہ میرا خیال تھا کہ ہانگ کانگ شاید دس سال تک برطانیہ کے پاس رہ جائے مگر آج ایک چینی نے اس سے کہا کہ فقط تین چار سال کی بات اور ہے۔

چند روز اور میری جان۔ چند ہی روز۔

ایسی بدشگونی کی باتیں مارگریٹ کرتی ہے۔

دوسرے روز ہم تینوں ہانگ کانگ سے روانہ ہو رہے تھے رات کو ہم پیکنگ سے پہلے اپنا سارا سامان پھیلا کر فرش پر بیٹھ گئے۔

مارگریٹ اور پالا روس اور چین سے ڈھیروں تحفے لے کر آئی تھیں۔ چین میں اُن کو جو تحفے دیئے گئے وہ حیرت انگیز تھے۔ ہزاروں سال پرانے زیورات سینکڑوں برس پرانی پینٹنگز، دوسرے انتہائی بیش قیمت نوادر۔ مس ہننگ بے حد تعجب اور مسرت سے ایک ایک چیز دیکھتی ہیں۔ تم ان سب چیزوں سے اچھا خاصا میوزیم کھول سکتی ہو۔! انہوں نے کہا۔

ہانگ کانگ پانی کے دوسرے کنارے پر رہ گیا کولون میں زندگی کا ہنگامہ اسی طرح جاری تھا میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سامنے پنیسولا ہوٹل تھا جہاں سے مجھے چند لمحوں میں

ائیرپورٹ جانے کے لئے ائیرلائنز کی بس پکڑنا تھی۔

سڑک عبور کرتے ہوئے مجھے مارگریٹ اور پالا نظر آ گئیں۔

خدا حافظ ____ وہ ہاتھ ہلا کر چلائیں۔

تمہیں معلوم ہے ہم دوبارہ کہاں ملیں گے؟'' مارگریٹ نے قریب آتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

''تم ہی بتاؤ ____''

''ریڈیو ہانگ کانگ میں ____''

''خدا خیر کرے۔تم تو واقعی بہت بُری طرح برین واش کردی گئی ہو تمہارا کیا حشر ہوگا۔'' میں نے متفکر ہو کر کہا۔ پھر ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر خوب ہنسے اور دونوں لڑکیاں اپنا اپنا سامان اُٹھائے اپنے راستے چلی گئیں اب مارگریٹ گھر پہنچے گی۔ جب لوگ گھر واپس پہنچتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔

ہر سفر کے بعد گھر موجود ہونا چاہئے۔

اور گھر تباہ نہ ہونے چاہئیں۔

دنیا کے ایشیا کے شہروں کو بمباری سے بچاؤ۔

میں نے سوچا کہ اگر یہی جملہ میں کاغذ پر لکھ دوں تو کس قدر بے معنی واہیات مصنوعی، سلوگن اور پروپیگنڈہ اور نعرہ بازی معلوم ہوگا۔

جب میں بنکاک پہنچی تو اس سے کچھ ہی عرصہ قبل ریوری میرین قسم کا فلمی کُو کیا جا چکا تھا۔ ائیرپورٹ پر مسافروں کی نہایت زبردست چیکنگ کی جارہی تھی۔ چاروں طرف مسلح سپاہی کھڑے تھے باہر سڑکوں پر ٹینک گھوم رہے تھے اور نہایت سنجیدہ شکلوں والے افسر جو سب کے سب کومک اوپرا کے کردار معلوم ہورہے تھے۔ایک صاحب نے پاسپورٹ دیکھنے کے بعد میرے ٹائپ رائٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے ____''

''تارپیڈو ____''

''ایں ____ کیا ____''؟

''تارپیڈو ____'' میں نے سادگی سے دہرایا۔

"یہ ____ یہ ____ ؟" انہوں نے انگلی سے دوبارہ اشارہ کیا۔

"جی! کیا اسے مارشل لاء میں اندر لے جانے کی اجازت نہیں ____ ؟" میں نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

"لیکن یہ ہے کیا ____ ؟"

"تارپیڈو ٹاپ رائٹر ____ مغربی جرمنی کا بنا ہوا ____ نہایت مضبوط پائیدار ____"

"آپ آگے تشریف لے جا سکتی ہیں۔"

شہر میں عجب چنڈو خانے کا مارشل لاء نافذ ہے۔ لوگ گویا تہوار مناتے پھر رہے ہیں۔

شام کے اخبار جنرل سری آنند کے متعلق سنسنی خیز اور ڈرامائی خبروں سے پُر ہیں جو پرسوں بھاگ کر جنیوا پہنچے فیلڈ مارشل سرت تھانارت نے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔ نئی حکومت میں سری وسارن واچا شامل ہیں اور ایک اور صاحب جن کا نام آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک ان حضرات کے نام سنسکرت میں ہیں وہاں تک تو خیریت ہے مگر پھوم پھاں پھونگ قسم کے خطابات سن کر دم پھولا جاتا ہے۔

معزول شدہ وزیر اعظم مارشل سنگرام کل رات ایک دیہاتی سے موٹر بوٹ مستعار لے کر کمبوڈیا کی طرف نکل گئے۔ بالکل ہالی ووڈ کے کسی جاسوسی فلم کا اسکرپٹ معلوم ہو رہا ہے۔

سیام ____ ! سیام ____ !!

سیام جو کہ تھائی لینڈ ہے۔

جس طرح انڈیا جو کہ بھارت ہے۔

تھائی کے معنی آزاد کے ہیں۔ یوں بھی ملک فری ورلڈ کی آزادی کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ اسی لئے فلپائن اور پاکستان اور تھائی لینڈ تینوں میں بڑی پکی دوستی ہے۔

بنک کاک سے کچھ فاصلے پر سیام کی قدیم راجدھانی ایوتھیا ہے۔ سرحد کے

اس پار کمبوڈیا میں انگ کورواٹ ہے۔

ہم انگ کور جا رہے ہیں۔ ایک یوروپین سیاح اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

ہم انگ کورواٹ ہو آئے ____ آپ ابھی نہیں گئے؟

سارے یوروپین اور امریکی سیاح انگ کورواٹ جانا چاہتے ہیں جو ایک زمانے میں روم کی مانند عظیم الشان تھا۔

اور چمپا ____ اور ملایا ____ اور جاوا ____ ہند قدیم کی نوآبادیاں جو پہلی سے پندرہویں صدی عیسوی تک پھلی پھولیں۔

کمبوڈیا مہاراجگان جے ورمن یشوورمن اور سوریہ ورمن کا ملک کمبوج دیس کمبوڈیا کے جنوب کی بادشاہت تھی جسے پانچویں صدی عیسوی میں مشرق کے انام اور مغرب کے تھائی لوگوں کے حملوں نے کمزور کر دیا۔ اپنے عروج کے زمانے میں سارا سیام کوچین چائنا کمبوڈیا لاؤس برما ملایا کے چند حصے اس میں شامل تھے۔ انگ کور اس کی راجدھانی تھی جس کا وشنو کا مندر دنیا کے عجائبات میں شامل ہے۔

انگ کور کا مندر۔ قرطبہ کی مسجد۔ اوّل و آخر فنا!

انگ کورواٹ آج بھی ایک خواب کی طرح موجود ہے۔ خاموش، مہیب، سنسان، جنوبی ہند اور اڑیسہ کی طرز کے مندر لوکیشورا اور ہری ہر کے عظیم الشان بت شو کے لرزہ خیز مجسّمے ایلورا اور کھجوراہو کی روایت کے دیوتا اور دیویاں اور وِدیادھرا اور گندھرو دیواروں کے ریلیف کے مجسّمے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں کا فنِ سنگ تراشی جس بلندی پر پہنچ گیا تھا صرف دیکھ کر اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گپتا عہد کے کتنے فنکار یہاں آئے ہوں گے۔

مُردوں کا خاموش شہر۔

چمپا ____ مہاراج دھیراج سری جے اندرورمن کا ملک۔

سولہویں صدی میں قبلائی خان کے حملہ آوروں نے ان ساری جگہوں کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔

اوّل و آخر فنا ____

آخر میں چمپا اور اندلس اور انگ کور سب مٹ جاتے ہیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ

جب تمدن اپنی بلندی پر پہنچتا ہے تو اُفق پر تخریب پسندوں کی فوج طلوع ہوتی ہے۔

آج ان خطوں میں مون کھمیر، تبو برمی انامی ملایائی اور تھائی نسلوں کی ایک عجیب و غریب کھچڑی آباد ہے۔ بڑا بڑا اینتھرو پولوجسٹ اور ماہر لسانیات یہاں آن کر چکرا جائے گا۔ میں اُن کے عمرانی مطالعے کی کوشش سے فوراً دست بردار ہوگئی۔

ایک ہزار قبل سام دوارروتی کے مون لوگوں اور کھمیر (کمبوڈیا یا کمبوج دیس) کی ہندو سلطنت کے زیر نگیں تھا۔ جزیرہ نما ملایا کی طرف کا حصہ سماٹرا کے سری وجے کے قبضے میں تھا۔ اسی زمانے میں تھائی قوم نے جنوبی چین سے جزیرہ نما انڈوچائنا کی طرف ہجرت کی۔ دو ہزار سال ادھر تھائی نسل شمالی مغربی چین کے اس صوبے میں رہا کرتی تھیں جو آج کل شین سی کہلاتا ہے۔ لفظ سیام اسی شین سے نکلا ہے۔ جنوبی چین میں جب تھائی بادشاہت پر قبلائی خاں نے باضابطہ قبضہ کرلیا اس وقت تھائی لوگ ہجرت کر کے انڈوچائنا آچکے تھے۔ یہاں انہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کیں اور آپس میں اور اپنے ہمسایوں سے لڑتے رہے۔ اُن کی ایک شاخ برما میں شان قبیلے کے نام سے آباد ہوگئی۔ وسط سیام اب کھمیر سلطنت کی ہندو کلچر کے زیرِ اثر دیس کہلاتا تھا ۱۲۵۷ء میں ایک تھائی شہزادے اندر جیت اور اس کے بیٹے رام نے کھمیر تسلط سے آزاد ہوکر اپنی حکومت قائم کی۔ ایوتھیا کا نیا شہر آباد کیا گیا جو ۱۷۹۲ء تک سیام کی راجدھانی رہا جس کے بعد بنگ کاک کی بنیاد پڑی۔

سیام تہذیبی اعتبار سے کمبوڈیا کی برہمن تہذیب کا حلقہ بگوش رہا۔

مجموعی طور پر چین اور ہندوستان کی تہذیبوں اور ہندو اور بدھ مت کے معجون مرکب کا دوسرا نام سیام یعنی تھائی لینڈ ہے۔ اُن کا رقص بیلے اور ڈرامہ ہندوستانی کلاسیکل رقص اور ڈانس ڈرامہ کا چربہ ہے۔ موسیقی پر چین اثر انداز ہوا سیام کی سنگ تراشی دراصل گپتا عہد کی عظمت کی یادگار ہیں۔ کمبوڈیا کے زیرِ اثر سیام کے فنون لطیفہ نے بہت ترقی کی۔ تیرھویں صدی میں سیام نے کمبوڈیا ہی کے ذریعے جنوبی ہند کا ایک رسم الخط حاصل کیا۔ پالی سنسکرت اور کمبوڈین الفاظ سے اُن کی زبان کی تشکیل ہوئی۔ رامائن تھائی ادب کی بنیاد ہے اور اس کا سیامی ورژن یہاں کا اعلیٰ ترین کلاسیک سمجھا جاتا ہے۔

مذہب کا یہاں ہر چیز میں بہت سخت عمل دخل ہے۔ دیہات میں لوگ اپنے اپنے

دیوی دیوتاؤں درختوں اور پرکھوں کی عبادت کرتے ہیں۔ وسط سیام کا اعلیٰ طبقہ اب بھی مذہبی طور پر خالص ہندو ہے بنگ کاک میں چار سو خانقاہ ہیں۔ لہٰذا تجارت سکھوں اور چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں عیسائی مشنریوں کو بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مسلمان تقریباً مفقود ہیں پگوڈا بھی ہندوستانی مندروں کی سکھارا طرز سے نکلے ہیں جو یہاں کمبوڈیا سے آیا۔ رنگین ٹائیل شوخ رنگ آئینوں اور رنگ برنگی گھنٹیوں اور سونے کے پتروں اور پروں والا ____ طرزِ تعمیر خالص سیامی خصوصیت ہے ستوپ منڈپ کٹی ان کی مختلف طرزِ تعمیر ہیں۔ واٹ مندر کو کہتے ہیں۔ ستوپ ستوپ ہے۔ منڈپ منڈپ کٹی کے معنی کٹی ستوپ کے سر پر چھتر ہوتا ہے جس کا مطلب چھتر ہے۔

اس سے قبل کہ میں اور زیادہ گڑبڑا جاؤں میں اس موضوع کو تبدیل کرتی ہوں۔

بنگ کاک مشرق کا وینس کہلاتا ہے۔ بوجہ بہت سی نہروں کے جو شہر میں سے گزرتی ہیں مگر یہ نہریں زیادہ تر غلیظ ہیں اور اُن پر چلنے والی کشتیاں شکستہ اور گندی اور افسوس کہ مجھے اُن میں کوئی افسانویت نظر نہیں آئی۔ دریا پر سے سینکڑوں کشتیاں دھان اُٹھائے گزرا کرتی ہیں۔ دریا اس ملک کی خاص تجارتی شاہراہ ہے اس کے دونوں طرف بے شمار نہریں ہیں جن پر سمپان، موٹر بوٹ، اسٹیم لانچیں بہتی نظر آتی ہیں۔ ہاؤس بوٹ میں لوگ رہتے ہیں نہریں گویا بازار کی چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں جہاں کشتیوں پر ہاٹ لگتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف نارنجی کپڑوں والے راہبوں کی ریل پیل سے جو اکثر ناؤ کھیتے بڑی کشتیوں کے پاس جاتے ہیں وہاں سے خیرات لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تھائی لینڈ کا سارا ماحول اس قدر مانوس سا ہے کہ مجھے بالکل یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی اجنبی غیر ملک میں ہوں۔ یہ سب تو چاٹگام کی طرح ہے یا مشرقی پاکستان کے کسی بھی خطے کی مانند، ائیرپورٹ سے شہر تک کا راستہ تیج گاؤں سے ڈھاکے جانے والی سڑک کی یاد دلاتا ہے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے جھونپڑے ٹوٹی پھوٹی چھکڑا، ایسی بسیں سائیکل رکشائیں، کائی آلود تالاب اور نالے جغرافیائی اور عمرانی لحاظ سے مشرقی پاکستان واقعی جنوب مشرقی ایشیا کا ایک حصہ ہے۔

مجھ سے ایک امریکن نے کہا۔ ''یہاں مکمل آزادی ہے ملک اپنی ضرورت بھر اناج اور چاول اُگاتا ہے لوگ خوش حال ہیں لیکن حد سے زیادہ کاہل، مجھے ایک اور احمق امریکن مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ یہ لوگ طبعاً لاپروا اور خوش باش ہیں سیاست اُن کے نزدیک محض ایک اور تفریحی مشغلہ ہے اُن کے یہاں حکومت تبدیل کرنے کا نارمل طریقہ ''کُو'' ہے۔ اور ملکوں میں الیکشن ہوتے ہیں آئینی طور پر ردّوبدل کیے جاتے ہیں۔ یہاں کُو دی تا کا فیشن ہے بے شار سیاسی جماعتیں ہیں سب اپنی اپنی ہانکتے ہیں مگر ایک عام آدمی کو سیاست کی مطلق فکر نہیں یہ صرف امراء کا کھیل ہے۔''

''میں نے سنا ہے کہ شمال میں بڑا سخت قحط پڑ رہا ہے بنگ کاک کی سڑکوں پر بے شمار قحط زدہ کسان مارے مارے پھر رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ سب روسی پروپیگنڈہ ہے'' اس نے جواب دیا۔ تھائی لینڈ خوشحال ملک ہے۔ لوگ اپنی کھال میں مگن ہیں اور بے حدشست الوجود پیشہ ور سیاستدانوں کو پیلس پولیٹکس لڑانے کی انہوں نے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ بادشاہ اور ملکہ پریوں کی داستانوں والے ماحول میں رہتے ہیں۔ واقعی یہ بقول تمہارے بڑا زبردست کومک اوپیرا ہے مگر ان پریشان حال حقیقت پرست دنیا میں ایک الف لیلوی ملک بھی تو ہونا ضروری ہے تم پاکستانیوں اور ہندوستانیوں میں یہ مرض ہے کہ ہر چیز کو حد سے زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہو اور پھر تم کو اپنا مقابلہ اُن لوگوں سے یوں بھی نہیں کرنا چاہئے یہ یونہی مصنوعی سے لوگ ہیں اُن کے یہاں وہ عظمت اور گمبھیرتا نہیں جو پاکستان میں ہے۔ تم نے لیٹے ہوئے بدھا (برسبیل تذکرہ ہمارا اُردو ہندی ہندوستانی کا لفظ بڈّھا اسی لفظ بدھ سے نکلا ہے یعنی ایک بہت بدھمان بزرگ۔) کا پگوڈا دیکھا ______؟

پگوڈا ______ مزید پگوڈا ______ شاہی محلات زمرّد کے بدھا کا مشہور و معروف مندر جو دراصل ایک عظیم الشان تعزیے کی مانند ہے جس کے چاروں اور برآمدوں کی دیواروں پر رامائن کی کہانی کے نہایت بھدّے فریسکو ہیں۔ ہال میں فراکوں میں ملبوس عورتیں مورتی کے سامنے سجدے میں پڑی ہیں اور امریکن ٹورسٹ اِن کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔

میں جلدی سے باہر نکل آئی۔ مشرق کے EXOTIC ہونے کی بھی ایک حد ہونی چاہئے۔

باہر سڑکوں پر اخبار والے جنرل سنگرام کے متعلق تازہ ترین خبروں کی سرخیاں لگائے پھر رہے تھے۔ سیٹو کے دفاتر کے آگے طویل کاریں کھڑی تھیں۔ ٹینک بدستور چاروں اور چکر لگا رہے تھے۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ جزیرہ نما مشرق میں ریاستہائے بلقان کی کمی کس خوبصورتی سے پورا کر رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی مضحکہ خیز بادشاہتیں جہاں انقلاب آتے ہیں سازشیں اور خوں ریز جنگیں ہوتی ہیں۔ گوریلا جانبازوں کے سروں پر انعام مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ بڑا عجیب وغریب علاقہ ہے۔ یہاں شمالی ویت نام بھی ہے اور تھائی لینڈ بھی۔ یہ ہوچی منہ اور پرنس وان دونوں کی سرزمین ہے۔ ان سارے ممالک کی طرح جو اپنی تاریخ کو محض ٹورسٹ انڈسٹری کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ تھائی لینڈ بھی خاصا بوگس ہے۔

تاریخ تھکا دیتی ہے۔ حال بے کیف ہے۔ مستقبل نامعلوم۔

پگوڈاؤں میں ہر طرف گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ دھان کے سرسبز کھیت کھلی ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ غیر ملکیوں کے لئے ان فضاؤں میں بڑا گلیمور ہے۔ اصلیت میں ہر طرف بھوک اور تباہ حالی ہے غیر ملکیوں کو تو سندھ اور سرحد کے پسماندہ ترین گاؤں میں بھی بڑا گلیمر نظر آتا ہے اور اگر کوئی سمجھدار غیر ملکی اس پس ماندگی کی طرف ذرا سا بھی اشارہ کرتا ہے تو فوراً موہن جوداڑوں کی قدیم پاکستانی تہذیب کے متعلق ایک رنگین پمفلٹ اس کی ناک میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاح یہ سوچ کر کہ پیسے وصول ہو گئے خوش خوش کراچی کے میٹروپول واپس آجاتا ہے۔

میں بھی سارے تاریخی مقامات کی سیر کے بعد خوش خوش بنگ کاک میں اپنی قیام گاہ پر لوٹی۔

بنگ کاک کی مشہور پبلشر خاتون اور زنانہ رسالے استریؔ سرن کی ایڈیٹر مس نیلا وانؔ نے رائٹر لوگوں کی دعوت کی ہے اسٹیون اسپنڈر رانگس ولسن اور ڈیوڈ کارورز جاپان سے واپسی میں مختلف ممالک کا چکر لگاتے ہوئے آرہے ہیں اور آج ہی انگ کورواٹ سے واپس

لوٹے ہیں۔ کمبوڈیا میں خالص سیاحوں والے طرز کے بڑے بڑے ایڈونچرز اُن کے ساتھ رہے۔ یہ لوگ جنگلوں میں راستہ بھول گئے ہوٹل میں رات کو مچھروں نے اُنہیں بہت ستایا۔ ایک مرتبہ طیارہ فورسڈ لینڈنگ کرتے کرتے بچا۔ اکثر موٹر کا انجن خراب ہوا۔ وشنو کے مندر کے سناٹے میں انہوں نے وقت کی پرواز کی صدائیں سنیں اور چمپا کے پرانے بادشاہ جو پریشو رومادیوا ایشور مورتی کے نام سے متعارف ہوئے۔

میرے خیال میں مشرق کا DOZE مسٹر اسپنڈر کے لئے اب ضرورت سے زیادہ ہوگیا تھا۔ موصوف معمول سے کہیں زیادہ اُکتائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ طرّہ یہ ہوا کہ بہن نیلا اون کی دعوت میں تھائی ادباء اور صحافیوں کی ایک بارات کی بارات اُن کا دماغ چاٹنے کے لئے موجود تھی اور سارے مشرقیوں کی طرح کیا نا قابل یقین مسخرے پن کے ان خواتین و حضرات کے نام تھے ____ الونان راج دھن، شہزادہ پریم، ڈاکٹر وڈیا، شیوسری آنند، مس اندرا کا سنگ، مس سدھی لکشن۔

رات بھر بارش ہوا کی۔ میری لکڑی کی کاٹج اندھیرے میں گھری کھڑی ہے۔ چاروں اور گھنے درخت ہیں۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے ہیں۔ میری امریکن میزبان خاتون باہر بارش میں بھیگتی کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں۔ صبح ہوتے خنکی زیادہ ہوجائے گی یہ لو میں تمہارے لئے کمبل لائی ہوں۔

تنگ نظر امریکن اور بوگس سیامی، متعصب قوم پرست چینی اور ری ایکشنری جاپانی مغربیت زدہ فلپنو اور اکل کھرے انگریز، حریّت کے دُشمن فرانسیسی اور مسخرے جنوبی کورین۔ سب انسان ہیں عفریت اور شیاطین نہیں۔ اُن سے ڈرنے یا بدظن ہونے کی آخر کیا وجہ ہے۔ اُن سب کے دلوں میں محبت اور ہمدردی اور شرافت اور نیکی کے جذبات موجود ہیں جو ہم آپس کی نفرت اور شکوک کی وجہ سے دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ دُنیا مایوس کن نہیں ہے۔ اس دنیا میں امریکہ کے جان ڈوس پیسو اور مغربی جرمنی کے ڈاکٹر گلینسپ جیسے عظیم اور پیارے انسان بستے ہیں جنہیں جاننا کسی بھی انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔

میری امریکن میزبان کمبل دینے کے بعد بارش میں بھیگتی ٹارچ کی روشنی چمکاتی گھاس کا وسیع قطعہ عبور کرکے اپنے مکان کی طرف چلی گئیں میں نے روشنی جلا کر ایک تھائی

رسالہ اُٹھالیا۔ جس پر ہندو دیو مالا کے روایتی عقاب گُرڑ کی تصویر بنی تھی جو انڈونیشیا کی طرح تھائی لینڈ کا بھی قومی نشان ہے قریب ہی پاکستان اور ہندوستان کے سفارت خانوں سے آئے ہوئے ہلال اور اشوک چکر والے پمفلٹ رکھے تھے۔ قومی نشانوں کی نفسیات کیا ہے۔ میں نے سوچنا چاہا۔ اُکتا کر میں نے کاغذات میں سے دوسری کتاب اُٹھائی ایک امریکن صحافی کی لکھی ہوئی ضخیم کتاب اُٹھائی جس کے گرد پوش پر اُردو ہندی اور دوسری ایشیائی زبانوں میں لکھا تھا۔ ''ایشیا کا کوئی وجود نہیں۔''

اے لیجئے اس سمجھدار آدمی نے سارا قصّہ ہی پاک کر دیا۔ اب سارے گھپلے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ ٹوئینبی فار ایسٹرن سوسائیٹیوں کے متعلق کہتے ہیں اور پنڈت نہرو کا ایشیا کا تصور پاکستان والوں کی تھیوری سے کیوں جُدا گانہ ہے۔ اور انقلابی ایشیا اور غیر جانبدار ایشیا اور فری ایشیا اور اسلامی ایشیا میں کیا فرق ہے۔ ممکن ہے بھائی ذوائٹ کک نے اس مسئلے پر بڑی دقیق ریسرچ کر کے اعداد وشمار میں جمع کئے ہوں اور اُن کا تجزیہ صحیح ہو مگر اُن کو یہ نہیں معلوم کہ یہ ایشیا جو اتنے سارے ایشیاؤں میں بٹا ہے اس کے اختلافات کے پردے میں صرف ایک حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

وہ حقیقت محض اتنی سی ہے کہ میری اس سفید لکڑی کی خوبصورت اور چار کھمبوں پر کھڑے ہوئے ایک جھونپڑے پر بارش برس رہی ہے اور جب صبح ہوگی اور بارش تھمے گی تو ایک دُبلا پتلا مرنجان مرنج تھائی انسان اُٹھ کر پھر چاول اُگانے میں جُٹ جائے گا۔ وہ اور اس کے سارے بھائی بند ان تمام انواع واقسام کے ایشیاؤں میں ہزاروں برس سے اسی طرح کولہو میں جُتے ہیں جو مہاتما بدھ کے چکر کی طرح چلے جا رہا ہے اور اس نقطے پر پہنچ کر موزخین کے عالمانہ نظریے اور صحافیوں کی رپورٹیں اور سیاستدانوں کی تقریریں کیا بے حد فالتو نہیں معلوم ہوتیں؟

در چمن ہر ورقے دفترِ حالِ دگر ست

ہا یکسوس دور کے بعد ان پچھلی ساری صدیوں میں مصر میں مقیم بنی اسرائیل پر مظالم کی زیادتی ہوتی گئی۔" اور ایک مدت کے بعد یوں ہوا کہ فرعون مصر مر گیا۔ اور خدا نے بنی اسرائیل کا کراہنا سنا۔ اور خدا نے اپنے عہد کو جو اس نے ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا یاد کیا۔

"اور موسیٰؑ اپنے خسر[1] تیرو کی جو مدیان کا کاہن تھا بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور انہیں ہنکاتے ہوئے بیابان کی پرلی طرف الوہی پہاڑ حورب کے نزدیک لے گیا۔ اور خداوند کا ایک فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلے میں اس پر ظاہر ہوا اور موسیٰؑ کیا دیکھتا ہے کہ جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے پر وہ جھاڑی بھسم نہیں ہوتی۔ تب خدا نے جھاڑی میں سے پکارا: اے موسیٰؑ! اے موسیٰؑ! کیا تو دیکھتا ہے کہ جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے پر وہ جھاڑی بھسم نہیں ہوتی۔ تب خدا نے کہا۔ اِدھر پاس مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اُتار۔ کیوں کہ جس جگہ تو کھڑا ہے وہ مقدس زمین ہے۔"

(انجیل مقدس: کتاب خروج)

---

[1] مصر میں حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اور پیغمبری ملنے سے پہلے کے حالات دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ اسلام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے خسر یعنی جناب صفورہ کے والد حضرت شعیبؑ تھے جو مدین کے نبی تھے۔ کلیم اللہ کا اپنا نام موشے مصری تھا۔

’’پھر جب موسیٰ ؑ اس آگ کے پاس پہنچا آواز آئی میدان کے داہنے کنارے سے برکت والی زمین اس درخت سے کہ اے موسیٰ ؑ میں ہوں۔ اللہ: جہان کا رب۔ پھر کہا۔ میں ہوں تیرا پروردگار تیرا۔ پس اُتار ڈال دونوں جوتیاں۔ تو طُویٰ کی مقدس وادی میں ہے۔‘‘
(قرآن حکیم)

’’اور موسیٰ ؑ نے اپنا منہ چھپایا کیوں کہ وہ خدا پر نظر کرنے سے ڈرتا تھا۔ اور خدا نے کہا کہ میں اپنے بندوں کی تکلیف سے واقف ہوں۔ سو آ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے۔ تب موسیٰ ؑ نے کہا جب میں بنی اسرائیل کے پاس جا کر کہوں کہ تمہارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور وہ مجھ سے پوچھیں کہ اس کا نام کیا ہے تو میں اُن کو کیا بتاؤں؟ تب خدا نے جواب دیا میں وہ ہوں جو میں ہوں سو تو بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ میں وہ ہوں جو میں ہوں تمہارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔‘‘ (کتاب خروج۔ باب۔ ۳)

چنانچہ موسیٰ ؑ ۱۲۲۷ ق م میں اپنی قوم کو مصر سے نکال لے گئے۔ اور انجیل کے مطابق ’’بیابان میں خداوند کا فرشتہ اس قافلے کو دن میں راستہ دکھانے کی خاطر بادل کے ستون میں اور رات کو روشنی دینے کے لئے آگ کے ستون میں ہو کر اُن کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔‘‘

اُس کے بعد خدا نے موسیٰ ؑ کو کوہِ سینا پر احکام و شریعت عطا کی ’’اور تیسرے دن صبح کو رعد کی کڑک اور چمک کے ساتھ صور پھونکنے کی آواز آئی اور خداوند کا جلال کوہِ سینا پر آ کر ٹھہرا اور پہاڑ پر گھٹا چھا گئی اور ساتویں دن اس گھٹا میں سے خدا نے موسیٰ ؑ کو بلایا اور موسیٰ گھٹا میں سے ہو کر پہاڑ پر چڑھا اور چالیس دن اور رات وہاں رہا۔‘‘ اور کتاب خروج کے مطابق اس وقت خدا نے موسیٰ ؑ کو اپنے مسکن اور خیمۂ اجتماع کی آرائش کی تفصیلات، شہادت نامہ رکھنے والے صندوق کی پیمائش، قربانیوں، کفاروں، عقیقہ وغیرہ کی رسوم، کاہنوں کے

فرائض اُن کی پوشاک اور قربان گاہ کے پردوں کی کتر بیونت، زیبائش، رنگ، کپڑوں کی اقسام، طلائی شمعدانوں، مقدّس ظروف، مسح کرنے کے تیل، مقدس روٹی، خوشبودار بخور، حلال حرام و مکروہ غذا وغیرہ وغیرہ کی مکمل تفصیلات موسیٰؑ کو بتلائیں اور کہا "بنی اسرائیل سے کہہ میرے احکام اور آئین پر عمل کریں۔ بُرے کاموں سے آلودہ نہ ہو جانا کیوں کہ جن قوموں کو میں تمہارے آگے سے نکالتا ہوں وہ بُرے کاموں میں آلودہ ہیں۔ جو مکروہ رسمیں تم سے پہلے کی جاتی تھیں اُن میں نہ پھنس جانا۔ لیکن اگر تم میرے خلاف چلو گے تو مَیں بھی تمہارے خلاف چلوں گا۔ تمہاری سورجؔ[1] کی مورتیوں کو توڑ ڈالوں گا۔ تمہاری لاشیں تمہارے شکستہ بتوں پر ڈال دوں گا۔ تمہارے شہر ویران کر دوں گا۔ وبائیں بھیجوں گا۔ اور تم کو غیر قوموں میں پراگندہ کر دوں گا۔"

کتاب خروج کے مطابق خدا نے موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ کو اپنا کاہن مقرر کر دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ کہانت کا عہدہ نسل در نسل ہارونؑ کی اولاد کے لئے مخصوص ہے (یوروپ اور امریکہ میں COHEN ایک عام یہودی خاندانی نام ہے اور ان کنبوں کے بڑے بوڑھے اپنا سلسلۂ نسب ہارونؑ سے ملاتے ہیں۔) کچھ عرصے بعد یہود کے موروثی کاہن بے حد با اقتدار ہوئے (اسی زمانے میں ہندوستان میں برہمن پروہت اپنا زور باندھ رہا تھا اور ایران میں مجوسی موبد طاقت حاصل کرنے والے تھے) اس سلسلے میں انجیل میں ایک دلچسپ حکایت بھی موجود ہے کہ ایک اسرائیلی نے جس کا نام قورح تھا (اسلامی روایت کا قارون خزانے والا) گویا اپوزیشن پارٹی بنا کر ہارون کی کہانت کے خلاف موسیٰؑ سے سخت احتجاج کیا کہ "جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خدا اُن کے درمیان رہتا ہے۔ تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیوں گردانتے ہو؟" قصّہ مختصر دوسرے روز قہرِ الٰہی قورح پر نازل ہوا اور "زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور قورح اور اس کے گھر بار اور مال و اسباب کو نگل گئی۔" اور یہ واقعہ "بنی اسرائیل کے لیے یادگار ہوا کہ کوئی غیر شخص جو ہارونؑ کی نسل سے نہیں خداوند کے حضور بخور جلانے کے نزدیک نہ جائے تاکہ وہ قورح اور اس کے ساتھیوں کی طرح ہلاک نہ ہو۔ جیسا کہ خداوند نے اس کو موسیٰؑ کی معرفت بتلا دیا تھا۔"

(کتاب اعداد۔ باب ۱۶)

---

[1] مصر آفتاب پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ رع کی عبادت کے مشہور مرکز ہیلیو پولیس (یعنی سورج کا شہر) کا علاقہ آج بھی اسی نام سے قاہرہ کے فیشن ایبل مضافات میں شامل ہے۔

صحرا نوردی کے دوران خدا کے حکم سے موسیٰؑ نے اپنے بارہ اسباط کے سردار دشت فارانؔ سے آگے بھیجے کہ جو موعودہ ملک کنعان کا حال دریافت کر کے لائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے واپس آ کر رپورٹ دی کہ "جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں اور اس کے شہر بڑے بڑے اور فصیل دار ہیں اور ہم نے بنی عناقؔ کو بھی وہاں دیکھا۔ اس ملک کے جنوبیؔ حصے میں عمالقہؔ آباد ہیں اور حِتّیؔ اور یَبوسی پہاڑوں پر رہتے ہیں اور ساحل سمندر پر یردن کے کنارے کنارے کنعانیؔ بسے ہوئے ہیں۔ تب کالبؔ نے موسیٰؑ کے سامنے ان لوگوں کو چُپ کرایا اور کہا چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر تصرّف کر لیں۔ لیکن جو اور آدمی اس کے ساتھ گئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہم اس لائق نہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں۔ اور ہم نے بنی عناقؔ کو دیکھا جو جباروںؔ کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹِڈّے۔ اور ایسے ہی اُن کی نگاہ میں تھے[1]

"تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ رات بھر روتے رہے اور کُل بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ سے شاکی ہوئے اور کہا اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے۔ یا اس بیابان ہی میں موت آتی۔ تو کیوں ہمیں اس ملک میں لے جا کر قتل کروانا چاہتا ہے۔ تب موسیٰؑ اور ہارونؑ سجدے میں گرے۔ یشوعؔ بن نون اور کالبؔ بن یفنّہؔ جو حال دریافت کر کے آئے تھے اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر جماعت سے مخاطب ہوئے، وہ ملک نہایت اچھا ملک ہے اگر خدا ہم سے راضی ہے تو وہ ہمیں اس ملک میں جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے پہنچائے گا۔ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو، تب جماعت چلّائی کہ ان کو سنگسار کرو۔ اس خیمۂ اجتماع کے سامنے خدا کا جلال نمایاں ہوا۔ اور خداوند نے موسیٰؑ

---

[1] قصص الانبیا میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰؑ سے وعدہ کیا تھا کہ میں شامؔ تم کو دوں گا۔ تم جباروںؔ کو مار کر وہاں سے نکال دو۔ موسیٰؑ نے بارہ سردار نقیب کر کے شام کے اطراف میں بھیجے کہ احوال جباروںؔ کا دریافت کر کے آویں۔ جب عوجؔ بن عنق کے پاس گئے تو دیکھا کہ قد اُس کا تینتیس ۳۳ ہزار گز لمبا تھا (اور موصوف اُن سب کو مٹھی میں اُٹھا کر اپنی بی بی کے پاس لے گئے اور کہا سنتی ہو یہ مجھ سے لڑنے کو آئے ہیں اور مسز عوج بن عنق نے کہا کہ چھوڑ دے۔ وے ضعیف و ناتواں ہیں۔ واپس چلے جاویں گے۔

سے کہا یہ لوگ کب تک میری توہین کرتے رہیں گے اور میرے
پیغمبروں پر ایمان نہیں لائیں گے؟'' (کتاب اعداد باب ۱۳ و ۱۴)

چنانچہ خدا نے اُن کو یہ سزا دی کہ وہ چالیس سال تک بیابان میں بھٹکتے رہے اور مزید سرکشی اور نافرمانیاں کرتے رہے۔ اطراف کے حکمرانوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ اور موسیٰؑ کو جھڑ کے ستایا۔ انجیل کے مطابق وہ دشت صین میں آئے اور شہر قادص میں رہنے لگے۔'' اور وہاں موسیٰ ؑ کی بہن مریم نے وفات پائی اور وہاں پانی نہ تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل پھر موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے کہ مصر سے کیوں نکالا۔ تب موسیٰ ؑ اور ہارونؑ خیمۂ اجتماع کے آگے سجدے میں گرے اور خدا نے کہا اے موسیٰ ؑ اپنا عصا چٹان پر مار کر پانی نکال اور موسیٰ ؑ اور ہارونؑ نے جماعت سے پوچھا۔ اے باغیو کیا ہم تمہارے لئے اس چٹان سے پانی نکالیں؟ اور ضربِ کلیم نے چٹان سے پانی برآمد کیا۔ مگر موسیٰؑ اور ہارونؑ سے خدا نے کہا کہ چونکہ تم نے میرا یقین نہیں کیا کہ جماعت کے سامنے میری تقدیس کرتے اس لیے اپنی اُمت کو ملک موعودہ تک نہیں پہنچا پاؤ گے۔ پھر موسیٰؑ نے ادوم کے بادشاہ کے پاس ایلچی بھیجا کہ تیرا بھائی اسرائیل عرض کرتا ہے ہم تیری سرحد پر قادص میں ہیں۔ سو ہمیں اپنے ملک میں سے ہو کر جانے کی اجازت دے۔ ہم تیرے کھیتوں اور تاکستانوں میں سے ہو کر نہیں گذریں گے۔ نہ کنوؤں کا پانی پئیں گے اور اگر پیا تو اس کے دام دیں گے اور سیدھے سڑک سڑک نکل جائیں گے مگر بادشاہ اس عاجزانہ درخواست کے جواب میں فوج لے کر ان پر آن پڑا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اس کی طرف سے مڑ گئے اور ہارونؑ نے راستے میں انتقال کیا اور بحکم خدا موسیٰؑ نے عزرا بن ہارونؑ کو کہانت کا لباس پہنایا۔ پھر خدا کے حکم سے کنعانیوں کا قلع قمع کر کے بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کا راستہ لیا۔ مگر اُن کی جان اس راستے سے عاجز آ گئی۔ پھر انہوں نے برضائے الٰہی عموریوں کے علاوہ عوج بن عنق اور اس کے لشکر کا بھی بھرتہ بنا دیا اور موآب کے میدان میں یریحو کے مقابل خیمہ زن ہوئے۔ اور موآب۔ کا بادشاہ بالق بن صفور اُن کی کثرت سے خائف ہوا۔ عابد بلعم بن باعور نے اُن کے حق میں دُعا کی اور کہا۔ ''چٹانوں کی چوٹی پر سے وہ مجھے نظر آتے ہیں اور پہاڑوں پر سے میں اُن کو دیکھتا ہوں۔ دیکھ! یہ وہ قوم ہے جو اکیلی بسے گی اور دوسری قوموں کے ساتھ مل کر اس کا شمار نہ ہوگا۔ اے یعقوب! تیرے خیمے کیسے خوشنما ہیں وہ ایسے

قوموں کے ساتھ مل کر اس کا شمار نہ ہوگا۔اے یعقوب! تیرے خیمے کیسے خوشنما ہیں وہ ایسے پھیلے ہیں جیسے وادیاں اور دریا کے کنارے باغ اور خداوند کے لگائے ہوئے عود کے درخت اور ندیوں کے کنارے دیودار کے جھنڈ۔اور یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلے گا جو باقیماندہ قوموں کو نابود کرڈالے گا۔عمالقہ کا انجام بھی ہلاکت ہے اور قینی بھی خانہ خراب ہوگا اور اشور تجھے اسیر کر کے لے جائے گا۔ پرکیتم کے ساحل سے جہاز آئیں گے۔اور وہ اشور اور عبر دونوں کو دُکھ دیں گے۔ پھر وہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔اس کے بعد بلعم اُٹھا اور اپنے ملک کو روانہ ہو گیا۔"

مگر اب بنی اسرائیل نے جو موآب میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔موآبی خواتین کے چکّر میں پڑ کر بعل کی پوجا شروع کر دی۔اور سزا کے طور پر خدا نے اُن میں سے ۲۴ ہزار کو وبا میں ہلاک کر دیا بعد ازاں بحکمِ خدا موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی مردم شماری کروائی تا کہ اُن کے بارہ اسباط کو موعودہ زمین قرعہ ڈال کر میراث کے طور پر بانٹ دی جائے۔ پھر خداوند نے موسیٰؑ سے کہا اے موسیٰؑ تو عبارِیم کے اس پہاڑ پر چڑھ کر اس ملک کو جو میں نے بنی اسرائیل کو عنایت کیا ہے دیکھ لے اور جب تو اسے دیکھ لے گا تب تو بھی اپنے اجداد سے اپنے بھائی ہارونؑ کی طرح جا ملے گا۔ کیوں کہ دشت صین میں پانی کے چشمے پر تو نے میرے حکم سے سرکشی کی۔"اس کے خداوند نے یوشع کو موسیٰؑ کا جانشین مقرر کیا۔اور خدا سے اس مکالمے کے بعد جو چالیسویں برس کے گیارہویں مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔موسیٰؑ نے دشت موآب میں اپنی اُمت کو آخری بار احکام شرع سمجھائے اور کہا کہ اب خدا تمہیں کنعان پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔" اور مَیں نے خدا سے منّت کی کہ مجھے بھی یردن پار جانے دے تا کہ میں کنعان اور اس خوشنما پہاڑ اور لبنان کو دیکھ لوں لیکن خداوند تمہاری وجہ سے مجھ سے ناراض تھا اور اس نے میری نہ سنی اور کہا۔اے موسیٰؑ بس کر۔اس مضمون پر مجھ سے کبھی کچھ نہ کہنا۔تو پہاڑ پر چڑھ کر اس ملک پر نظر ڈال لے مگر تو یردن پار نہیں جانے پائے گا اور اب اے اسرائیل! جو آئین اور احکام میں سکھاتا ہوں اُن پر عمل کرو۔ اور خداوند تمہارا خدا رحیم و کریم ہے اور ابتدائے آفرینش سے اب تک اتنی بڑی واردات سننے میں کبھی آئی کہ کیا کبھی کوئی قوم خدا کی آواز جیسی تو نے سنی آگ میں سے آتی ہوئی، سن کر زندہ بچی ہے؟ یہ سب تجھے دکھایا گیا کہ خدا

کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ سن لے اے اسرائیل آج تجھے یردن پار اس لیے جانا ہے کہ مشرکوں کے سارے بُت توڑ ڈالے۔ خداوند تیرا خدا آگے آگے بھسم کرنے والی آگ کی طرح پار جا رہا ہے اور وہ ان اقوام کو فنا کر دے گا۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری صداقت کی وجہ سے خداوند تمہارا خدا اس ملک پر تمہارا تصرف کرنے والا ہے۔ وہ ان قوموں کو اُن کی شرارت کی وجہ سے تیرے آگے سے خارج کرتا ہے۔ پس اے اسرائیل خدا سے ڈر جو الٰہوں کا الٰہ ہے جو رُو رعایت نہیں کرتا نہ رشوت لیتا ہے اور تم اس کے احکام پر عمل کرو۔ تو لبنان سے اور دریائے فرات[1] سے مغربی سمندر تک تمہاری سرحد ہو گی۔ لیکن تو نے خُدا کی نافرمانی کی تو سلطنتوں کے بیچ مارا مارا پھرے گا اور تیرے تلوؤں کو آرام نہ ملے گا۔ میں تو آج کے دن ایک سو اکیس برس کا ہوں۔ میں اب چل پھر نہیں سکتا اور بحکم خدا یردن پار نہیں جا سکتا۔ اب یشوع تیرے آگے آگے پار جائے گا اور جب تو اس ملک میں پہنچے تو وہاں کے پھل خدا کے مذبح میں پیش کر کے کہیو کہ میرا باپ ایک ارمی تھا جو مرنے والا تھا وہ مصر میں جا کر رہا اس کی قوم تھوڑی سی تھی مگر وہ ایک زور آور اور کثیر التعداد قوم بن گیا اس وجہ سے مصریوں نے اسے دکھ دیئے اور خدا ہمیں وہاں سے نکال کر اس ملک میں لایا جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے۔ اے اسرائیل! خاموش ہو جا اور سن۔ تو آج کے دن خداوند اپنے خدا کی قوم بن گیا۔ لیکن تو جیتے جی میری جو نافرمانی کرتا رہا تو میرے مرنے کے بعد کیا کچھ نہ کرے گا۔ پھر موسیٰؑ نے کہا۔ سنو اے آسمانو اور اے زمینو! میں بولوں گا اور میری تعلیم مینہہ کی طرح برسے گی۔ میری تقریر شبنم کی طرح ٹپکے گی۔ جیسے نرم گھاس پر پھوار پڑتی ہو اور سبزے پر بارش کی جھڑیاں۔ اے کم عقلو! کیا خداوند تمہارا باپ نہیں جو یعقوب کو ویرانے، ہولناک بیابان میں ملا۔ اور جس نے بنی اسرائیل کی اس طرح حفاظت کی جیسے عقاب اپنے گھونسلے ہلا ہلا کر اپنے بچوں پر منڈلاتا ہے! مبارک ہے تو اسرائیل کہ خدا تیری سپر اور تیرے جاہ و جلال کی تلوار ہے۔ اس کے بعد موسیٰؑ کوہ بنو کی چوٹی پر چڑھ گیا جو یریحو کے مقابل ہے اور خدا نے ممالک موعودہ اسے دکھائے اور پھر خدا کے بندے موسیٰؑ نے وہیں موآب کے ملک میں رحلت کی اور اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فعوز کے مقابل دفن کیا گیا۔ پھر آج تک کسی انسان کو اس کی قبر کا علم نہیں۔ اور بنی اسرائیل اس کے لیے تیس دن تک روتے رہے اور اس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰؑ کی

---

[1] موجودہ اسرائیلی سامراج اُن ہی حدود کے خواب دیکھ رہا ہے۔

مانند جس نے خدا سے روبرو باتیں کیں، نہیں اُٹھا۔ (کتاب استثنا)

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد یوشعؑ کی قیادت میں بنی اسرائیل نے آگے بڑھ کر یریحو پر دھاوا بولا۔ ''اور اسرائیلی کاہنوں نے مینڈھے کے سینگوں کے قرنے یعنی نرسنگے اتنی زور سے پھونکے کہ یریحو کی مضبوط فصلیں گر گئیں۔'' پھر حملہ آوروں نے شہر کے باشندوں کو تہِ تیغ کیا۔ الا ایک طوائف رحب اور اس کے خاندان کے جس نے حملے سے قبل یوشعؑ کے بھیجے ہوئے دو جاسوسوں کی مدد کی تھی۔ بعد ازاں بنی اسرائیل نے عموریوں پر تسلط جمایا اور یوشعؑ نے پکارا۔ ''اے سورج تو جبعون پر ٹھہر۔ اے چاند تو وادیٔ ایالون پر تھم جا۔ اور سورج ٹھہر گیا اور چاند تھما رہا۔ جب تک قوم نے اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے لیا۔'' اس طرح متعدد قبائل پر جن کے سرداروں کی تعداد اکتیس تھی قوم اسرائیل نے فتح حاصل کی اور جب وہ جنگ کے لیے نکلتے تھے تو تابوت سکینہ ایک گدھا گاڑی میں رکھ کر اپنے اپنے آگے لیجاتے تھے اور جب یوشعؑ (جو اس دوران میں ایک حتّی لڑکی سے بھی شادی کر چکے تھے) بوڑھے ہوئے تو خدا نے کہا اے یوشعؑ تو بڈھا ہو گیا اور ابھی بہت سے ملک قبضہ کرنے کے لئے باقی ہیں اور ان باقی ماندہ ملکوں میں حتّی سلطنت تاراج کرنے والے بلقانی قبیلے یعنی فلسطینیوں کے زیرنگیں علاقے بھی شامل تھے اور بنی اسرائیل کی پیادہ فوج اس انڈو یوروپین قبیلے کا مقابلہ نہ کر سکی کیوں کہ اس کے پاس آہنی رتھ تھے (ان ہی رتھوں اور گھوڑوں کی وجہ سے انڈو آرین قبائل نے ہندوستان سمیت سارے مغربی ایشیا میں مقامی باشندوں کو زیر کیا تھا) پھر اپنے مفتوحہ علاقوں کو یوشعؑ نے قرعہ اندازی کے ذریعے قوم کے بارہ اسباط میں تقسیم کر دیا اور بیت شمس، بیت العمق، رامہ، تبول، بیروت، عرابہ، بصرو غیرہ وغیرہ اڑتالیس شہر اور گاؤں بنی اسرائیل کے تصرف میں آ گئے۔ یوشعؑ کے انتقال کے بعد اسرائیلیوں نے کنعانیوں سے لڑ کر یروشلم بھی لے لیا اور اسے آگ میں پھونک ڈالا۔ لیکن اب اس نامعقول قوم نے مقامی عورتوں سے شادیاں کر کے دوبارہ بعل پوجنا شروع کر دیا۔ تب خدا نے غصے میں آ کر انہیں شاہِ عروق کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ غرضیکہ بنی اسرائیل اسی طرح مستقل خدا سے بدعہدی کرتے رہے اور خدا ان کو وقتاً فوقتاً مختلف زور آور دشمنوں کے ہاتھ بیچتا رہا۔ یوشعؑ کے انتقال کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت خدا پرست قاضی کر رہے تھے مگر قوم اُن کو بھی برابر ستاتی رہی۔ اسی

زمانے میں بنیہ وبورہ پیدا ہوئیں جو ایک خاتون قاضی تھیں اور بنی افرائیم کے کوہستانی علاقے میں رامہ اور بیت ایل کے درمیان ایک کھجور تلے اپنی عدالت لگاتی تھی۔ اُن کی قیادت میں قوم اسرائیل نے رتھوں والے غنیم کو بھی شکست دی اور کنعان پر اس زبردست فتح کے بعد دبورہ نے گایا۔ اے بادشاہو۔ سنو۔ اے شہزادو۔ کان دھرو۔ میں خود خداوند کی مدح گاؤں گی۔ اے خداوند! جب تو شعیر سے چلا تو زمین کانپ اُٹھی اور آسمان ٹوٹ پڑا اور سینہ لرزنے لگا۔ اور بائیل کے ایام میں شاہراہیں سونی پڑی تھیں اور مسافر پگ ڈنڈیوں سے آتے جاتے تھے۔ اسرائیل میں حاکم موقوف رہے جب تک میں دبورہ برپا نہ ہوئی اور اسرائیل کی ماں سوکر نہ اُٹھی۔ نئے نئے دیوتا چن لیے گئے اور جنگ پھاٹکوں پر ہونے لگی۔ میرا دل اسرائیل کے حاکموں کی طرف لگا ہے۔ تم خداوند کو مبارک ہو۔ اے کہ تم جو سفید گدھوں پر سوار ہوتے ہو اور جو نفیس قالینوں پر بیٹھتے ہو۔ اور جو راستہ چلتے ہو۔ تیراندازوں کے شور سے دور پنگھٹوں پر خدا کا چرچا کرو۔ جاگ جاگ اے دبورہ۔ اُٹھ اے برق اپنی جنگی اسیروں کو باندھ لے جا۔ اے ابی نوعم کے بیٹے۔

اس کے بعد چالیس برس امن رہا۔ پھر خدا نے بنی اسرائیل کو ان کی بدکاریوں کے کارن پہلے بنی عمون اور پھر فلسطینیوں کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس زمانے سے فلسطینیوں نے اتنا زور باندھا کہ کنعان اُن ہی کے نام سے منسوب ہوکر فلسطین کہلانے لگا۔ ایک زبردست اسرائیلی پہلوان سمسون نے دلیری سے فلسطینیوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن ایک نہایت چارسوبیس خاتون دلیلہ پر (جو فلسطینی تھی) عاشق ہوکر اپنی اوقات گنوائی اور ملٹن کی نظم اور ہالی ووڈ کی فلموں کا موضوع بنا۔

۱۰۵۰ ق م میں فلسطینیوں سے بنی اسرائیل کی ایک بار پھر بڑی بھاری جنگ ہوئی اور فلسطینی تابوت سکینہ اُٹھا کر لے گئے۔ ''مگر اُن کے ساتھ جہاں جہاں تابوت سکینہ جاتا دبائیں پھیلتیں اور طرح طرح کی آفتیں آتیں۔'' چنانچہ ایک رات وہ چپکے سے اس متبرک صندوق کو واپس کر گئے پیغمبر زماں شموئیلؑ کی قیادت میں فلسطینیوں کو شکست ہوئی۔

زمین کا مالک بننے کے بعد بنی اسرائیل میں بھی بسلسلۂ زر زمین زن خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں بارہوں سباط کے سردار جن کو فتوحات کے صلے میں اراضی دی گئی تھیں ایک نوع

کے فیوڈل طبقے میں تبدیل ہو گئے اور عبرانی لفظ گیر یعنی فوجی سورما اب زمیندار کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔ آپس کے لڑائی جھگڑے بڑھے کیوں کہ ان دنوں اسرائیل میں کوئی بادشاہ نہ تھا اور ہر شخص اپنی من مانی کرتا تھا۔ (کتاب قضاۃ باب ۲۱) چاروں طرف بادشاہوں کی ریل پیل دیکھ کر بنی اسرائیل کو بھی بادشاہت کا شوق چرایا اور وہ رامہ میں حضرت شموئیلؑ کے پاس گئے اور اُن سے فرمائش کی کہ انہیں ایک عدد بادشاہ درکار ہے۔ شموئیلؑ نے ہی اس کے جواب میں قوم کو جو وارننگ دی اس سے عبرانی انبیاء کی شدید جمہوریت پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شموئیلؑ کو یہ بات بُری لگی اور اس نے خدا سے دُعا کی اور خدا نے شموئیلؑ سے کہا۔ ''جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اے شموئیلؑ تو اس کو مان کیوں کہ اُنہوں نے تیری نہیں میری تحقیر کی ہے کہ میں ان کا بادشاہ نہ رہوں۔'' اور شموئیلؑ نے بادشاہت کے طالبوں سے کہا جو بادشاہ تم پر حکومت کرے گا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو اپنے رتھوں کے لیے اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا۔ اور وہ اس کے رتھوں کے آگے آگے دوڑیں گے۔ اور وہ ان کو ہزار ہزار کا سردار اور پچاس پچاس کا جمعدار[1] بنائے گا۔ اور بعض سے ہَل جُتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا۔ اور تمہاری بیٹیوں کو اپنی عطر پاش کنیزیں اور باورچنیں بنائے گا۔ تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کے بہترین حصے چھین کر اپنے مصاحبوں کو دے دے گا۔ اور تمہارے ملازموں اور لونڈیوں اور شکیل جوانوں و گدھوں کو بے گار میں لگائے گا۔ تمہارے کھیتوں، تاکستانوں اور غلّوں کا دسواں حصہ خود وصول کرے گا۔ اور تم اس کے غلام بن جاؤ گے۔ اور جب تم اس بادشاہ کی فریاد کرو گے۔ تب خدا تم کو کوئی جواب نہ دے گا[2] مگر وہ لوگ ہرگز نہ مانے۔ چنانچہ شموئیلؑ نے ساؔل بن قیس بن ابی ایل (جو اپنے گمشدہ گدھوں کو تلاش کرتا شموئیلؑ کے پاس پہنچا تھا اور اسرائیل کا شکیل ترین جوان تھا) کے سر پر تیل اُنڈیل کر اسے بادشاہ بنا دیا۔ ساؔل بھی زندگی بھر فلسطینیوں سے جنگ کرتا رہا لیکن عمالقہ سے لڑائی کے سلسلے میں'' اس نے خدا کی نافرمانی کی اور خدا ساؔل کو بادشاہ کر کے ملول ہوا۔ تب اس نے شموئیلؑ سے کہا۔ اے شموئیلؑ تو کب تک ساؔل کے لیے غم کھاتا رہے گا۔ تو اپنے سینگ میں تیل بھر اور بیتؔ لحم میں یسّیؔ کے پاس جا میں نے اس کے بیٹوں میں

[1] یعنی منصب داری سسٹم شروع ہو جائے گا۔ [2] کتاب شموئیل باب ۸۔

سے ایک کو بادشاہ چنا ہے۔ شموئیلؑ نے کہا میں کیوں کر جاؤں گا۔ اگر سال نے سنا تو مجھے مار ہی ڈالے گا۔ خدا نے کہا ایک بچھیا لے جانا اور کہنا میں تو قربانی کے لیے آیا ہوں اور یسّی کو قربانی کی دعوت دینا۔ پھر میں تجھے بتا دوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ القصہ شموئیلؑ نے بیت لحم جا کر نوجوان گڈریے داؤدؑ بن یسّی کو مسح کیا۔ ادھر بھائی ساؔل باولے اور خفقانی ہو گئے اور دل بہلانے کے لئے بربط نوازوں کو طلب کیا۔ چنانچہ داؤدؑ بلائے گئے اور ساؔل اُن کا جانی دُشمن ہو گیا۔ اور داؤدؑ بھاگ کر رامہؔ میں شموئیلؑ کے ہاں پہنچے اور ساؔل نے اُن کے پکڑنے کو قاصد بھیجے اور قاصدوں نے دیکھا کہ نبیوں کا مجمع نبوت کر رہا ہے اور شموئیلؑ ان کا پیشوا بنا کھڑا ہے۔ تو خدا کی روح قاصدوں پر نازل ہوئی وہ بھی نبوت کرنے لگے۔ دوسرے قاصد آئے وہ بھی بنوت کرنے لگے۔ اس کے بعد داؤدؑ نے فلسطینیوں سے زبردست جنگ کی۔ ساؔل بھی ان سے لڑنے کو آیا۔ لیکن داؤدؑ نے اسے قتل نہ کیا۔ پھر وہ فلسطینیوں کے محاذ پر مارا گیا۔ اور خود داؤدؑ جالوت[1] پر فتح یاب ہو کر بادشاہ ہوئے۔

ساؔل کا دورِ حکومت ۱۰۲۰ ق م سے ۱۰۰۰ ق م تک ہے۔ اب دنیا ولادت مسیح سے قبل کے یک ہزار سالہ دور میں داخل ہو رہی تھی جس میں بڑی زبردست سیاسی تبدیلیاں پیش آنے والی تھیں۔ حضرت داؤدؑ کے عہد میں اسرائیل ایک طاقتور اور شاندار ریاست بن گئی۔ داؤدؑ نے یروشلم فتح کر کے صیہوؔن کے قلعے میں رہنا شروع کیا۔ ہمسایہ ریاست صور سے دوستی کی اور تابوت سکینہ کو اس شان و شوکت سے یروشلم میں لا کر رکھا کہ داؤدؑ اور اسرائیلؑ کا سارا گھرانا صنوبر کی لکڑی کے ساز اور ستار، بربط، دف اور جھانجھ بجاتے۔ اس کی نئی گاڑی کے آگے آگے چلے اور ایک روز داؤدؑ بادشاہ نے ناتنؔ نبی سے کہا کہ میں تو دیودار کے محل میں مقیم ہوں (یہ محل صور کے بادشاہ نے لبنان سے لکڑیاں اور کاریگر بھیج کر داؤدؑ کے لیے بنوایا تھا) اور خدا کا صندوق پردوں کے اندر رہتا ہے اور اس رات ناتنؔ نبی سے عالم رویا میں خدا نے کہا کہ جا میرے بندے داؤدؑ سے کہہ کر خداوند یُوں فرماتا ہے کہ کیا تو میرے رہنے کے لیے گھر نہ بنائے گا؟۔ کیوں کہ جب سے میں بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لایا آج تک کسی گھر میں نہیں رہا۔ بلکہ خیمہ اور مسکن میں پھرتا رہا ہوں۔ پھر حضرت داؤدؑ بت سبعؔ پر عاشق

---

[1] امریکہ کا یہودی پریس آج کل بڑے فخر سے اسرائیلی عرب جنگ کو داؤدؑ اور جالوت کی لڑائی کہہ رہا ہے۔

ہو گئے جو اسرائیلی فوج کے ایک حتّی سپاہی اوریاؔ کی بیوی تھی۔ حضرت داؤدؑ نے اوریاؔ کو
بنی عمون کے خلاف جنگ کے محاذ پر بھیج دیا اور بت سبعؔ (بطشا) کو اپنے حرم میں داخل کرایا اور
اُن سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ ۹۲۰ ق م میں داؤدؑ کی وفات کے بعد سلیمانؑ تخت
نشین ہوئے اور اُن کے دور میں اسرائیل کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ایک وقت تھا
جب خستہ حال بنی اسرائیل فرعون سے دہشت زدہ ہو کر مصر سے نکلے تھے۔ اب سلیمانؑ نے
اپنے حرم میں فرعون وقت کی بیٹی داخل کی۔ ایک حتّی شہزادی سے رشتہ جوڑا۔ ہند اور لنکا سے
تجارتی تعلقات قائم کیے۔ صور کے بادشاہ حیرام اعظم ۹۷۰ ۔ ۹۴۰ ق م نے صنوبر کی لکڑی
اور کاریگر بھیجے اور ایک عظیم الشان ہیکل تیار کیا گیا۔ ایک طاقتور بحریہ وجود میں آیا اور اسرائیل
کی شان و شوکت دولت ضرب المثل بن گئی مگر سلیمانؑ کے انتقال کے بعد خانہ جنگیاں شروع
ہوئیں اور شمال کے دس قبائل نے اپنی ریاست بنی اسرائیل سے الگ کر لی جس کا پایۂ تخت
سامریہ تھا۔ بنیامین اور یہوداہ کے قبیلوں نے جنوب میں یہودیہ کے نام سے اپنی حکومت قائم
کی اور اس کا صدر مقام یروشلم رکھا۔ دونوں ریاستوں میں عیاشی اور بُت پرستی کا دور شروع
ہو گیا۔ اسرائیل کے بادشاہ احب نے فنیقی شہزادی یزبیل سے شادی کی اور وہ اپنے دیوی دیوتا
ساتھ لائی۔ پیغمبر وقت الیاسؑ نے سماجی بے انصافی اور بعل پرستی کے خلاف بہت کچھ ڈانٹا
پھٹکارا۔ مگر کون سنتا ہے۔ بٹوارے کے بعد سے دونوں ریاستیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔ اور
اشوریہ نے اُن پر حملے شروع کر دیئے۔

عبرانیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر اب دوبارہ وادیٔ فراتؔ اور عیلامؔ اور
ایشیائے کوچک واپس چلئے۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ۸۵۰ ق م
میں سومیر سے کنعانؔ ہجرت سے ذرا قبل یوریشین اقوام ہُرّی قاضی حتّی وغیرہ نے
شمالی پہاڑوں سے نیچے آ کر اس علاقے میں جو بعد میں ایران اور اناطولیہ اور عراق کہلایا
خوب اودھم مچائی تھی اور قاصیوں نے عیلامؔ کو تباہ کر کے عروق پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔
اور اسی زمانے میں ایک انڈو ایرانی قبیلہ آ کر مقامی آبادیوں میں مدغم ہو گیا تھا۔ اس کے
بعد کی صدیوں میں عیلامؔ پھر طاقتور ہو گیا۔ اور تیرہویں اور بارہویں صدی قبل مسیح
(جب آلِ ابراہیمؑ مصر سے نکل کر کنعانؔ واپس گئے) عیلام شترخ نہونتے، کتیر۔نہونتے

۱ آج کل غالباً اسی عہد کے آثار کی کھدائی ہو رہی ہے جس کی کہانیؔ میں شائع شدہ خبر کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

اور شیلہک انشنگ تین بالکل نا قابل یقین ناموں والے بادشاہوں کا عہدِ زریں ہے۔ شترخ نہونتے اوّل نے عظیم الشان مندر اور عمارتیں بنوائیں۔ ۱۱۷۵ ق م میں بابل پر حملہ کر کے قاصیوں کی حکومت ختم کی اور مروت کا دیوزادبُت قوانین حمورابی کی الواح بابل سے شوش لے گیا لیکن حطی مصر اور حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اسرائیل کے انحطاط کے ساتھ مشرق اوسط میں طاقتی توازن پھر تبدیل ہو رہا تھا۔ اب اشوریہ نے صدیوں کے بعد دوبارہ زور باندھا اور اس کے خونخوار حکمرانوں نے ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اسی زمانے میں ایشیائے کوچک میں ایک نئی سلطنت قائم ہوئی جس کا نام ارارتو تھا (طوفان نوح والا ارارات اسی علاقے میں تھا) یہاں کے ایک زبردست بادشاہ ارم نے (آج تقریباً ہر چوتھے ارمنی کا نام ارم ہے) اشور کے سلم نصر سوئم سے ۸۵۸ ق م میں جنگ کی ارمی دیوتاؤں کے نام خالدی اور شیونی تھے) ارارات نویں صدی ق م میں اپنے عروج پر تھا (غالباً اہلِ ارارا تو ہی کی زبان نے قدیم فارسی کو متاثر کیا) بعد میں ارارات کو بھی اہل اشوریہ نے زیر کر لیا۔ اور عبرانی ریاستوں اسرائیل اور یہودیہ پر تباہ کن حملے کرنے میں جُٹ گئے۔

اسی زمانے میں اشوریہ کی وزارت جنگ کی گویا CLASSIFIED الواح پر دو نئے دشمنوں کے نام درج کیے گئے۔ اُمّن مندا یعنی مندا کی امت اور پرسوا۔

بارہویں گیارہویں صدی ق م ایک بار پھر قبائلی ہجرتوں کا دور تھا۔ اس مرتبہ جو دو آریہ یا انڈو یوروپین قبیلے پہاڑوں سے نیچے اُترے وہ مدآئی اور پرسوا کہلا رہے تھے۔ اُن ہی ذہین اور حیرت انگیز قبائل کی آمد کے ساتھ ایران کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے یہ پرسوا اور مدآئی جو اس وقت تو مشرقی یوپی کے دیہاتی سے نام لگتے ہیں۔ مگر اُن ہی کو قدیم یونانی مؤرخوں نے پرشین اور میڈین کہا۔ جو انڈو ایرانی قبیلہ ۲۰۰۰ ق م میں اس علاقے میں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو عیلامی اور مقامی آبادیوں میں مدغم کر لیا تھا۔ لیکن ان تازہ وارد قبیلوں کو اپنے آریہ پن کا شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے سارے ملک کو اپنے نام سے موسوم کر لیا اور اسے ایران کشتر اور ایران شہر پکارا۔ اپنی قبائلی روایات کے مطابق اُن کا نسلی مرکز شمال مغربی ایران یعنی ایریانہ وائیجا یا ایران ویج (ویج = بیج) تھا جو بعد میں آذربائیجان کہلایا۔ انہی کی وجہ سے موجودہ افغانستان آریانہ کے نام سے مشہور ہوا اور اُن کے بھائی

بندوں نے جو پہلے سے ہندوکش عبور کر کے پنجاب میں داخل ہو چکے تھے شمالی برِصغیر ہند کو آریہ ورت کہا۔

میڈین یا مادی قبیلے نے عیلام فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ میڈین جو قبائیں اور چمڑے کے خود اور نوکیلے جوتے پہنتے تھے (جو فی الحال پشاوری چپلوں کی شکل میں موجود ہیں) بادشاہ گری کے فن میں سب سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے تو اُن کے سرداروں نے بہت ہی ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا شروع کیا۔ اونچے چبوتروں پر محل بنوائے۔ مُردوں کو مروّجہ دستور کے مطابق مکان کے اندر دفن کرنے کے بجائے شہر سے باہر قبرستانوں میں سپردِ خاک کرنا شروع کیا۔ تاجر، کاریگر، غلام اور کسان کی طبقاتی تقسیم کی (اسی طرح کی درجہ بندی ورن آشرم اور جاتی کے نام سے آریہ ورت میں عمل میں آ چکی تھی) اور زبردست فوجیں آراستہ کیں اور مزید ملک گیری کے ارادے سے شرق اوسط کے دائمی میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ اشوریہ والا شاہ اشورنصرپال کوہِ دماوند تک پہنچ کر اُن سے خوب خوب لڑا۔ مگر میڈین بادشاہ خشترتھ (یہ بھی متانی وشرت اور بھارتی دسرتھ کا بھائی بند معلوم ہوتا ہے) اپنا دائرہ اور اقتدار وسیع کرتا گیا۔

ابھی گویا یہی بادشاہ لوگ ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے کے لئے کافی نہ تھے کہ اوپر سے سیتھین اور کیمرین (کہ کریمیا سے آئے تھے) قبیلوں نے آن کر ایران، اناطولیہ اور اسرائیل و یہودیہ میں بڑی سخت لوٹ مار مچائی۔ یہ حضرات نسب نامہ نوح کے مطابق یافث کی اولاد تھے (یاد کیجئے بنی یافث: گومر، کیمرین یا اہلِ کریمیا ماجوج مسک اور توبل یعنی بحیرۂ اسود کا بالائی علاقہ وغیرہ) جنوب کی متمدن زراعت پیشہ اقوام ہمیشہ ان شمالی صحرائی قبائل سے خائف رہیں۔ یہ سیتھین آئندہ صدیوں میں ہمیں مختلف علاقوں کے ساتھ بار بار ملیں گے۔ اُن سے بچنے کے لیے دیوارِ چین اور سدِ سکندری تعمیر کی گئی۔ اور اُنہی کی وجہ سے ایرانی اور تورانی آویزش شروع ہوئی۔ ہنگری اور وسطی یوروپ پہنچ کر یہ لوگ مگیار اور ہن کہلائے اور مشرق میں تورانی، تاتاری، ساکا، سیتھین، منگول یا مغول اور ترک (ایک ترک محقق کے خیال میں ۲۰۰۰ ق م میں یہ منگول آبنائے بیرنگ عبور کر کے شمالی امریکہ پہنچے اور وہاں کے اصلی باشندوں یعنی بے چارے ریڈ انڈین لوگوں کے مورث اعلیٰ بنے۔ امریکہ کی قدیم مایا اور

AZTEC تہذیبوں کی زبانوں میں بہت سے ترکی زبانوں سے مشابہ لفظ دریافت کیے گئے ہیں۔ ایک اور نظریے کے مطابق ایک اور وسط ایشیائی قبیلہ یوآچی غالباً عبرانی میں یاجوج بن گیا۔ حزقیل نے اسرائیل و یہودیہ پر سیتھین یلغار کے متعلق پیشین گوئی کی۔ ''پھر بارہویں برس میں مہینے کے پندرہویں دن پر مجھ پر خدا کا کلام نازل ہوا کہ اے آدم زاد واویلا کر۔ وہ جو زورآوروں میں سب سے توانا ہیں پاتال میں اُتر گئے۔ عیلام اور اس کا گروہ تلوار سے قتل ہوا۔ وہ جو روئے زمین پر ہیبت کا باعث تھا۔ اے آدم زاد جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین ہے۔ اور رُوش[1] اور اور مسک اور توبل کا فرمانروا ہے متوجہ ہو۔ اور اس کے خلاف نبوت کر۔ اور کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اے جوج رُوش، مسک اور توبل کے حاکم میں تیرا مخالف ہوں۔ میں تیرے جبڑوں میں آنکڑے ڈال کر تجھے اور تیرے مسلح لشکر کو کھینچ نکالوں گا۔ اور اُن کے ساتھ فارس، کوش اور جمر جو سب کے سب سپر بردار اور خود پوش ہیں۔ اے آدم زاد جُوج سے کہہ کہ جب میری امت اس میں بسے گی کیا تجھے خبر نہ ہوگی؟ تو شمال سے اپنے لشکر لے کر آئے گا اور میری امت کے مقابلے کو نکلے گا اور زمین کو بادل کی طرح چھپا لے گا۔ میں تجھے اسرائیل کے پہاڑوں پر چڑھا لاؤں گا تاکہ تو مجھے جانیں[2] '' اس زمانے میں عبرانیوں نے پھر بدکاری اور بُت پرستی شروع کردی تھی۔ چنانچہ یرمیاہ نبی نے سیتھین حملے کے متعلق کہا ___ ''خداوند فرماتا ہے اے برگشتہ اسرائیل واپس آ۔ اپنی بدکاری کا اقرار کر کہ تو ایک ہرے درخت کے نیچے غیروں کے ساتھ آوارہ پھری۔ پھر مجھے ترک کیا اور غیر معبودوں کے آگے لوبان جلایا۔ اے یہوداہ۔ اے یروشلم! پناہ لینے کو بھاگو۔ اور دیر نہ کرو۔ کیوں کہ میں ہلاکت شدید کو شمال کی طرف لاتا ہوں۔ شیر ببر جھاڑیوں سے نکلا ہے۔ قوموں کو برباد کرنے والا آرہا ہے تاکہ تیرے شہر ویران کردے۔ نرسنگا پھونکو۔ ٹاٹ اوڑھ کر ماتم کرو کیوں کہ اس وقت یوں ہوگا کہ بادشاہ اور سردار بیدل ہوجائیں گے۔ کاہن حیرت زدہ اور نبی سراسیمہ ہوں گے۔ تب میں نے کہا افسوس اے خداوند تو نے یروشلم کو یہ کہہ کر دغا دی کہ تم سلامت رہو گے حالانکہ تلوار جان تک پہنچ گئی ہے۔ دیکھو وہ گھٹا کی طرح چڑھ آئے گا۔ اس کے رتھ گردباد کی مانند اور اس کے گھوڑے عقاب سے تیز تر ہیں۔ واحسرتا! کہ ہم غارت

---

[1] روس۔
[2] کتاب حزقیل باب ۳۸

ہو گئے[1]۔ سیتھین حملہ آوروں نے خوب ہی تباہی مچائی مگر میڈیہ میں خشترتھ کے بیٹے نے اُن کو ٹھیک کر دیا اور اُن میں سے بہت سے کان دبا کر میڈین فوج میں بھرتی ہو گئے۔

خشترتھ نے کوہ الوند کے دامن میں ہگمتانہ یا ایکتانہ (موجودہ ہمدان) اپنا پُرشکوہ پایۂ تخت بنایا تھا ایران میں دریا ناپید ہیں جن کی وادیوں میں گنجان شہر بس سکیں۔ مختلف قبیلے آج تک دور دور بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک طاقتور بادشاہ کی مضبوط اور شاندار شخصیت پر ہی ان قبائل کی اطاعت اور اتحاد منحصر تھا۔ اس نکتے کو میڈین سرداروں نے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایرانی لینڈ اسکیپ چٹیل پن اور سختی سے اپنے آپ کو مماثل کیا اور سنگلاخ پہاڑوں پر چٹانوں میں اپنی قوت اور اقتدار کے سمبل تلاش کیے۔ اپنے مقبرے اونچی چٹانوں پر تعمیر کروائے اور پہاڑوں کی سلوں پر اپنے مجسمے ترشوائے (بھائی فرہاد جوئے شیر نکال لانے میں یونہی ایکسپرٹ نہیں ہو گئے تھے۔ اس وقت تک ایرانی خارا تراشی صدیوں پرانی ہو چکی تھی) میڈین عہد سے ایرانی شہنشاہیت کی ایک ایسی منفرد رمزیت قائم ہو گئی جو کہنے والے کہتے ہیں کہ آج تک موجود ہے۔

مجوسی اس میڈین قوم کے آبائی آتش پرست پروہت تھے اور چونکہ یہ بھی آذر بائیجان کے علاقے سے آئے تھے۔ اس وجہ سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اس خطے کا اصل نام آذر آبادکان یعنی آتش کدوں کا ملک تھا۔ یہ پروہت موگوش کہلاتے تھے۔ (بعد میں عربوں نے اُنہیں مجوس اور مغ کہا اور انجیل مقدس میں اُنہیں مجائی کہا گیا۔ یہ چونکہ ساحر بھی تھے۔ اس وجہ سے اُن کے نام سے لفظ میجک نکلا) آذر بائیجان زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کا ملک تھا۔ چٹانوں میں سے گندھک کے شعلے بلند ہوتے۔ موسمِ خزاں میں زمین سے فاسفورس کی ایسی لپٹیں نکلتیں جن کی روشنی خاموش راتوں میں دُور دُور تک پھیل جاتی۔ کیسپین کی سطح پر فاسفورس کے ایسے بلبلے پیدا ہوتے رہتے۔ انواع و اقسام کی اس خنک، بے ضرر اور نظر فریب آگ نے مقامی باشندوں کو بہت متاثر کیا۔ جو بظاہر خود بخود پیدا ہو جاتی تھی۔ (''خدا'' جو خود بخود پیدا ہوا) یہی سرزمین پٹرولیم کے ذخائر کا وسیع خزانہ ہے جو روس سے لے کر ایران تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی جگہ یونانی دیومالا کے ہیرو پرومتھیس کو آسمانی آگ

---

[1] کتاب یرمیاہ باب ۳۰ و ۵۱

چُرانے کے جُرم میں ایک چٹان سے باندھ دیا گیا تھا۔ سرد علاقوں میں رہنے والوں کے لیے آگ یوں بھی بڑی نعمت تھی (صحرا کی ٹھنڈی رات میں موسیٰ آگ لینے گئے تو پیمبری مل گئی، چنانچہ آذر بائیجان کے باشندوں نے آگ کو مظہر الٰہی قرار دیا۔ بعد میں ایران کے سرسبز گلزاروں اور اُن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے چٹیل تکلیف دہ بنجر میدانوں کے تقابل نے نظریہ خیر و شر کو تقویت پہنچائی (اسی طرح وسط ایشیا کے بیکراں آسمانوں کے نیچے سرگرداں منگول قبائل نے ''آسمان'' کو معبود خاقان چین نے فوراً خود کو فرزندِ فلک مان لیا۔ ہندوستان کے کشان راجہ بھی جو مغربی ایشیا سے آئے تھے اپنے آپ کو ''آسمان کا بیٹا'' کہتے تھے۔ غالباً اسی کشان تصوّر سے متاثر ہو کر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا پکارنا شروع کیا (ہندوستان میں فلورا اینڈ فانا کی بہتات سے لوگوں کو ہر شئے میں بھگوان نظر آئے) مجوسی دخمے تعمیر کر کے اپنے مُردے چیلوں کوؤں کو کھلاتے تھے جو ایک بہت قدیم وسط ایشیائی دستور تھا۔

میڈین بادشاہ خشترتھ ۶۵۳ ق م میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس اثنا میں کلدانیہ اشور سے زیادہ طاقتور ہو چکا تھا۔ چنانچہ خشترتھ کے فرزند اور جانشین ہودخ شتر نے بابل کے شاہ بنوپلصر سے اتحاد کر کے نینوا پر حملہ کر دیا۔ ۶۲۵ ق م میں مادی اور کلدانی افواج نے نینوا کو نذرِ آتش کر دیا۔ اور ۶۱۴ ق م تک اشور نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اِدھر سے نچنتی پا کر مادیوں نے ۵۹۰ ق م میں ارارتو کا بھی فیصلہ کر دیا۔ جس کے بعد سے یہ علاقہ آرمینیہ کہلانے لگا کہ اس کے باشندے اناطولیہ کے ضلع ارم سے آئے تھے۔

لیکن اب میڈیہ یا ماوا کا بھی انت ہونے والا تھا کیوں کہ اس کا ساتھی، جنوب کا پارسی قبیلہ ان سے زیادہ زور پکڑ چکا تھا۔

پہلے بڑے پارسی سردار ہنجامنش کے وارث چش پش (۶۷۵ ق م۔ ۶۴۰ ق م) اپنی مملکت اپنے دو لڑکوں میں تقسیم کر کے آریہ رمنا کو پارسا اور کوروش اوّل کو بختیاری کا دامنی علاقہ پرسومش سونپ دیا۔ آریہ رمنا (۶۴۰ ق م۔ ۵۹۰ ق م) نے خود کو شاہان شاہ کہلوایا۔ اس کے طلائی سکّوں پر جو سوش سے برآمد ہوئے ہیں لکھا ہے کہ ''بہترین گھوڑوں اور انسانوں والا پارسیوں کا ملک جس کا میں آقا ہوں مجھے اہورمزدہ نے عطا کیا۔'' آریہ رمنا کے بعد اس کے بیٹے آرشا کو غالباً اس کے چچازاد بھائی یعنی پرسومش کے حاکم کوروش اول کے لڑکے کمبوجیہ

اوّل نے معزول کر کے خود پارسا پر قبضہ جمالیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سائیرس اعظم کی تخت نشینی کے وقت آرشا کا بیٹا گشتاسپ ایک صوبائی گورنر تھا۔

پارس کا بادشاہ بننے کے بعد کمبوجیہ اوّل نے اپنے حریف شاہ ماوا استیاجیز کی لڑکی سے شادی کی۔ اور اس بچے نے جنم لیا جسے تاریخ نے سائرس اعظم کے نام سے یاد رکھا ہے اور جسے ایرانیوں نے کوروش بزرگ اور یہودیوں نے مسیح خورس پکارا۔

عالمگیر ہنخامنشی سلطنت کا بانی سائیرس ایران کا کلچر ہیرو ہے۔ اور متعدد افسانوی روایات اس سے منسوب ہیں۔ ہیروڈوٹس کے مطابق جابر اور ستم پیشہ استیاجیز نے خواب میں دیکھا کہ اس کا نواسا سائیرس اسے قتل کر دے گا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جائے (فرعون و موسیٰ ۔ راجہ کنس و سری کرشن کی بازگشت) لیکن دانا اور رحم دل وزیر نے شہزادی کے نوزائیدہ بچے کو گڈریے کے ہاں بھجوادیا، جہاں پہاڑوں میں اس کی پرورش ہوئی (نیک اور عادل بادشاہ کے بچپن میں گڈریوں کے ہاں پرورش کا موتیف ایرانی روایات میں صفوی دور تک باقی رہا) بڑے ہو کر سائیرس نے اپنے ظالم نانا کے خلاف بغاوت بلند کیا۔ اور اسے شکست دی میڈیہ اور پارس کو متحد کرنے کے بعد خود بھی ایک میڈین شہزادی سے شادی کر لی۔ ماوی پایۂ تخت ایکتبانہ سے علیحدہ دشتِ مرغاب میں پسارگاد آباد کیا۔ (غالباً پس ارکاوش پہاڑ کے پیچھے) لیکن اس کے دربار میں عیلامی اور میڈین قبائیں اور فل بوٹ ترک نہیں کیے گئے اور میڈین روایات برقرار رہیں۔ متعدد ماوی اصطلاحات قدیم فارسی یعنی ہنخامنشی زبان میں شامل ہوگئیں۔ مثلاً خشایا تھیہ (یعنی شاہ) ماوی صوبوں کے گورنر کے لیے لفظ خشتر بان یونانی میں SATRAR اور ہندوستان میں کھشتراپ اور مہاکھشتراپ کہلایا۔

" آدم کوروش خشایتھ ہنخامنشیہ ۔ میں ہوں کوروش ۔ بادشاہ ۔ ہنخامنشی ۔" دشتِ مرغاب میں بکھرے ہوئے شکستہ ستونوں پر قدیم ترین زبانوں میں لکھے سائیرس اعظم کے کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ اسی دشتِ مرغاب میں کوروش نے اپنے نانا استیاجیز کو شکست دے کر ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ ایک بابلی کتبے میں آخری کلدانی بادشاہ جنوذی نس کے لیے لکھا ہے کہ اس کے عہد کے چھٹے سال (یعنی ۵۵۰ ق م) میں شاہ اشت میگو نے سائیرس پر چڑھائی کی لیکن ماوی فوج نے بغاوت کر دی اور بادشاہ کو قید کر کے سائیرس کے

حضور میں لے گئے۔ سائیرس نے اگمتانور (ہگمتانہ ایکتبانہ) پر حملہ کر دیا اور اس کی دولت لوٹ کر اپنے ملک انشان لے گیا۔ انشان غالباً پارس کا ایک قدیم نام تھا۔ کیوں کہ سائیرس اپنے کتبے میں خود کہتا ہے کہ وہ کمبوجیہ کا فرزند، شہنشاہ انشان کا حکمراں، کوریوش کا پوتا اور چش پش کی اولاد ہے اور اس کے خاندان نے ہمیشہ فرمانروائی کی۔

ماوا سے نپٹ کر سائیرس کشور کشائی پر نکلا اور اشور، ارارتو، لیڈیا اور بابل پر قبضہ کر کے پھر اعلان کیا۔ آم کوروش خشائتھ، ہخامنشیہ۔ وغیرہ۔ میں ہوں کوروش۔ سارے عالم کا فرمانروا۔ شہنشاہ بابل۔ لیکن اس گھن گرج سے پہلے کوروش کی آمد سے قبل ہمیں ایک مقدس آواز سنائی دیتی ہے۔ "قوموں کے درمیان منادی کر دو۔ بابل لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا اور مروک سراسیمہ۔ اور اس کے بُت بہت خجل ہوئے کیوں کہ اتر سے ایک قوم چڑھتی ہوئی آ رہی ہے جو اس کی سرزمین اُجاڑ دے گی۔"

یرمیاہ نبی کی اس بشارت کے ساتھ ہم پھر فلسطین واپس پہنچتے ہیں جہاں کوروش بزرگ کے دور تک عبرانیوں کے حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

عیلامی، حطی، مصر اور اسرائیلی انحطاط اور میڈیہ اور پارس کے عروج کے درمیانی وقفے میں اشور نے اپنی جارحانہ حرکتوں سے سارے شرق اوسط میں آفت مچا رکھی تھی۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد اسرائیل شمالی ریاست یہوداؔ میں بٹ چکا تھا جن میں یہودیہ نسبتاً زیادہ طاقتور تھا۔ چنانچہ اشوری حکمراں اس کی تباہی کے درپے ہو گئے اور مٹا کر ہی دم لیا۔ اشور نصر پال (۸۸۳۔ ۸۵۹ ق م) سلم نصر (۸۵۸۔ ۸۲۴ ق م) تگلت پلیسر سوئم (ایک ہی کافی تھا۔ مگر تین تین تگلت پلیسر ہوئے) سارگون، اصر حدون، اشور بنی پال تگلتی نزتا (کیا کیا نام ہیں) وغیرہ نے اپنے اپنے وقت میں بنی اسرائیل پر وہ قہر ڈھائے کہ عبرانی انبیاء نے اپنی نافرمان قوم کے آگے خدا کو بھی ایک قہرناک اور منتقم معبود کی حیثیت سے پیش کیا جس کا عذاب ان کفار کے مظالم کی صورت میں گمراہ ملت ابراہیم پر مستقل نازل ہوتا رہا۔

آلِ ابراہیمؑ اپنے ہادیوں کی مسلسل تنبیہہ کے باوجود غیر معبودوں کے آگے کیوں

ؔ اس ریاست میں حضرت یعقوبؑ کے چوتھے فرزند یہودہ کی اولاد یعنی بنی یہودا آباد تھے۔

جھلکتی تھی، پیغمبروں کی یہ اکثر ناکام رہبری ایک ترقی یافتہ روحانیت اور گردوپیش کے نیم وحشی مذہبی تصورات کی باہم کشمکش کی نمائندہ ہے اور انبیاء کی اس طویل جدوجہد اور تصور وحدانیت کے ارتقاء کا سُراغ ہمیں معبود کے لیے قدیم ترین سامی لفظ آل میں ملے گا[1]۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا حضرت ابراہیمؑ کے ظہور کے وقت متمدن دُنیا میں متعدد آریہ و غیر آریہ صنمیات کا دور دورہ تھا۔ عروق، کنعان و مصر میں مروک، عشتر، بعل، ایسس وغیرہ کی پرستش کی جارہی تھی۔ کنعانیوں کی دیبی عشرت عروق میں عشتر کہلاتی تھی۔ بعد میں ایران نے اسے افرادیت کہا۔ مولوخ کنعان کا بڑا خون آشام دیوتا تھا جس کے سامنے انسانی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں جابجا زیتون کے جھرمٹوں میں بعل کے بُت سجے تھے۔ اِل ان سارے بعلوں کا باوا تھا۔ الوئی ، الوہی، اللہ، رب معبود کے نام تھے۔ یہ "خدایان کہن، خدائے مصرو رب الیمن، ورب الفراق[2]" ضربِ کلیمؑ سے آزردہ ہونے والے تھے پر ابتدائی صدیوں میں ملّتِ ابراہیمؑ اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مصر کے طویل دورِ غلامی اور دشتِ نوردی کے مصائب نے البتہ رُوحوں پر جلا کی اور وحدانیت کا عقیدہ پختہ ہوتا گیا بابل، کنعان، مصر دولت مند عیش پرست شہری دیوی دیوتا تاریک مندروں میں مقیّد تھے۔ صحرا صحرا بھٹکنے والے خستہ حال عبرانیوں نے بیکراں ریگستانوں میں تجسیم سے بے نیاز لامکاں ذات مطلق پر غور و فکر کیا۔ مابعد الطبیعات کے اسٹیج پر پہنچے تو خدا کے لیے کسی نام کا استعمال بھی ترک کر دیا گیا یعنی اس قادرِ مطلق کو کمزور انسانی الفاظ میں کس طرح یاد کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کتاب خروج کے الفاظ یاد کیجیے جب موسیٰؑ نے جھاڑی میں آگ دیکھنے کے بعد خدا سے پوچھا کہ جب میں تیرے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کے پاس جا کر کہوں کہ تمہارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے تو میں اُن کو کیا بتاؤں؟ تب خدا نے جواب دیا کہ میں وہ ہوں جو میں ہوں۔ سو تو بنی اسرائیل سے یہ کہنا "میں وہ ہوں جو مَیں ہوں" نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اس دور میں اسمِ اعظم ایک انتہائی پُراسرار شے بن گیا۔ اور اس کی جگہ YHVH کا نشان بنایا جانے لگا جو غالباً سامی زبانوں کے "ہُو" ہونے یا وجود رکھنے سے مشتق تھا۔

---

[1] شہر بابل کا نام دراصل باب الی تھا یعنی خدا کا پھاٹک۔ چنانچہ قدیم بابل اور یو۔ پی کا شہر الٰہ آباد تقریباً ہم معنی ہیں۔

[2] جاوید نامہ۔

(دوسری سامی زبانوں کی مانند عبرانی میں حروف علت نہیں ہیں۔ چنانچہ عبرانی انجیل کے YHVH یعنی یاہ و یہہ[1] کو یوروپین زبانوں میں حروفِ علت کے ساتھ لکھا گیا اور جرمن میں اس کا ترجمہ:۔ JEHOVAH ہوگیا۔ اسی یہوواہ کے عیسائی مبلغ اور ''گواہ'' ہمیں چوراہوں پر اپنے اشتہار اور پمفلٹ بانٹتے نظر آتے ہیں۔)

کچھ عرصہ بعد عبرانیوں نے مزید تقدیس کے خیال سے لفظ یاہ و یہہ بھی ترک کر دیا اور خدا کو ارونائے (میرا آقا) کہنے لگے جس کا صدیوں بعد مغربی زبانوں کی اناجیل میں LORD کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔

چاروں طرف بُت پرستی کا زور تھا۔ لہٰذا عبرانی اب بھی اکثر ایک خدا اور کئی خداؤں میں گھپلا کر جاتے۔ اسی وجہ سے کتاب پیدائش کے ایک قدیم ترین نسخے میں الوہی کی جگہ اُلوہِم لکھا گیا ہے۔ یعنی الوہِم (خداؤں) نے چھ دن میں دنیا بنائی۔ الوہِم نے یہ کیا۔ وہ کیا۔ بت پرستی کی طرف راغب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یاہ و یہہ[2] کا تجریدی تصور بہ آسانی گرفت میں نہ آتا تھا اور بعل اور عشرت وغیرہ نہایت دلچسپ معبود تھے۔ جن کے مندروں میں دیوداسیاں بھی تھیں اور اُن کی عبادت کے ساتھ ساتھ خوب تفریح رہتی تھی۔ انبیاء نے ان کو بار بار منع کیا کہ کفار کی عورتوں کے ساتھ شادی نہ کرو مگر وہ ہرگز نہ مانے۔ پیغمبروں نے اُن کو یہ بھی سمجھایا کہ یاہ و یہہ نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی والی آزمائش کے بعد انسانی قربانی ہمیشہ

---

[1] پروفیسر فلپ حطی اور دوسرے مغربی مورخین کا خیال یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے صحرانوردی کے دوران میں جس عرب لڑکی سے شادی کی تھی اس کے قبیلے کا نام یاہ و یہہ تھا۔ یہ دیوتا ایک سُرخ خیمے کے اندر رہتا تھا۔ اور اسے جڑی بوٹیوں کی دھونی دی جاتی تھی۔ چنانچہ یہودی عبادت خانے کی قربان گاہ ''سوختنی قربانی'' ''خیمہ اجتماع'' جس میں تورات کا مقدس صندوق رکھا جاتا تھا، سب اسی عہد کہن کی یادگاریں ہیں جن کو حضرت موسیٰؑ نے برقرار رکھا۔

[2] اسی طرح ہندوستان میں جب برہما یعنی ان دیکھے خالق کا تصور بہت مشکل معلوم ہوا تو عوام نے ''حریم ذات'' کو اپنی پہنچ سے باہر سمجھ کر ''بت کدہ صفات'' آراستہ کر لیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں برہما کی مورتیاں شاذ و نادر ہی بنائی گئیں اور آج تک برہما کا مندر ایک آدھ جگہ پر ہی موجود ہے۔ پچھلی صدی کے بنگالی ہندو موحدین نے برہما ہی کی پرستش شروع کی اور اپنی جماعت کا نام برہمو سماج رکھا۔ اُن کی عبادت گاہوں میں صرف اوم کا نشان ہوتا ہے۔ آریہ سماجیوں نے بھی یہ کہہ کر مورتی پوجا کی شدید مخالفت کی کہ قدیم ویدک دھرم میں بت پرستی نہیں تھی۔

کے لیے منسوخ کردی ہے۔ مگر انہوں نے مولوخ کے سامنے بچے بھی قربان کیئے مصر میں گائے بیل پوجے جارہے تھے تو وے کیوں نہ سونے کا بچھڑا بناتے۔ فنِ سنگ تراشی نے بُت پرستی کو فروغ دیا تھا اسی وجہ سے شریعت موسوئی میں تصویر کشی وحجاری کی شدت سے ممانعت کی گئی اور ایمان بالغیب پر زور دیا گیا۔

پھر صحرا نشیں اور مصیبت زدہ عبرانی رفتہ رفتہ ایک سخت گیر اخلاقی ضابطے کا پابند بنا جس میں سنگساری ایسی سزائیں موجود تھیں (جو عرب میں آج تک رائج ہیں) اس کے برعکس شہری تمدن عیاشی میں ڈوب چکے تھے اسی وجہ سے عبرانیوں کے قائدین یعنی انبیاء نے ڈیکیڈنس سے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ اشوری بادشاہوں کے ذریعے خدا کے بھیجے ہوئے عذابوں سے قوم کو آگاہ کرتے رہے، اور راکھ میں بیٹھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر توبہ استغفار کرنے کی کوشش کی (اور اُن کی وجہ سے انگریزی میں MOOD OF PROPHET اور SACK CLOTH AND ASHES اور ''یرمیاہ کی نوحہ گری'' کی اصطلاحات رائج ہوئیں۔)

جس شاہی نظام کے متعلق شموئیل نے اپنی قوم کو خبردار کیا تھا وہ اب اسرائیل اور یہودیہ میں صدیوں سے قائم تھا۔ عبرانی سماج حکمران اور دولت مند طبقے اور پھٹے حال عوام اور غلاموں میں بٹ چکا تھا یاہ وپہ سے پہلے جس کا مسکن ایک سُرخ خیمے کے اندر تھا اب ایک عظیم الشان ہیکل میں مقید تھا جس کے کاہن بعل کے پجاریوں کی طرح حریص اور بے ایمان بن چکے تھے اور ESTABLISHMENT میں شامل تھے۔ اس زمانے میں اسرائیل اور یہودیہ کے غریب طبقے میں متعدد (پیغمبر پیدا ہوئے جنہوں نے عوامی لیڈروں کی حیثیت سے صدائے احتجاج بلند کی۔ مکاہ اور لسعیاہ بنی ''غریبوں کے والی'' کہلائے۔ یہ محنت کش اور خستہ حال انبیاء بادشاہوں کے محلوں میں پہنچ کر اُن کو ڈانٹتے پھٹکارتے، قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے اکثر قتل کیے جاتے۔ حضرت الیاسؑ چرواہے تھے۔ جو چمڑے کا پھٹا پُرانا لباس پہنے ہاتھ میں عصا لیے اچانک کہیں سے نمودار ہوجاتے اسرائیلؑ کی شاہی تقاریب میں پہنچ کر بادشاہ احب کو لعنت ملامت کرتے جس کی فینقی بیوی یزبیل نے بعل کی پرستش رائج کردی تھی۔ حضرت الیاسؑ بحکم خدا یوردون کے پاس نالے میں رہتے تھے اور کوے اُن کے لئے صبح شام روٹی اور گوشت لاتے تھے اور وہ نالے میں سے پانی پی لیا کرتے تھے، جب وہ نالہ سوکھ

گیا تو وہاں سے چل کھڑے ہوئے اور ایک بیوہ نے اُن کی خبر گیری کی اور ملکہ یزبیل نے (جو اپنے وقت کی مادام نوتھی) بہت سے انبیاء کو قتل کروادیا۔ تو باقی ماندہ نبیوں کو شاہ احب کے دیندار وزیر عبدیاہ نے ایک غار میں چھپادیا جہاں وہ اُن کو روٹی پانی پہنچاتا رہا تب ہی اس کو کہیں راستے میں گھومتے ہوئے حضرت الیاسؑ ملے اور پھر وہ احب کے پاس پہنچے اور بعل اور عشترت کے کاہنوں سے زبردست مناظرہ کیا۔ ادھر عموسؑ نبی اور ہوسیعؑ نبی نے اسرائیل کے باشندوں کو اشوریوں کی طرف سے خبردار کیا۔ آخر قہر اعظم ٹوٹ کر رہا۔ اشوریہ کے تگلت پلیسر سوئم نے ۷۳۳ ق م میں اسرائیل کو تاراج کردیا۔ سامریہ برباد ہوگیا اور اسرائیل میں بسنے والے دس عبرانی قبیلے جلاوطن ہوئے۔ کچھ قید کرکے نینوا لے جائے گئے۔ باقی نہ جانے کہاں کھو گئے[1]۔

اب حضرت یونسؑ نے جو غالباً پابجولاں نینوا لے جائے گئے تھے۔ فرات کے کنارے بسے ہوئے اس عشرت پرست شہر کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور وہی شکم ماہی اور کدو کی بیل والا قصہ رہا۔ اس قصے کے مطابق ایک بار تو اہلِ نینوا کے توبہ تلا کرنے پر عذاب ٹل گیا۔ مگر تاریخی واقعہ یہ ہے کہ دوسری بار عذاب آکر رہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ماوا کے شاہ ہووخ شتر نے بابل کے بنوپلصر کے ساتھ مل کر اشور پر دھاوا بولا۔ نینوا جلا کر راکھ کردیا گیا اور اشوری سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ زوال اشور سے عبرانی انبیاء جس قدر بھی خوش ہوتے کم تھا۔ لہٰذا سقوط نینوا پر شادمانی کلام کا اظہار ناحوم نبی کی زبانی سنیے۔ ''نینوا! دیکھ لوگ کس طرح بھاگے جارہے ہیں۔ کوئی پکارتا ہے ٹھہرو ٹھہرو۔ پر بھگدڑ میں کوئی مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ لوٹو۔ چاندی سونا خوب لوٹو۔ جہاں زرومال کی کچھ انتہا نہ تھی وہ دولت کدے اب سنسان پڑے ہیں۔ دل پگھل گئے گھٹنے ٹکراتے ہیں اور چہرے زرد ہوئے۔ صد حیف اے خونریز شہر! تو جو مالِ غنیمت سے پُر ہے اور پھر بھی لوٹ مار سے باز نہ آیا۔ مگر سنو! چابک کی آواز۔ پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ گھوڑوں کا اُچھلنا۔ رتھوں کے ہچکولے دیکھو! سواروں کا شب خون۔ تلواروں اور بھالوں کی چمک۔ لاشوں کے انبار ____ ! یہ اس خوبصورت فاحشہ جادوگرنی (نینوا) کی بدکاری کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ وہ قوموں کو اپنی بدکاری سے اور خاندانوں کو

---

[1] اسرائیل کے ان ہی گمشدہ قبیلوں کے لیے یہ روایت تیار ہوئی کہ افغان اور کشمیر اُن کی اولاد ہیں۔

اپنی جادوگری سے بیچتی ہے۔ تیرے قلعے اب انجیر کے درخت کے مانند ہیں جس کے پکے پھل درخت ہلاتے ہی کھانے والے کے منہ میں گر پڑیں۔ دیکھ تیرے مرد عورتیں بن گئے۔ تیری مملکت کے پھاٹک تیرے دشمنوں کے سامنے کھلے ہیں۔ آگ تیرے اڑبنگوں کو کھا گئی۔ اپنے محاصرے کے وقت کے لئے پانی بھر لے۔ گڑھے میں اتر کر مٹی تیار کر اور اینٹ کا سانچہ ہاتھ میں لے۔

وہاں آگ تجھے چٹ کر جائے گی۔ تو نے اپنے سوداگروں کو آسمان کے ستاروں کی طرح فراواں کیا۔ اب تیرے امراء ملخ اور سردار ٹڈیوں کا ہجوم ہیں جو سردی کے وقت جھاڑی میں رہتی ہیں اور جب آفتاب نکلتا ہے تو اُڑ جاتی ہیں اور اس کا کوئی ٹھکانا نہیں جانتا۔ اے شاہ اشور۔ تیرے چرواہے سو گئے تیرے سردار لیٹ رہے۔ تیری رعایا پہاڑوں پر پراگندہ ہوئی۔ تیری شکستگی لاعلاج اور تیرا زخم کاری ہے۔ تیرا حال سن کر لوگ تالیاں بجائیں گے کیوں کہ کون ہے جس پر ہمیشہ تیری شرارت کا بار نہ رہا؟'' (عہد نامہ قدیم۔ کتاب ناحوم)

ریاست اسرائیل کو اشور نے ختم کیا تھا۔ اشوریہ کی کلدانیہ یا بابل نے بیخ کنی کی۔ اب بابل کا مقابلہ دوسری عبرانی ریاست یہودیہ سے ہوا جس کا پایہ تخت یروشلم تھا۔ یہاں بھی لہو و لعب، بت پرستی اور مظالم کی فراوانی تھی اور یہیں ہمیں حزقیل اور یرمیاہ نبی ملتے ہیں۔

حزقیل کا دورِ نبوت ۵۹۸ ق م سے ۵۷۱ ق م ہے۔ سقوط یروشلم سے گیارہ سال قبل بخت نصر کے پہلے حملے کے بعد اسیر کر کے بابل لے جائے گئے تھے۔ ان کی پیشن گوئی سنئے۔ '' جب میں تل ابیب میں نہر کبار کے کنارے اسیروں کے درمیان بیٹھا تھا تو آسمان کھل گیا۔ اور میں نے خدا کی رویتیں دیکھیں اور میں سات دن تک وہاں پریشان بیٹھا رہا اور مجھ پر وحی آئی کہ اے ابنِ آدم بنی اسرئیل کی رُخ کر اور پیش گوئی کر کہ خاتمہ آن پہنچا۔ ہنگامے کا دن قریب ہے۔ خدا زبردستوں کا غرور مٹائے گا۔ بلا پر بلا اور افواہ پر افواہ آئے گی۔ تب وہ نبی سے رویا تلاش کریں گے لیکن شریعت کاہن سے اور نصیحت بزرگوں سے جاتی رہے گی۔ پھر مجھے (عالم رویا) میں یروشلم کے شمالی پھاٹک کے اندر کا بُت خانہ نظر آیا جس میں بنی اسرائیل کے اصنام دیواروں پر منقش تھے اور ستر اشخاص اُن کے آگے عود دان لیے کھڑے تھے۔ اور خدا نے کہا اے فانی انسان تو نے دیکھا کہ اسرائیل کے بزرگ اپنے منقش کاشانوں

کی تاریکی میں کیا کر رہے ہیں؟ پھر مجھے ہیکل کا اندرونی صحن نظر آیا جس میں لوگ آفتاب کے رُخ سجدہ کر رہے تھے۔ اور خدا نے کہا اے ابنِ آدم اسرائیل اور یہودیہ کی بدکاری بہت عظیم ہے۔ ملک خونریزی اور بے انصافی سے معمور ہو چکا ہے۔ اے ابنِ آدم تو ایک باغی گھرانے میں رہا۔ جن کی آنکھیں ہیں اور دیکھتے نہیں کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ لہٰذا اے فانی انسان! رختِ سفر باندھ اور دن کو یہاں سے نکل جا۔ ان لوگوں کے سامنے اپنا سامان مکان سے نکال۔ اسے اپنے کندھے پر رکھ کر اندھیرے میں نکال لے جا اور اپنا چہرہ ڈھانپ لے تاکہ زمین کو نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ تب ندا آئی اے ابنِ آدم کیا میرے باغیوں نے تجھ سے پوچھا کہ تو کیا کرتا ہے؟ ان کو جواب دے کہ یہ سامان یروشلم کے حاکموں اور بنی اسرائیل کے لیے بارِ نبوت ہے۔ جیسا میں نے کہا ویسا ہی اُن کے ساتھ ہوگا۔ وہ جلاوطن اور اسیر ہوں گے اور اُن کا حاکم شام کے اندھیرے میں اپنا سامان کندھے پر اُٹھائے ہوئے نکل جائے گا۔ اے ابنِ آدم تو تھرتھراتے ہوئے روٹی کھا اور فکر مند ہو کر پانی پی اور لوگوں سے کہہ کہ وہ بھی اسی طرح لختِ جگر کھائیں گے اور خونِ دل پئیں گے۔ اے ابنِ آدم کیا اسرائیل میں یہ مثل جاری ہے کہ وقت گزرتا جاتا ہے اور کسی رویا کا نتیجہ نہیں نکلتا؟ تو اُن سے کہہ دے کہ ہر رویا کا انجام قریب ہے اے ابنِ آدم! یروشلم کو مخاطب کر کے کہہ: زمین کنعان تیرا مولد ہے۔ تیرا باپ عموری تھا اور ماں حِتّی۔ اپنی اس ولادت کی وجہ سے تجھے قابلِ نفریں سمجھ کر پھینک دیا گیا مگر میں نے تجھے چمن کے شگوفوں سے ہزار چند بڑھایا تھا۔ جب تو جوان ہوئی تو تجھے آراستہ کیا۔ تیری ناک میں نتھ اور کانوں میں بالیاں پہنائیں۔ تجھے کتان اور ریشم میں ملبوس کیا اور تو حسین اور اقبال مند لگنے لگی ملکہ بنی۔ مگر تو نے اپنی خوبصورتی پر تکیہ کیا اور اپنی شہرت کے وسیلے سے بدکاری کرنے لگی اور جس کا تیری طرف سے گزر ہوا اسی کی ہو رہی۔ تو نے میرے بچوں کو ذبح کر کے بتوں کے آگے ڈالا۔ تو نے مصریوں، اشوریوں اور قاصیوں کے ساتھ عیاشی کی تو طوائف نہیں بلکہ بدچلن بیوی کی مانند ہے جو شوہر کے عوض غیروں کو قبول کرے۔ تُو تو اُن کو خود اُجرت دیتی ہے۔ تُو تو اپنی بڑی بہن سامریہ اور چھوٹی بہن سدوم سے بھی گئی گزری ہوگئی۔ سامریہ اپنے اشوری ہمسایوں اور اُن کے بتوں پر عاشق ہوئی۔ اُن کے سردار اور حاکم دل پسند بانکے نوجوان تھے جو گھوڑوں پر سوار ہوتے اور ارغوانی پوشاک پہنتے

تھے۔ چنانچہ میں نے اسے اشوریوں ہی کے حوالے کردیا۔ تو نے یروشلم کے دیواروں پر شنگرف سے کھینچی ہوئی قاصی جوانوں کی تصویریں دیکھیں جو پٹکے اور رنگین پگڑیاں باندھتے تھے۔ چنانچہ اب میں تجھے اُجاڑ دوں گا۔ وہ اسلحہ جنگ اور رتھوں اور خود پوش انبوہ کثیر کے ساتھ تجھے گھیر لیں گے۔ تیرے رنگ محل ڈھادیں گے۔ تیرے ستاروں اور بربطوں کی آواز پھر نہ سنی جائے گی۔"

اب ہم یرمیاہ نبی کی طرف آتے ہیں جن کی نوحہ گری اُدب عالیہ کے حسین ترین نمونوں میں سے ایک ہے۔

یرمیاہ نبی ایک نہایت سوئیٹ بزرگ تھے۔ انہیں اپنی بصیرت اور دردمندی کی وجہ سے دورِ جدید کے VISIONARY اور قوم پرست سیاسی قائدین کا پیش رو سمجھا جا سکتا ہے بے حد حساس اور شاعر مزاج یرمیاہ نبی کی تحریریں عہد نامہ قدیم میں پہلی بار صوفیانہ وارداتِ دل، حضورِ قلب اور سوزِ دروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ آپ ایک شعلہ بیان خطیب اور مقرر بھی تھے جن کو حکومت کا دباؤ کبھی خاموش نہ کر سکا۔ خود کاہن تھے مگر اقتدار پرست کاہن ان کے خلاف ہو گئے اور اُن کو غداری کے الزام میں قید کروا دیا۔ زنداں میں بھی یرمیاہ نبی کب خاموش بیٹھنے والے تھے وہ اپنی کال کوٹھری سے گویا جو شیلے لیڈنگ آرٹیکل لکھ لکھ کر یہودیہ کے بادشاہ صدقیاہ کو بھجوایا کیے جن کو بادشاہ اطمینان سے بغیر پڑھے نذرِ آتش کرتا رہا۔ اُنہیں قید خانے کے حوض میں لٹکایا گیا۔ طرح طرح کی ایذا پہنچائی گئی۔ جب وہ قید سے باہر نکلتے تو پبلک اُن کا مذاق اُڑاتی۔ اس وقت ___ وہ فرمایا کرتے ___ "اے خدا تو مجھے جانتا ہے۔ مجھ پر کرم فرما۔ اور مجھے ستانے والوں سے میرا انتقام لے کہ میں نے تیری خاطر ملامت اُٹھائی ہے۔ میں خوشی منانے والے کی محفل میں بیٹھا اور شادماں نہ ہوا۔ اگر میں باہر میدان میں جاؤں تو وہاں تلوار کے مقتول ہیں۔ میں شہر میں داخل ہوں تو وہاں کال کے مارے ہیں ___ خداوندا کیا تو میرے لیے سراب ہو گیا ہے اس پانی کے مانند جسے قیام نہیں؟ خدایا! دن بھر لوگ میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ جب میں اپنی تقریر میں تیرے غضب اور ہلاکت کا اعلان کرتا ہوں تو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں مگر میں کیوں اس کا ذکر نہ کروں جس کا کلام میرے دل میں آگ کی طرح شعلہ زن ہے۔ میں ضبط کرتے کرتے تھک گیا۔ اور چاروں طرف

دہشت ہے۔''

یرمیاہ بن حنفیاہ کے مزید ارشادات سنیے جو'' بنیامین کی مملکت کے عنتوتی کاہنوں میں سے تھا۔''

''اور وہ رب الافواج فرماتا ہے (اے نبی یہوداہ) میں نے تو نہایت عمدہ بیج بویا تھا تو کیوں میرے لیے جنگلی انگور بن گئی؟ تیری اپنی تلوار سے تیرے انبیاء قتل ہوئے۔ایک کنواری اپنے زیور اور ایک دلہن اپنے آرائش نہیں بھول سکتی لیکن میرے بندے مجھے بھول بیٹھے (اور یرمیاہ نے کہا) ہائے میرا دل! میرے دل میں درد ہے۔ میرا دل بیتاب ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اے میری ناتواں جان۔ میں نے نرسنگے کی آواز اور جنگ کی للکار سن لی ہے۔شکست پر شکست کی خبریں آرہی ہیں۔ ملک برباد ہوگیا۔ میرے خیمے اور پردے غارت کیے گئے۔ میں نے زمین پر نظر کی اور اسے ویران پایا اور آسمان بے نور ہوگیا۔ پہاڑ لرز اُٹھے۔جنگلوں کے طیور اُڑ چکے۔میں نے دختر صیہون کی آواز سنی ہے جو ہانپتی ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتی ہے ہائے قاتلوں کے سامنے میری جان بیتاب ہے اور رب العالمین فرماتا ہے اے اسرائیل اور یہودیہ کے بیوفا گھرانو! میں ایک قوم تم پر دور سے چڑھا لاؤں گا۔ جن کی زبان تم نہیں سمجھو گے جن کے ترکش کھلی قبریں ہیں۔وہ بلا کے تیرانداز اور نیزہ باز اور غضب کے سنگدل لوگ ہیں۔اُن کے نعروں کی صدا سمندر کی ایسی مہیب ہے۔ ملک میں جھوٹے نبی دعویٰ کرتے ہیں اور کاہن کے وسیلے سے حکمراں ہیں۔دن ڈھل رہا ہے اور شام کا سیاہ بڑھتا جاتا ہے۔یروشلم کے مقابلے میں دمدمے باندھو۔اے یرمیاہ! کیا تو نہیں دیکھتا کہ یروشلم کے گلی کوچوں میں دیویاں پوجی جارہی ہیں۔میں پہاڑوں کے لئے گریہ وزاری اور چرواہوں کے لیے نوحہ کروں گا۔میں یروشلم کو گیدڑوں کا مسکن بنادوں گا۔غارت گر پہاڑوں

پر پہنچ گئے اور کسی بشر کو سلامتی نہیں ۔ اے یروشلم اب کون تجھ پر رحم کرے گا؟ میں یہودیہ کو شاہ بابل کے حوالے کر دوں گا جو ان کو اسیر کر کے بابل لیجائے گا (اور یرمیاہ نبی نے کہا) میرا دل اندر سے ٹوٹ گیا۔ میں نے سامریہ کے جھوٹے غیب دانوں کی حماقت دیکھی ہے جنہوں نے بعل کے نام پر نبوت کی۔"

"وہ وحی جو دسویں برس میں جو بخت نصر کا اٹھارہواں برس تھا یرمیاہ پر نازل ہوئی جب شاہ بابل کے لشکر نے یروشلم کا محاصرہ کر رکھا تھا اور یرمیاہ شاہ یہودیہ صدقیاہ کے محل کے صحن میں مقید تھا اور یرمیاہ کی وحی اسیع منشی نے قلمبند کی اور بادشاہ کو بھیجی اور بادشاہ اپنے زمستانی محل میں آتش دان کے پاس بیٹھا تھا اور اس کے امراء اس کے چوگرد جمع تھے اور یرمیاہ کا صحیفہ اسے پڑھ کر سنایا گیا اور ابھی تین چار ورق پڑھے گئے تھے کہ بادشاہ نے اسے منشی کے قلم تراش سے کاٹا اور آتش دان میں جلا دیا (یرمیاہ نبی نے تین بار اسے اپنے صحیفے بھجوائے اور تینوں بار شاہ نے انہیں آگ میں پھینک دیا) فرعون مصر کی فوج نے حملہ کیا اور یرمیاہ یروشلم سے نکلا اور جب وہ بنیامین کے پھاٹک پر پہونچا تو داروغہ نے اس سے کہا تو قاصیوں کی طرف بھاگا جاتا ہے۔ اور یرمیاہ نے کہا۔ یہ سراسر بہتان ہے۔"

قصہ مختصر کسی نے ان کی نہ سنی اور ان کو پابجولاں مصر بھیج دیا گیا اس کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

طویل محاصرے کے بعد بخت نصر نے ۵۸۶ ق م میں یروشلم فتح کر لیا۔ شاہ صدقیاہ اور اس کے خاندان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ہزارہا عبرانی امراء، علماء، شہزادے اور کاریگر قید کر کے بابل بھیج دیئے گئے۔ یروشلم میں چند نادار، بدحال باقی رہ گئے تھے۔ بخت نصر نے سلیمانؑ کے خزانے لوٹ کر بابل بھجوا دیئے اور چونکہ عبرانی مفتوح نبی یہوداہ تھے اور ریاست یہودیہ سے قید ہو کر آئے تھے اس وقت سے عبرانی "یہودی" کہلانے لگے۔

اب یروشلم کا نوحہ سنئے۔ "وہ خاتونِ اقوام بیوہ ہوگئی۔ اس کے دوستوں نے اسے دغا دی۔ یہوداہ جلاوطن ہوا۔ اس کے پھاٹک سنسان ہیں اور کاہن آہیں بھرتے ہیں۔ اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں۔ اس کی اولاد کو دشمن اسیری میں ہانک لے گئے۔ دختر صیہون کی شان و شوکت جاتی رہی۔ اس کے امراء ان ہرنوں کے مانند ہیں جنہیں چراگاہ نہیں ملتی اور شکاریوں کے سامنے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اے خداوند مجھ پر نظر کر کہ میں ذلیل ہوگیا۔ تو نے مجھے اُن کے حوالے کیا جن سے مقابلے کی مجھ میں تاب نہیں۔ میری کنواریاں اور میرے جوان قید ہو کر چلے گئے۔ میری کاہن اور میرے بزرگ شہر میں کھانا ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلاک ہوگئے۔ باہر تلوار بے اولاد کرتی ہے۔ گھر میں موت کا سامنا ہے۔ خدا نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر گرا دیا۔ اور اپنے مذبح کو رد کیا۔ یروشلم کے دروازے زمین میں غرق ہوگئے۔ اور فصیلیں ماتم کرتی ہیں۔ میری آنکھیں روتے روتے دھندلا گئیں۔ اے دختر یروشلم میں تجھے کیا نصیحت کروں اور کس سے تشبیہ دوں؟ تیرا زخم سمندر سے زیادہ گہرا ہے کیا یہ وہی شہر ہے، جسے لوگ کمال حسن اور فرحتِ جہاں کہتے تھے؟ خدا نے تیرے مخالفوں کا سینگ بلند کیا۔ اٹھ اور پچھلے پہر کو فریاد کر۔ خدا میری گھات میں بیٹھا ریچھ اور کمین گاہ کا شیر ہے۔ اے خدا میں نے زنداں میں تیری دُہائی دی تھی۔ مری دختر قوم بیابانی شترمُرغ کی طرح بے رحم ہے۔ اس کی بدکاری سدوم کے گناہ سے بدتر ہے۔ اس کے شرفاء جو برف اور دودھ سے زیادہ اُجلے تھے اب اُن کے کالے چہرے بازار میں پہچانے نہیں جاتے۔ ہماری میراث بیگانوں نے لے لی۔ ہم نے اپنا پانی مول لے کر پیا اور لکڑی دام دے کر خریدی[1]۔ صحرانشینوں کی تلوار کے باعث ہم جان پر کھیل کر روٹی حاصل کرتے ہیں۔ صیہون کی بیٹیوں کو بے حرمت کیا گیا۔ جوانوں نے چکی پیسی اور بچوں نے گرتے پڑتے لکڑیاں ڈھوئیں۔ کوہ صیہون پر اب گیدڑ آوارہ ہیں۔"

بابل پہنچ کر عبرانی شعراء نے حسب معمول جس بے مثال انداز میں اظہارِ غم کیا وہ لحن نمبر ۱۳۷ میں ملاحظہ کیجیے۔ "ہم بابل کے پانیوں کے کنارے بیٹھے اور صیہون کو یاد کر کے روئے۔ وہاں ہم نے بید کے درختوں میں اپنے ستارا ٹکا دیئے۔ کیوں کہ ہمارے صیّادوں نے ہمیں گیت گانے کا حکم دیا۔ اے بابل کی بیٹی جو ہلاک ہونے والی ہے مبارک ہو

---

[1] بخت نصر کی افواج کے طویل محاصرہ کی وجہ سے۔

وہ شخص جو تجھے اس سلوک کا بدلہ دے جو تو نے ہمارے ساتھ کیا۔ مبارک ہو وہ شخص جو تیرے بچوں کو اُٹھا کر چٹان پر پٹخ دے۔''

بابل کی اسیری کے دور میں ہماری ملاقات ایک اور دلآویز شخصیت سے ہوتی ہے یعنی حضرت دانیالؑ!

''________ اور بخت نصر نے بیت اللہ کے طلائی ظروف اپنے بُت کدے میں داخل کیے اور اپنے خواجہ سراؤں کے سردار کو حکم دیا کہ مقید بنی اسرائیل کے شرفا اور دانشوروں کو تین سال تک قاصی علوم و زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ قصر شاہی میں حاضر ہو کر دربار میں کھڑے ہو سکیں اور ان قیدیوں میں دانیالؑ بھی شامل تھا۔ لیکن اس نے ارادہ کیا کہ وہ شاہی خوراک اور شراب سے خود کو ناپاک نہ کرے گا۔ اس نے خواجہ سرا سے درخواست کی کہ کھانے کو ساگ پات اور پینے کو سادہ پانی اسے مہیا کر دیا جائے اور دانیالؑ رؤیا اور خوابوں کی تعبیر میں صاحبِ فہم تھا اور بخت نصر نے اسے ملک کے تمام فال گیروں اور نجومیوں سے بہتر پایا اور وہ بادشاہ کے حضور میں کھڑا رہنے لگا۔ اور دانیالؑ شاہ خورس[1] کے پہلے سال تک زندہ تھا۔''

''اور بخت نصر نے اپنی سلطنت کے دوسرے سال ایسے خواب دیکھے کہ اس کی نیند جاتی رہی اور اس نے نجومیوں اور فال کھولنے والوں اور قاصیوں کو بلایا اور قاصیوں نے اسامی زبان میں کہا۔ اے بادشاہ ابد تک جیتا رہ ہم تیرے خواب کی تعبیر بتائیں گے۔ مگر وہ کچھ نہ بتا سکے۔ اور بخت نصر نے اُن کے قتل کا حکم دیا۔ اور تب بادشاہ کا وزیر دانیالؑ کو لے کر آیا اور عرض کی کہ اسیرانِ بابل میں ایک شخص مل گیا ہے جو تعبیر بتا دے گا۔ اور دانیالؑ نے بادشاہ سے کہا۔ حکماء اور نجومی اور ساحر کچھ نہیں جانتے مگر آسمان پر ایک خدا ہے جو راز کی باتیں آشکار کرتا ہے۔ تب دانیالؑ نے تعبیر بیان کی۔ کہ اے بادشاہ تو انسانوں میں سے ہانک کر نکال دیا جائے گا اور حیوانوں کی طرح رہے گا بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور آسمان کی شبنم سے تر ہو گا اور جب سات دَور گزر جائیں گے تب تجھے معلوم ہو گا کہ اصل بادشاہ حق تعالیٰ ہے جو جس کو چاہتا

---

[1] سائیرس اعظم۔

ہے دیتا ہے۔ اس لئے شاہا! میری درخواست قبول کر۔ اپنی خطاؤں اور مظالم کو دور کرتا کہ تیرے دل کو اطمینان میسّر ہو۔ ایک سال بعد ایسا ہی ہوا کہ بختؔ نصر کو آدمیوں میں سے نکال دیا گیا اور پھر یوں ہوا کہ اس کے بیٹے بیلشضرؔ نے ایک ہزار امراء کی دعوت کی اور شراب کے نشے سے مسرور ہو کر حکم دیا کہ وہ مقدس طلائی ظروف جو اُس کا باپ یروشلم کے بیتُ اللہ سے لوٹ لایا تھا۔ نکال کر لائے جائیں تا کہ شاہی مہمان اُن سے مے نوشی کریں۔ چنانچہ امراء اور شہزادیوں نے اُن کے برتنوں میں شراب اُنڈیل کر پی اور اُس کے بعد چوبی اور سنگی بتوں کی حمد کی۔ اسی وقت ایک انسانی ہاتھ کی اُنگلیاں ظاہر ہوئیں اور انہوں نے شمعدان کے مقابل محل کی دیوار کے گچ پر کچھ لکھا اور غائب ہو گئیں۔ بادشاہ کا رنگ فق ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے اپنے حکیموں اور نجومیوں کو بلایا وہ کچھ نہ پڑھ سکے۔ تب بادشاہ کی والدہ جشن گاہ میں آئی اور کہا اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ۔ تیری مملکت میں ایک شخص ہے جس میں قدوس الٰہوں کی روح ہے۔ اسے تیرے باپ نے نجومیوں فالگیروں اور قاصیوں کا سردار بنایا تھا۔ اسے بُلوا۔ تب دانیالؑ بلایا گیا اور بادشاہ نے اس سے پوچھا کیا تو وہی دانیالؑ ہے جو یہودیہ کے اسیروں میں شامل ہے۔ اس نوشتے کا مطلب بتلا۔ اور دانیالؑ نے پڑھا ''منے منے تقیل وفارسین۔'' شاہا اس کا مطلب یہ ہے کہ منے یعنی خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تقیل تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا۔ فارسین۔ تیری سلطنت تقسیم ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دی گئی۔ اسی رات بیلشضر قتل ہوا اور دارا مادی[۱] نے باسٹھ برس کی عمر میں سلطنت حاصل کی۔'' مزید بیلشضرؔ بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال مجھ کو دانیالؑ نے عالم رویا میں دیکھا جیسے میں قصرِ سُوسؔ میں ہوں جو عیلامؔ میں ہے۔ پھر دیکھا میں دریا کے کنارے موجود ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کا ایک سینگ دوسرے سے بڑا ہے اور وہ مغرب و شمال و جنوب کی طرف سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بکرا مغرب سے آ کر تمام روئے زمین پر پھر گیا اور اس کی آنکھوں کے درمیان ایک عجیب سا سینگ تھا اور مینڈھے پر قہر سے حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے۔ پھر جب وہ نہایت زور میں آیا تو اس کا بڑا سینگ ٹوٹ

---

۱ بیلشضرؔ بختؔ نصر کا پوتا اور بابل کے آخری بادشاہ بنودیؔ نس کا لڑکا تھا۔ تسخیر بابل کے بعد سائیرس اعظم نے اپنے ماموں داراؔ کو جو ایک میڈین شہزادہ تھا، بابل کے تخت پر بٹھا دیا۔

گیااوراس کی جگہ چار عجیب سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے۔ میں اس کی تعبیر کی فکر میں تھا کہ کیا دیکھتا ہوں جیسے ایک انسان صورت میرے سامنے کھڑا ہے۔اور پھر ندا آئی کہ اے جبرائیل اس فانی انسان کو اس رویا کے معنی سمجھادو۔ چنانچہ وہ انسان صورت میرے قریب آیا اور کہا اے ابنِ آدم سمجھ لے کہ یہ آخری زمانے کے متعلق ہے۔ جب وہ مجھ سے مخاطب تھا میں گہری نیند میں منہ کے بل زمین پر پڑا تھا۔لیکن اس نے پکڑ کر مجھے سیدھا کیا اور مجھے سمجھایا یہ دونوں سینگ مادا اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ جسیم بکرا یونان کا بادشاہ[۱] ہے اور اس کے سینگ ٹوٹ جانے کے بعد جو مزید چار سینگ نکلے وہ چار سلطنتیں ہیں جو شاہ یونان کی قوم میں قائم ہوں گی مگر اُن کا اقتدار اُن کا جیسا نہ ہوگا۔لیکن اے ابنِ آدم تو اس رویا کو بند کر کے رکھ کیوں کہ اس کا علاقہ مستقبل بعید سے ہے اور مجھ دانیالؑ کو غش آ گیا اور چند روز بیمار پڑا رہا اور پھر اُٹھ کر بادشاہ کے کاروبار میں لگ گیا۔ میں پریشان تھا لیکن کوئی میری پریشانی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

مزید: ''دارا ابن اخسویرس جو مادیوں کی نسل سے ہے اور قاصیوں کی مملکت کا بادشاہ ہوا، اس کی سلطنت کے پہلے سال مجھ دانیالؑ نے کتابوں میں ان برسوں کا حساب سمجھایا جن کے متعلق یرمیاہ نبی پر وحی آئی تھی کہ یروشلم کی بربادی کو ستر برس پورے گزریں گے اور میں نے قبلہ رو ہو کر مناجات پڑھی۔ روزہ رکھا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور دعا کی کہ خدایا۔ہم گنہگار تھے اور ہم کو سزا ملی۔اب اپنا قہر موقوف کر۔اور تب جبرائیل تیزی سے پرواز کرتا ہوا آیا اور نماز مغرب کے وقت اس نے مجھے چھوا اور کہا اے دانیالؑ میں اس لیے آیا ہوں کہ تجھے دانش و فہم بخشوں تیری مناجات کے شروع ہی میں حکمِ الٰہی صادر ہوا اور میں یہاں آیا ہوں تا کہ تجھے بتاؤں کیوں کہ تو بہت عزیز ہے کہ تیری قوم اور تیرے مقدس شہر کی بحالی کے لیے ستر ہفتے مقرر کیے گئے تا کہ خطا کاری کا خاتمہ ہو اور گناہوں کا کفارہ دیا جائے۔

> ''شاہ فارس خورس کے تیسرے سال مجھ دانیالؑ پر ایک بات ظاہر کی اور میں دانیالؑ ہفتوں تک ماتم کرتا رہا اور تین ہفتے بعد میں پہلے ماہ کی چوبیسویں تاریخ کو دجلہ کے کنارے کھڑا تھا کیا دیکھتا ہوں جیسے ایک

---

[۱] سکندرِ اعظم۔

شخص ہے۔ کتانی پیراہن اور طلائی پٹکا پہنے۔ بدن زبرجد کی مانند۔
چہرہ بجلی ایسا۔ آنکھیں گویا آتشیں چراغ۔ بازو اور پاؤں پیتل کے
ایسے اور آواز شور انبوہ کی مانند اور دہشت کے مارے مجھ میں تاب نہ
رہی اور طاقت جاتی رہی۔"

قصہ مختصر پھر جبرائیلؑ نے آ کر سمجھایا کہ فارس کے موکل نے اکیس دن میرا مقابلہ کیا اور میکائیلؑ میری مدد کو پہونچا اور میں شاہان فارس کے پاس رُکا رہا۔ اب میں فارس کے موکل سے لڑنے کو جاتا ہوں۔ اور میرے جاتے ہی یونان کا موکل آئے گا لیکن جو کچھ سچائی کے صحیفے میں لکھا ہے تجھے بتاتا ہوں۔ فارس میں ابھی تین بادشاہ اور برپا ہوں گے۔ چوتھا اُن سب سے زیادہ دولت مند ہوگا۔ اور جب وہ اپنی دولت سے تقویت پائے گا تو سب کو یونان کے خلاف اُبھارے گا۔ لیکن ایک اور زبردست بادشاہ برپا ہوگا جو بڑے تسلّط سے حکمراں ہوگا۔ (وغیرہ وغیرہ۔ آگے سکندر کے بعد یونانیوں کی ایشیائی سلطنت کے عروج و زوال کا تذکرہ ہے)

"تب دانیالؑ نے کیا دیکھا کی دَجلہ کے دونوں کناروں پر دو شخص کھڑے ہیں ایک نے دوسرے سے جو کتانی لباس پہنے تھا اور دریا کے پانی اوپر کھڑا تھا پوچھا کہ ان عجائب کے وقوع پذیر ہونے میں کتنی مدّت باقی ہے اور اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر حَیُّ القَیُّوم کی قسم کھائی اور کہا ایک دور۔ اور دَور اور نیم دور۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا تو اسنے کہا اے دانیالؑ تو اپنی راہ لے۔ کیوں کہ یہ باتیں آخری وقت تک سربمہر رکھی جائیں گی۔ بہت سے لوگ پاک کیے جائیں گے اور شریر شرارت میں مصروف رہیں گے شریروں میں سے کوئی نہ سمجھے گا لیکن دانشمند سمجھیں گے۔"

بابل پر ایرانی فتح کے متعلق یرمیاہ نبی کی پیشن گوئی:۔ شاہ بخت نصر نے مجھے کھالیا مجھے خالی برتن کے مانند کردیا۔ (لیکن خداوند فرماتا ہے) کہ بابل جو کچھ نگل گیا ہے مَیں اسے اس کے منہ سے اُگلواؤں گا۔ بابل کی فصیلیں گر گئیں۔ اس پر سمندر چڑھ گیا اور وہاں سے

رونے کی صدا آتی ہے۔ یرمیاؔہ نے ان سب آفتوں کو جو بابل پر آنے والی تھیں قلمبند کیا اور سراؔیاہ بن یزیاہ بن مسیاہ سے کہا (جو بابل لے جارہا تھا) کہ جب تو اس کتاب کو پڑھ لے تو اسے ایک پتھر سے باندھ کر فرات میں پھینک دیجیو۔ کہ بابل اسی طرح ڈوب جائے گا۔

یسعیاؔہ نبی کی پیشن گوئی:۔ بابؔل سدوؔم اور عموؔرہ کی مانند تباہ ہوگا۔ وہاں عرب خیمے نہ لگائیں گے۔ وہاں پر بن کے درندے اور اُلّو اور شُتر مرغ بسیں گے۔ گیدڑ اور بھیڑیے ان کے رنگ محلوں میں چلاّئیں گے۔ اے صبح کے روشن ستارے! تو کس طرح آسمان سے گر پڑا! تو جو کہتا تھا کہ مَیں اپنا تخت کواکب سے بھی اونچا کروں گا اور بادلوں پر چڑھ جاؤں گا۔ دیکھو اب اُن کے بہادر فریادی ہیں اور سفیر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ یروشلم آباد ہوگا۔ اور مَیں اُس کے کھنڈر تعمیر کروں گا۔ خداوند فرماتا ہے مَیں خورؔس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری مرضی پوری کرے گا۔ خداوند اپنے ممسوح خورؔس کے حق میں فرماتا ہے کہ میں نے اُن کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ اُمتوں کو اُن کے سامنے زیر کروں۔ اے کنواری دُختر بابل! نیچے اُتر آ اور خاک پر بیٹھ اب تو نرم و نازک نازنین نہ کہلائے گی۔ چکّی لے اور آٹا پیس۔ نقاب اُتار اور دامن سمیٹ کر ندیاں عُبور کر۔ اب تیرا بدن بے پردہ کیا جائے گا۔ اے قاصیوؔں کی بیٹی چپ ہو کر بیٹھ اور اندھیرے میں داخل ہوجا۔ اب تو مملکتوں کی خاتون نہ کہلائے گی۔ تو جس نے بوڑھوں پر بھی جوا رکھا تھا۔"

۵۳۸ ق م کی اس رات جب شاہی محل میں ایک دعوت ہورہی تھی (جس کا ذکر اتنے ڈرامائی انداز میں صحیفۂ دانیاؔل میں کیا گیا ہے) بابل کے پھاٹکوں پر سائیرس اعظم کی فوجیں پہنچ چکی تھیں۔ بادشاہ بابل بنونیدس کے ولی عہد بیلشضر نے ایرانی لشکر کا مقابلہ کیا اور مغلوب ہوا۔ اکتوبر کے مہینے میں بابل پر سائیرس اعظم کا قبضہ ہوگیا۔ اس نے یہودی اسیروں کو آزاد کردیا۔ اور چالیس ہزار یہودی فلسطین واپس چلا گیا۔ فلسطین اب دولت ہخامنشیہ کے بیس صوبوں میں سے اُس پانچویں مغربی صوبے کا ایک حصّہ بنا جس کا انتظامی مرکز دمشق میں تھا۔ (اس صوبے میں اشور، حتیہ اور جزیرۂ قبرص شامل تھے۔ خود فلسطین کا صدر مقام یروشلم رہا۔ سائیرس کے حکم سے ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اور عزرا نبی (عربی نام عزیزؑ) نحمیاہ نبی، ذکریاؑ وغیرہ بزرگانِ دین نے ایک نئی یہودی قوم کی تشکیل کی جو جلاوطنی اور

صعوبتوں کی وجہ سے کافی سیدھی ہوگئی تھی۔ چنانچہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یہودی سائیرس اعظم کو نجات دہندہ اور مسیح نہ سمجھتے۔

ادھر بابل پر ایرانی تسلّط کے بعد حضرت دانیالؑ پر کیا گزری۔ یہ بھی سن لیجئے۔ ''اور دارا کو پسند آیا کہ اپنی مملکت پر ایک سو بیس ناظم مقرر کرے۔ ان پر تین وزیر ہوں۔ ان وزیروں میں دانیالؑ بھی تھا جو اپنی دانشمندی کی وجہ سے ناظموں پر سبقت لے گیا اور بادشاہ نے چاہا کہ اسے اپنی مملکت کا مختار مقرر کردے۔ چنانچہ باقی ناظم اُس کے خلاف ہو گئے لیکن دانیالؑ پر سوائے اس کے اور کوئی قصور ثابت نہ کر سکے کہ وہ شریعت موسویؑ اور احکامِ خداوندی کا پابند تھا انہوں نے دارا سے کہا کہ ''ماداؔ اور فارسؔ کے قوانین اٹل ہیں اور کبھی تبدیل نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا وہ ایک خسروانہ آئین جاری کرے۔ جس کی رو سے ایک مہینے تک جو شخص دارا کے سوا کسی اور معبود سے کوئی درخواست کرے اسے شیروں کے آگے ڈال دیا جائے۔'' اور بادشاہ نے مجبوراً اس فرمان پر دستخط کردیئے۔ جب دانیالؑ کو معلوم ہوا کہ نِوشتے پر دستخط کردیئے گئے ہیں وہ حسبِ معمول اپنے گھر گیا اور اس کی کوٹھری کا دریچہ جو بیت المقدس یروشلم کی سمت کھلا تھا اس میں دوزانو ہوکر عبادت کرتا رہا۔ اس کے دشمنوں نے فوراً جا کر بادشاہ سے شکایت کی کہ وہ تیرے فرمان کی پرواہ نہیں کرتا اور حسبِ معمول دن میں تین بار نماز پڑھ رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے اسے شیروں کے آگے ڈال دیا گیا، اور شیروں نے اسے کوئی گزند نہ پہنچایا اور بادشاہ یہ معجزہ دیکھ کر بہت شادمان ہوا اور دوسرا فرمان جاری کیا کہ میری ساری رعایا دانیالؑ کے خدا پر ایمان لائے۔'' پس یہ دانیالؑ دارا مادیؔ اور خورسؔ کی سلطنت میں کامیاب رہا (صحیفہ دانیالؑ)

اس مضمون میں جابجا عہد نامہ قدیم کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ سائیرسؔ اعظم کے ہمراہ ایران واپس لوٹنے سے قبل ضروری ہے کہ اُن کی وضاحت کردی جائے۔

عبرانی یعنی یہودی انجیل (عہد نامہ قدیم) تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں قلمبند ہوئی اور کپڑے یا پیپائیرسؔ (مصری کاغذ) پر لکھی جاتی رہی۔ اس کا پہلا حصہ ''توراؔ'' (عربی توراتؔ) دوسرا ''نبیئیم'' (عربی نبیینؔ) یعنی صُحف انبیاء اور تیسرا ''کتبیم'' (عربی ''کتب'') تھا ('' کتبیم '' میں زبور، ایوبؑ، واعظ، نوحے، غزل الغزلات تواریخ ۱ و ۲

دانیالؔ،عزرا،نحمیاہ وغیرہ شامل ہیں)

چند پیغمبروں نے اپنے نوشتے آٹھویں صدی قبل مسیح میں لکھنے شروع کیے جو شمالی ریاست اسرائیل کے لیے ٹوئیلبی کی اصطلاح میں TIME OF TROUBLES تھا۔ ان انبیاء کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان ہی میں عموسؔ نبی شامل تھے۔ یہ ایک مفلوک الحال گڈریئے تھے۔ مگر بادشاہوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حکومتِ وقت نے انُہیں یہودیہ جلاوطن کر دیا۔ آپ کا دورِ نبوت غالباً ۷۶۵ ق م سے ۷۵۰ ق م تک ہے۔ ہوسیعؔ پیغمبر اسرائیل میں تھے (دورِ نبوت ۷۴۵ ق م سے ۷۳۵ ق م ہے) یسعیاہ نبی نے ۷۴۰ ق م سے ۷۰۱ ق م تک پیغمبری کی۔ اور غالباً اُن کو آرے سے چروایا گیا۔ یرمیاہ نبی سے ہم پہلے ملاقات کر چکے ہیں۔ جو یسعیاہ نبی کے تقریباً سو سال بعد پیدا ہوئے اور سقوط یروشلم کے بعد ۵۸۶ ق م میں مصر جلاوطن کیے گئے۔ حزقیلؔ بخت نصر کے پہلے حملے کے موقع پر آٹھ ہزار یہودیوں کے ساتھ ۵۹۷ ق م میں بابل جلاوطن کیے گئے اور دجلہ کے کنارے خواب دیکھتے اور روتے رہے۔ ان تمام انبیاء کے صحائف متواتر جنگوں اور جلاوطنی کے زمانے میں کچھ کھو گئے کچھ باقی بچ رہے اور اُن میں بعد میں اضافے کیے گئے۔ یرمیاہ نبی کے صحیفے سے معلوم ہو چکا ہے کہ بادشاہ صدقیاہ ان کی تحریروں کو غصے کے مارے آگ میں پھینکتا رہا۔ کتاب پیدائش کے دو گمنام مصنف ''یے'' اور ''الف'' ہیں جو شاید نبی یہودیہ اور نبی افرائیم یعنی جنوبی اور شمالی ریاستوں کے باشندے تھے اور غالباً نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں زندہ تھے۔ زوال آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی چند حکایات یے نے لکھیں الف نے قصہ یوسفؑ تحریر کیا۔ عہدِ قدیم کے پہلے پانچ حصے یعنی توراۃ جو PENTATEUCH کہلاتے ہیں کیوں کہ پانچ صحف پر مشتمل ہیں۔ یعنی پیدائش خروج۔ احبار۔ تعداد یا گنتی اور استثنا۔ استثنا۔ جس میں شریعت موسوی قصۂ موسیٰؑ اور آپ کا آخری وعظ درج ہے۔ ایک اور گمنام مصنف دالؔ نے غالباً ساتویں صدی ق م میں لکھی اور حکومتِ وقت کے خوف سے (جو اس وقت پھر احکام موسوی سے برگشتہ ہو گئی تھی) اسے کہیں چھپا دیا۔ غالباً اسی تصنیف کو حلقیاہ کاہن نے بیت اللہ کے کسی تاریک کونے میں ۶۲۱ ق م میں پڑا پایا اور اس کی بناء پر شریعت کی تجدید کی گئی اسی وجہ سے اس کے یونانی ترجمے کو DEUTERONOMY (شریعت کی دوسری کتاب) کہا گیا۔

پنج نامہ کا بیشتر حصّہ اسیری بابل کے دوران میں تحریر کیا گیا۔ جہاں جلاوطنوں نے اپنے کاتبوں کا ایک باقاعدہ مدرسہ قائم کرلیا تھا۔ کتاب پیدائش کا پہلا باب بابل ہی میں لکھا گیا جہاں تخلیقِ کائنات کی مختلف اساطیر کا پہلے سے چرچا تھا کہا جاتا ہے کہ بخت نصر کے معلّق باغات نے باغِ عدن کا خیال دلایا۔ بابل بلند و بالا میناروں، نہروں اور سنہرے پھاٹکوں کا شہر تھا۔ چنانچہ ''مینارہ بابل'' کی تفصلات کے لیے اس اونچے مینار کو ماڈل بنایا گیا جو مردوک کے مندر کے پاس استادہ تھا۔ طوفانِ نوحؑ کے پس منظر میں داستان گل گامش اور وہ حطّی اور ہُرّی کہانیاں بھی موجود تھیں جن میں ایک عالمگیر طوفان کا ذکر تھا۔ قصّہ پیدائش کے ایک اوّلیں نسخے میں گناہ آدم کا تذکرہ موجود نہ تھا۔ (انسان کے ''ازلی گناہ'' اور اس کے کفارے کے نظریے کو صدیوں بعد مسیحی داعی سینٹ پال نے بے حد اہمیت دی کیوں کہ اسی تصور پر ''ابن اللہ'' کی قربانی اور شفاعت کے فلسفے کی بنیاد رکھی گئی) ۶۰۰ ق م سے قبل یومِ آخرت جُرم و سزا کا تصوّر بھی یہودی مذہب میں ناپید ہے (حالانکہ اُن کے اجداد صدیوں تک مصر میں رہ چکے تھے جہاں ممیاں حیات بعد الممات کی اُمید میں دُنیا بھر کے ساز و سامان کے ساتھ دفن کی جاتی تھیں) ۶۰۰ ق م کے بعد یہودی ''دوزخ'' و ''بہشت'' کے زرتشتی تصورات سے متعارف ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان یا ابلیس کا تصوّر یہودیوں نے ایرانی اہرمن سے مستعار لیا۔ ایران قدیم میں سانپ شر اور بدی کا سمبل تھا۔ مارِضحاک (اژدھاک کے کندھوں کے سانپ) بھی اسی بدی کے نمائندے تھے۔ انجیل میں ہمیں حوّا کو بہکانے والا شیطان سانپ کے بھیس میں ملتا ہے۔ زرتشتیوں کا پُل چنوت (جس پر سے مرنے کے بعد روح کو گزرنا پڑتا ہے) جو کھولتے ہوئے لاوے کے دریا پر معلّق ہے۔ پُل صراط سے مشابہ تھا۔ روح کا تصور بھی اب تک یہودیوں کے ہاں موجود نہ تھا اور بہت بعد میں وہ زرتشتی رواں اور یونانی SOUL سے آشنا ہوئے۔ دینِ زرتشت میں بھی فرشتہ سروش موجود تھا۔ جو جبرئیلؑ کے مانند ایرانی عقیدے کے مطابق زرتشت کے پاس آیا جایا کرتا تھا جو آذربائیجان کے ایک پہاڑ پر اہورمزدہ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

بابل ہی میں ساؔل بادشاہ سے لے کر آخری عبرانی بادشاہ صدقیاہ تک کے حالات رقم کیے گئے۔ قاصیوں کی حکایات پہلے سے لکھی جا چکی تھیں مگر مدرسہ بابل میں اُن کو قضاۃ کے

عنوان سے مرتب کیا گیا۔ اب ہم پیغمبروں کی سیاسی پیشین گوئیوں پر آتے ہیں۔ عموسؔ، یسعیاہ نبی یرمیاہؔ وغیرہم کی پیشن گوئیاں اُن کے عہد کے بعد بڑھائی گئیں۔ حزقیلؔ کے خواب اور رویا کا بھی ان کی تحریروں میں ۳۰۰ ق م کے لگ بھگ اضافہ کیا گیا۔ صحیفۂ دانیالؔ کا دوسرا حصہ ۱۶۵ ق م میں لکھا گیا۔ جس میں گزرے ہوئے تاریخی واقعات کو پیشین گوئی اور رُویا کے پیرائے میں پیش کیا گیا یہ طرزِ بیان یہودی مصنفین نے مصر اور بابل کی رمزیت پرست طرزِ تحریر سے حاصل کیا اور انجیل کے ان ابواب کو APOCRYPHA (مخفی تحریریں) کہا جاتا ہے۔ حضرت دانیالؔ کی رویا میں میڈیہ اور فارس کا سکندرِ اعظم کے حملے کے ذریعہ خاتمہ اور سکندر کے بعد یونانی سلطنت کا عروج و زوال اس وقت لکھا گیا جب یہودیوں نے یونانی حاکموں کے خلاف ناکام بغاوت کی اور اُن کی ہمت افزائی کے لیے گویا حضرت دانیالؔ کی زبانی اس نئی سلطنت کے زوال کی بشارت دی گئی امثالؔ جو داؤدؔ و سلیمانؔ سے منسوب ہیں اُن کا بڑا حصہ مصری کتاب ''آمنوفس کے اقوال'' پر مبنی ہے۔ جس سے سقوط یروشلم کے بعد یرمیاہ نبی کے ساتھ پناہ لینے والے یہودی متعارف ہوئے۔ یہ امثالؔ بھی ۳۰۰ ق م کے آس پاس لکھی گئیں۔ زبورؔ میں بہت سے لحن واقعی حضرت داؤدؔ کے ہیں جو لوک گیت کی زبانی روایت کی طرح محفوظ تھے۔ بقیہ نغمے بابل سے بیت المقدس واپسی اور نئے ہیکل کی تعمیر کے موقعے پر مرتب کیے گئے۔ غزل الغزلات بھی ولادت مسیح سے صرف تین سو سال قبل ہی موجودہ صورت میں مرتب کی گئی۔ شاید یہودیوں کے شادی بیاہ کے موقعے پر گائے جانے والے گیتوں کا مجموعہ تھا جسے روحانی معنی پہنا دیے گئے۔ لیکن نوحےؔ غالباً اسی شاعر کی تصنیف ہے جس نے ۵۸۶ ق م میں زوال یروشلم کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا۔ اسی طرح بابل کے پانیوں کے کنارے بیٹھ کر رونے والے شاعر نے عصری حالات کی سچی تصویر کشی کی تھی ایستھرؔ کا قصہ جس میں شہنشاہ ایران خشایارشاہ اپنے دارالسلطنت میں رہنے والی ایک غریب یہودی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ غالباً محض افسانہ ہے اور اس افسانے کے ساتھ ہم پھر یہودی دنیا سے رخصت ہو کر سُوشؔ اور پسارگاؔ واپس آتے ہیں۔

اکتوبر ۵۳۸ ق م میں تسخیر بابل کے وقت تک سائیرس اعظم کی حکومت بحیرہ اسود سے لے کر باختر تک پھیل چکی تھی۔ اس نے ایشیائے کوچک کے یونانی شہروں پر بھی قبضہ کیا اور آئندہ کئی صدیوں تک جاری رہنے والی ایرانی اور یونانی کشمکش کی بنیاد پڑی۔ سائیرس عہدِ عتیق کا سب سے روشن خیال، عدل گستر اور روادار فرمانروا تھا۔ ایرانیوں نے تو اسے اپنا ہی باپ کہا تھا مگر یونانیوں نے اسے قوموں کا باپ، استاد اور قانون ساز پکارا اور عبرانیوں نے اسے پیغمبر سمجھا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ سکندر مقدونی کو قرآن شریف کا ذوالقرنین خیال کیا ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں کہ سائیرس ہی غالباً ذوالقرنین تھا کیوں کہ وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے لقب سے مشہور تھا۔ عبرانی اور عربی میں قرن کے معنی سینگ کے ہیں۔ اور حضرت دانیالؑ کے خواب میں بھی دو سینگوں والے مینڈھے کی تمثیل بیان کی گئی۔ اس زمانے میں میڈیہ اور فارس کی توام ریاستوں کو دو سینگوں[1] سے تشبیہ دینا عام روایت تھی۔ بقول مولانا آزاد سائیرس اعظم موحدانہ دین زرتشت کا پہلا حکمران داعی بنا اس وقت تک اس مذہب کو مجوسیوں نے مسخ نہیں کیا تھا اور اسی سائیرس ذوالقرنین نے سیتھین حملوں کی روک تھام کے لئے وہ دیوار بنائی جسے بعد میں سکندر سے منسوب کر دیا گیا۔

سنسان پسارگادمیں سائیرس کے محلات کے کھنڈر میں اس کی نو فٹ اونچی سنگی تصویر موجود ہے جس میں وہ مصری تاج، عیلامی قبا پہنے چار بڑے بڑے پَر لگائے (جو قدیم مغربی

---

[1] طاقت کے پجاری کے اشوری فن سنگ تراشی میں سینگ ایک اہم علامت تھی۔ مینڈھوں، بارہ سنگھوں اور پہاڑی بکروں کے سینگ اشوری اور بابلی آرٹ کے پسندیدہ موتیف تھے۔ مردک دیوتا کے مقدس فرضی درندے کے سر پر دو خوفناک سینگ تھے (اس درندے کا بت لودر پیرس میں موجود ہے) اشوری فوج میں ایک قسم کا ''ٹینک'' تھا جس کے اندر بیٹھ کر دو سپاہی دو سینگ نما ہتھیاروں کو ''کنٹرول'' کرتے تھے جن کے ذریعے غنیم کی شہر پناہ کو دھکے دے دے کر توڑا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں عبرانی مذہب میں نرسنگا یا قرنا مقدس حیثیت رکھتا تھا اسے آج بھی عبادت کے وقت پھونکا جاتا ہے۔ انجیل میں خداوند خدا جابجا اپنے نبیوں سے کہتا ہے کہ تو اپنے سینگ میں تیل بھر اور فلاں فلاں کو ممسوح کرنے کے لئے جا!

ایشیا کے فنِ بت سازی میں ملکوتی صفات اور طاقت کی علامت تھے) اپنی بے نور آنکھوں سے دنیائے فانی کا نظارہ کررہا ہے۔ اسی ستون پر "آدم کوروش خشا۔تھ ہنخامنشیہ" منقش ہے۔ ۵۲۸ ق م میں اس عجیب وغریب بادشاہ نے رحلت کی اور پسارگاد میں دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ اندر سے خالی پڑا بھائیں بھائیں کررہا ہے۔ سائرس کی ممی مع زروجواہرات کے جانے کب کی غائب ہوچکی۔ قدیم یونانی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس مقبرے پر یہ عبارت منقش تھی: "میں، سائرس، شاہوں کا شاہ، یہاں لیٹا ہوں۔"

اور پلوٹارک مندرجہ ذیل کتبے کا ذکر کرتا ہے:۔

"اے انسان! تو جو کوئی بھی ہے۔ اور جہاں کہیں سے بھی آیا ہے، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز تو اِدھر سے ضرور گزرے گا، آگاہ ہو کہ میں کوروش ہوں۔ جس نے پارسیوں کی سلطنت قائم کی۔ اس لئے اس ذرا سی مٹی کی خاطر مجھ سے بَیر نہ رکھ جس نے میرے جسم کو ڈھانپ رکھا ہے ـــــ"

کمبوجیہ دوئم سائیرس کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس نے مصر پر حملہ کیا اور فرعون وقت کو پکڑ کر سُوش بھیج دیا۔ اور اپنی فوج میں یہودی افسر مقرر کیے جن کے اب ایرانی دورِ حکومت میں بھلے دن آگئے تھے۔ کمبوجیہ دوئم نے اپنی یہودی رجمنٹ کو خاص مصر ہی میں تعینات کیا اور ابھی ممفس ہی میں تھا کہ ایران میں بغاوت کی اطلاع ملی۔ جہاں گیومرث نامی ایک مجوسی تخت پر چڑھ بیٹھا تھا کمبوجیہ اپنے باپ سے بالکل مختلف اور بڑا جابر بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے بھائی بردیا کو قتل کروا کے سائیرس کا تخت وتاج حاصل کیا تھا۔ سنا ہے عوام بھی اس کی فارن پالیسی سے بیزار ہوچکے تھے کیوں کہ قرطاجنہ اور حبشہ کے خلاف اس کی لشکر کشی ناکام رہی تھی۔ مقبوضہ مصر میں تو وہ ظاہر ہے ہر دلعزیز ہو ہی نہ سکتا تھا۔ ابھی تک یہ طے نہیں کیا جاسکا کہ بغاوت کی اطلاع ملنے کے بعد اس پر مرگی کا دورہ پڑا جس کا وہ مریض تھا اور ۵۱۲ ق م میں وہ اس دَورے میں مرگیا یا خودکشی کی۔ اِس طرف ایران میں جو مجوسی گیومرث تخت پر بیٹھا وہ آنجہانی شہزادہ بردیا کا ہم شکل تھا اور اس کے لئے یہ دعویٰ کیا کہ وہ خود ہی بردیا ہے۔ حکومت کی باگ

ڈور سنبھالتے ہی تین سال کے لئے ٹیکس معاف کردیئے اور متعدد مندر مسمار کر کے مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ نہ معلوم یہ اصلاحات کس قسم کی تھیں۔ گیومرٓث بہر حال فوجی جرنیلوں کی حمایت حاصل نہ کر سکا۔ اس کے خلاف سات ہنخامنشی شہزادوں نے مل کر سازش کی اور فوج نے ان کا ساتھ دیا۔ اس سازش کا لیڈر ایک ذہین نوجوان شہزادہ دآرا تھا۔ روایت یہ ہے کہ گیومرٓث کا کام تمام کرنے کے بعد ان ساتوں شہزادوں نے طے کیا کہ ان میں سے جس کا گھوڑا طلوع آفتاب کے وقت سب سے پہلے ہنہنائے اسے بادشاہ منتخب کرلیا جائے گا۔ اور دآرا کے سائیس کی چالاکی سے اس کا گھوڑا سب سے پہلے ہنہنایا۔!

دآرا نے جس پھرتی سے بگڑے ہوئے حالات سنبھالے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کمبوجیہ دوئم کی خودکشی کے صرف دو ماہ بعد گیومرٓث قتل کیا جاچکا تھا اور نوجوان حکمران سلطنت کے مختلف حصّوں کی بدامنی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ دآرا اوّل کے ساتھ حکومت دوبارہ ہنخامنشی خاندان کی اس شاخ کے ہاتھ میں واپس آگئی جو آریہ رمٓنا کی اولاد تھی۔ کیوں کہ دآرا اس ارشا کا پوتا تھا جسے اس کے کزن کمبوجیہ اوّل نے تخت سے اُتار کر پارس پر خود قبضہ کرلیا تھا اور ارشا کے بیٹے (یعنی دآرا کے باپ) گشتاسپ کو پارتھیا کا گورنر بنا دیا تھا۔ یہ ذرا جھمیلے کی بات ہے اور اس شجرہ نسب سے سلجھ سکے گی۔

ہنخامنشی

چش پس

آریہ رمنا	کوروش اوّل (شاہ پرسوش)
ارشا (معزول کیا گیا)	کمبوجیہ اوّل
گشتاسپ (صوبائی گورنر بنایا گیا)	کوروش دوئم (سائیرس اعظم)
داریوش اوّل	کمبوجی دوئم

گیومرت یا ''نقل بردیا'' کے قتل اور دوسری بغاوتیں کچلنے کے بعد دارا نے کرمان شاہ اور ہمدان کے درمیانی راستے میں کوہ بیتون پر ایک عظیم الشان سنگی تصویر ترشوائی جس میں اھورمزدہ اوپر سے فاتح کو برکت دے رہا ہے اور شاہ شایان کے سامنے وہ آٹھ ''بادشاہ'' یا صوبیدار ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے ہیں جن کی بغاوتوں کو فرو کیا گیا۔ تصویر کے نیچے قدیم فارسی، بابلی اور عیلامی زبانوں میں دارا نے گیومرث کا قصہ خود نقش کروایا ہے:۔

''بادشاہ بننے کے بعد میں نے یہ کیا: ہمارے خاندان کے کوروش کا لڑکا کمبوجیہ یہاں بادشاہی کرتا تھا۔ اس کمبوجیہ کا ایک سگا بھائی بردیا تھا۔ کمبوجیہ نے اس بردیا کو ہلاک کروادیا۔ لیکن لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ بردیا مارڈالا گیا ہے۔ پھر کمبوجیہ مصر چلا گیا۔ کمبوجیہ کے مصر جانے کے بعد پارس اور ماوا اور دوسرے ملکوں میں جھوٹ اور دروغ گوئی بہت بڑھ گئی۔

''کہتا ہے داریوش شاہ: ایک مجوسی گیومرث نامی نے لوگوں سے کہا کہ وہ ہی بردیا ہے۔ لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے بادشاہت غصب کرلی۔ اس کے بعد کمبوجیہ مرگیا[۱]۔

''کہتا ہے داریوش شاہ: یہ بادشاہت جو گیومرث مجوسی نے کمبوجیہ سے چھینی یہ بادشاہت ہمارے خاندان میں بہت زمانے سے چلی آرہی ہے۔ گیومرث نے پارس اور ماوا اور دوسرے ملکوں کو ہتھیالیا۔

''کہتا ہے داریوش شاہ: کوئی پارسی یا ماوی یا ہمارے خاندان کا کوئی فرد گیومیرث کا مقابلہ نہ کرسکا۔ سب اس سے ڈرتے تھے کہ جو لوگ اصل بردیا سے واقف تھے وہ کہیں اُن کو نہ قتل کردے۔ جب تک میں گیومرث کے مقابلے پر نہ آیا کسی اور کی ہمّت نہ تھی کہ اس سے کچھ کہہ سکے۔ پھر میں نے اھورمزدہ سے دعا مانگی اور اھورمزدہ نے میری مدد کی۔ پھر میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے گیومرث مجوسی اور اس کے ساتھیوں کو ماوا کے ایک قلعے میں قتل کردیا۔ اور بفضل اھورمزدہ میں بادشاہ بن گیا۔

''کہتا ہے داریوش شاہ: جو بادشاہت ہمارے خاندان سے چھن گئی تھی میں نے

---

[۱] یہاں کمبوجیہ کی موت کے لئے قدیم فارسی لفظ ''ہوامرشیوش'' جو دارا نے استعمال کیا ہے اس کا ترجمہ ''خودکشی'' بھی کیا گیا ہے۔

واپس لے لی۔ جو مندر گیومرث نے منہدم کروائے تھے میں نے اُن کو دوبارہ تعمیر کروایا اور رعایا کو اُن کے گلّے، نوکر چاکر، اور مکانات واپس کر دیئے جو گیومرث مجوسی نے ان سے چھین لئے تھے ـــــــــ''

گیومرث کے متعلق کچھ موّرخوں کا خیال ہے کہ وہ ہی بردیا یعنی کمبوجیہ کا بھائی تھا۔ دارا نے اس کی حکومت چھینی اور دنیا کو دکھانے کے لئے گیومرث مجوسی کا قصہ اپنی طرف سے گھڑ دیا کیوں کہ کمبوجیہ لاولد تھا اور اس نے اپنے بھائی کو ہلاک نہیں کروایا ہوگا۔ بہر کیف اس قصے میں کچھ نہ کچھ گھپلا ضرور ہے (ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق دارا نے کمبوجیہ کی لڑکی سے شادی کی جو گیومرث کی بیوہ تھی۔ اور بردیا کی لڑکی کو بھی اپنی ملکہ بنایا) زیادہ تر گیومرث کے متعلق دارا کا بیان صحیح سمجھا جاتا ہے۔

لیکن اب گیومرث کے متعلق ایک اور اُلجھن پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق ہنحامنشی سلاطین کے مذہبی رجحانات اور دین زردشت سے ہے۔

ظہور زردشت سے قبل اہورمزدہ کے علاوہ (جو ایک قدیم آریہ دیوتا کا نام تھا) ایران میں مترا (سورج) ماہ۔ زم (زمین) آتھر (بعد کا تلفظ آذر یعنی آتش) آب، واہیو (سنسکرت ۔ وایو یعنی ہوا) اور زرخیزی اور باروری کی دیبی اناہتا کی پرستش کی جاتی تھی۔ دیوتاؤں کے سامنے خونی قربانیاں پیش کرنے کا دستور بھی تھا۔ مجوسی میڈیہ کے آبائی پروہت تھے جن کے عقائد ثنویت و آتش پرستی کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زردشت یا زرتشت (قدیم تلفظ زرتو خشت) کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ روایت کے مطابق دارا اسفندیار یعنی دارا اوّل کے باپ گشتاسپ نے زردشت کی سرپرستی کی اور گشتاسپ شاہ بلخ تھا۔ ایک نظریے کی رُو سے زردشت آذربائیجان میں پیدا ہوئے اور ہجرت کر کے بلخ آئے۔ ایک خیال یہ ہے کہ وہ خوراساں (طلوع خورشید کی سرزمین) ہی میں پیدا ہوئے جہاں شاہ بلخ نے ان کا دین قبول کیا۔ تورانی بادشاہ ارجاسپ نے بلخ پر حملہ کیا۔ آتشکدہ آذرنوش کو آگ لگادی گئی اور زردشت بھی قتل ہوئے تاریخی واقعہ غالباً یہ ہے کہ ہنحامنشی دور کے آغاز میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں خراساں، باختر وغیرہ یعنی مشرقی ایران یا پارتھیا میں قائم تھیں اور ممکن ہے گشتاسپ ان میں سے کسی ایک کے فرمانروا کا نام رہا ہو۔ ہنحامنشی عہد اندازاً اوائل

ساتویں صدی ق م سے شروع ہوتا ہے شاید اسی زمانے کے لگ بھگ زردشت پیدا ہوئے۔ اِدھر اپنے ایک کتبے میں جو سُوش میں دستیاب ہوا ہے کہتا ہے داریوش شاہ کہ اس کے عہدِ حکومت کے ابتدائی برسوں میں اس کا باپ گشتاسپ اور دارا (جو پردادا ہونا چاہئے) آریہ رمنا دونوں زندہ تھے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ آریارمنا کا زمانہ ۶۴۰ ق م سے ۵۹۰ ق م طے کیا گیا ہے۔ دارا اوّل کا سن جلوس ۵۲۱ ق م ہے۔ یہاں بھی کچھ گڑ بڑ معلوم ہوتی ہے۔ (یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ قبل از مسیح سنہ اُلٹی طرف چلتا ہے) بعض مورخین کے نزدیک زردشت کا سن ولادت ۶۶۰ ق م ہے۔ اور جدید محققوں کا خیال ہے کہ دارا اوّل کا باپ وہ شاہنامے والا روایتی گشتاسپ نہیں ہوسکتا جس نے زردشت کی سرپرستی کی تھی۔ گو یہ بھی ممکن ہے کہ دارا کے والد گشتاسپ صاحب چونکہ پارتھیا کے گورنر تھے عہدِ قدیم کے کوچہ گرد گویوں نے انہیں کسی اپنے ہم نام شاہ بلخ سے گڑبڑا دیا ہو۔ قدیم پارتھین یا خراسانی داستان گوئی کا ذکر بعد میں کیا جائے گا جس کی بنیاد پر شاہنامہ قلمبند کیا گیا۔ اور کیا پتہ "شاہ بلخ گشتاسپ" دراصل پارتھیا کے صوبیدار گشتاسپ ہی کو کہا گیا اور زردشت ان ہی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

قصہ مختصر زردشت نے اھورمزدہ کا نام خیر کی طاقت کے لئے استعمال کیا۔ لیکن ہنجامنشی دور میں زردشتی عقائد کی پیروی کے ساتھ ساتھ پرانے دیوی دیوتاؤں کی پرستش جاری رہی۔

اس دلچسپ آدمی گیومرث مجوسی نے کمبوجیہ دوئم کے خلاف بغاوت کر کے شاہی "ایاوانہ" بھی جلا دیا تھا۔ قتل گیومرث کے بعد دارا نے ایاوانہ دوبارہ تعمیر کروایا اور کہا جاتا ہے کہ بے شمار مجوسیوں کو ہلاک کروا دیا۔ ایاوانہ (قدیم فارسی = ید، ماوی = یز = سنسکرت = یگ یا تج ___ یعنی عبادت) ہنجامنشی سلاطین کے عبادت خانے کو کہتے تھے۔ سائرس اعظم، کمبوجیہ دوئم اور دارا اوّل ایرانی، بابلی مصری معبودوں کے علاوہ عبرانی یاہ و یہہ کے بھی قائل تھے اور ان کے ایاوانہ میں غالباً تمام دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بھی سجی تھیں۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ گیومرث مجوسی نے پرانے خداؤں کی بیخ کنی کر کے خالص دینِ زردشت رائج کرنا چاہا ہو۔ اس کے ساتھ دوسرے مجوسیوں کا قتل کا ذکر کرتے ہوئے ہیروڈوٹس گیومرث کا نام اسپندوات

(اسفندیار) بتاتا ہے جو زرتشتی ہیرو کا نام بھی ہے۔ بعد میں بھی گیومرث کو مجوسیوں نے روایتی گشتاسپ بلخ کے لڑکے اسفندیار سے مماثل کیا۔ اور دارا کے ہاتھوں مجوسیوں کے قتلِ عام کی روایت اتنی مستحکم ہوگئی کہ اس کی سالانہ برسی منائی جانے لگی[1]۔

اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ خود دارا ہی نے دین زردشت کی حمایت کی ہو اور اس لئے مجوسی پروہتوں کا زور توڑنا چاہا ہو جنہوں نے پرانے عقائد زندہ رکھے تھے۔ یا یہ قتل محض سیاسی نوعیت کا ہو اور اس کا مذہب سے زیادہ تعلق ہی نہ رہا ہو۔

ان سب باتوں سے بہر حال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک دین زردشت پوری طرح مرتب اور رائج نہ ہوا تھا۔ دارا بار بار اہور مزدہ کا ذکر کرتا ہے جو اشوری دیوتا اشور مزاش کی مانند (جو شاہان اشور کی سنگی تصاویر کے اوپر سایہ فگن رہتا ہے) ہر جگہ پر پھیلائے گھنگریالی داڑھی لگا کے بادشاہ کے سر پر مسلط ہے۔ لیکن یہ اہور مزدہ سارے ایرانی معبودوں کا چیف دیوتا تھا۔ گو ممکن ہے کہ شروع کے ہخامنشی سلاطین نے زردشت کی تعلیمات کو بھی قبول کر لیا ہو۔ دارا اوّل سائیرس اعظم کے بعد ہخامنشی خاندان کا دوسرا جلیل القدر فرمانروا ثابت ہوا۔ اس نے ایران کو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور اور وسیع سلطنت بنا دیا۔ یہی وہ دارا[2] ہے جسے تاریخ عالم نے دارائے اعظم کے لقب سے نوازا اور اس کی شان و شوکت حضرت سلیمانؑ کی دولت و حشمت کی مانند ضرب المثل بن گئی۔

صحیفۂ دانیالؑ میں مذکور ہے کہ شُوش میں (اسے بھی سُوش، شُوش شُوشن اور سُوسن لکھا جاتا رہا ہے) دارا کا محل تعمیر کرنے کے لئے اہلِ بابل نے اینٹیں بنائیں۔ لبنان، کرمان اور قندھار سے لکڑی آئی۔ باختر سے سونا۔ سُغدیہ سے جواہرات۔ حبشہ و سندھ سے ہاتھی دانت اور خوارزم سے فیروزے منگوائے گئے یونان و لیڈیا سے سنگتراش اور مصر اور میڈیہ سے سناروں کو بلوایا گیا۔

---

[1] یہ قدیم روایت اتنی پائیدار تھی کہ ۱۵۱۱ء میں بعہد شاہ اسمٰعیل صفوی ایران کے بچے کھچے زرتشتیوں نے اپنے ہم مذہب ایرانیوں کو جو ہندوستان میں بس چکے تھے خط لکھا کہ گیومرث کے زمانے کے بعد سے آج تک ہم کو اتنے کڑے مصائب نہیں جھیلنے پڑے۔)

[2] اصل نام دارایووش یا داریوش (داریات وُہنش۔ دولت رکھنے والا یا داراب۔

لیکن یہ قصرِ سُوسَن (جس کا انجیل مقدس میں بے انتہا ذکر ہے) کافی نہ تھا۔ (اس سے قبل اشوری سارگون دوئم نے جو قصر بنوایا تھا اس میں صرف دو سو تو کمرے تھے اور محض ۲۵ ایکڑ زمین پر پھیلا تھا) چنانچہ دارا اوّل نے پرسی پولیس میں اس سے بڑا محل بنوایا (جس میں بعد کے بادشاہوں نے اضافے کیے) اور مشرق میں پنجاب وسندھ اور مغرب میں یونان کی مزید ریاستوں پر قبضہ کیا۔ اور اعلان کر دیا: کہتا ہے داریوش شاہ کو بفضل اھور مزدہ یہ بہت سے شہر میں نے پارس سے دور حاصل کئے۔'' (کتبہ نویسی کی روایت ہنخا منشیوں نے سلاطینِ ارارتو سے حاصل کی تھی جو برابر ریکارڈ کرتے جاتے تھے کہ فلاں فلاں فتوحات انہوں نے دیوتا خالدی کے فضل وکرم سے حاصل کیں) دارا اوّل نے بھی یہودیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ان کو بیت المقدس میں ہیکل[1] دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی جسے بخت نصر نے ۵۸۶ ق م میں منہدم کروادیا تھا۔

۴۹۰ ق م میں دارائے اعظم نے ایتھنز اور اسپارٹا پر لشکر کشی کی اور اسی سال موسمِ خزاں میں MARATHON کی جنگ ہوئی۔ (بے حد لمبی دوڑ کے لئے MARATHON RACE کا محاورہ اسی واقعے کی یادگار ہے جب اسپارٹا کی امداد حاصل کرنے کے لئے PHIDIPIDESE نے ڈیڑھ سو میل کا سپاٹا بھرا تھا)۔ ایتھنز کی دس ہزار فوج نے ایک لاکھ ایرانی لشکر کا مقابلہ کیا اور فتحمند رہے۔ اور اس فتح کو یونانی آرٹ، شاعری اور ادب میں طرح طرح سے سراہا گیا۔ ہیروڈوٹس کی مانند اہلِ یوروپ آج تک اس جنگ کو مغرب کی مشرق پر اخلاقی برتری کا ثبوت سمجھتے رہے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے ایک انگریز مورّخ انیسویں صدی میں کیا لکھتا ہے: ''مطلق العنانی اور جمہوریت کا فیصلہ ماراتھون کے محاذ پر ہوا۔ جب یونان نے ایران کو ہرا کے یوروپ کو مشرق کے جابرانہ تسلّط سے بچایا اور یوروپ کو صحیح معنوں میں اعلیٰ تہذیب اور آزادی سے بہرہ ور ہونا ممکن کیا۔''

۴۸۵ ق م میں دارائے بزرگ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا خشایارشاہ تخت نشین

---

[1] حضرت سلیمانؑ کا تعمیر کردہ ہیکل اشوری طرزِ تعمیر کا نمائندہ تھا اینٹوں کی کئی منزلہ عمارت جس کی خصوصیت تھی۔ یہی مینارہ بابل کا اسٹائل بھی تھا۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے قبل اس جگہ پر ایک چٹان تھی جس پر پہلے کبھی اناج پھٹکا جاتا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس پر قربان گاہ بنائی۔ عبرانی روایت کے مطابق اسی چٹان پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند کی قربانی کا ارادہ کیا تھا۔

ہوا۔ پانچ سال بعد یعنی ۴۸۰ ق م میں خشایارشاہ اتنی بڑی فوج لے کر یونان فتح کرنے کے ارادے سے چلا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس فوج میں دولت ہنخامنشیہ کی چالیس اقوام کے سپاہی مع پنجابی تیراندازوں کے شامل تھے باسفورس پر کشتیوں کا پل بنایا گیا جس پر سے گذر کر یہ قیامت خیز لشکر تھریس، مقدونیہ اور تھیسلی ہوتا ہوا ایٹکا روانہ ہوا۔ بارہ سو جہازوں کا ایرانی بیڑہ اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا اور یونان میں اولمپک کھیل شروع ہونے والے تھے جب اچانک یونانیوں کو دفاعی جنگ شروع کرنا پڑی۔ اسپارٹا سپاہیوں نے ایرانی فوج کے پاؤں اُکھاڑ دیئے اور بے چارہ نوجوان خشایارشاہ محاذ سے کچھ دور اپنے تخت پر بیٹھا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس کے ذاتی باڈی گارڈ کے دس ہزار ''لافانی سورما'' (یہ ان کا خطاب تھا) بھی پسپا ہوئے۔ شاہ کے دو بھائی مارے گئے۔ لیکن بہت جلد ایرانی لشکر نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ تب ایتھنز کی ساری آبادی کا جہازوں کے ذریعے انخلاء کر دیا گیا (ان تفصیلات سے ہمیں یوروپین کی کارکردگی اور خوش انتظامی کا اندازہ ہوتا ہے) ایرانی فوج نے ایتھنز کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد سلامیس کے نزدیک دونوں ملکوں میں بحری جنگ چھڑ گئی۔ یونان کے پاس صرف ساڑھے تین سو جہاز تھے۔ ساحل پر سے خشایارشاہ لڑائی ملاحظہ کر رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے یونانی بحریے نے اپنے سے تین گنا زیادہ بری ایرانی نیوی کے چھکے چھڑا دیئے۔ ستمبر ۴۸۰ ق م میں اس جنگ سلامیس میں بھی میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ چند ماہ بعد ۴۷۹ ق م کے شروع میں ستّر ہزار یونانی فوج نے ایرانیوں کو قطعی شکست دے دی۔ ان کا قتلِ عام کیا اور اُن کے لشکر کے شاہانہ ساز و سامان اور مال و دولت کو جی بھر کے لوٹا۔ (یہ بھی ایک ٹپکل مشرقی بیوقوفی تھی۔ ایرانیوں کو اس تام جھام کے ساتھ اتنی دور کے میدانِ جنگ میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟) اس شکست سے بقول اسی بیہودہ انگریز مؤرخ ''ایشیائی آمریت اور یونانی آزاد خیالی، مشرق اور مغرب، قدامت و جدیدیت، تاریکی اور روشنی، مشرقی تن آسانی اور مغربی چُستی، کمزور اور کمتر اور ینٹ اور یوروپ کے درخشاں مستقبل کے درمیان فیصلہ ہو گیا۔ اور یونان نے ایشیا کو بتا دیا کہ اسے یوروپ کا مقابلہ کرنے کی کبھی ہمت ہی نہ کرنا چاہیئے۔'' یونان کی اسی فتح کے بعد وہاں کی تہذیب کا دورِ زرّیں شروع ہوا۔

یونانی مؤرخوں نے ایران و یونان کی طویل جنگوں کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ خشایارشاہ کی شکست نے یونان میں جس نئی قوم پرستی اور قومی فخر و غرور کی لہر دوڑائی اس کا نمونہ ہمیں اسکائی لس کے مشہور ڈرامے THE PERSIANS میں ملتا ہے۔ اسکائی لس (AESCHYLUS) جو ۵۲۵ ق م میں پیدا ہوا یونان کے تین عظیم ترین ڈرامہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ پیشے کے لحاظ سے خود سپاہی تھا۔ دارائے بزرگ کے خلاف ماراتھون کی جنگ میں لڑا اور شیکسپیئر کی مانند اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں خود بھی اداکاری کرتا تھا۔ اسی کا یہ ڈرامہ یعنی ''اہلِ پارس'' یونانی ٹریجڈی میں اس لئے بھی منفرد ہے کہ اس کے تینوں ایرانی کردار تاریخی ہستیاں ہیں۔ ان کے علاوہ کلاسیکل ڈرامے کے سارے کردار فرضی اور اسطواری ہوا کرتے تھے۔ اپنی قوم پرستی کے باوجود اُس نے ان تین کرداروں یعنی خشایارشاہ، اس کی ماں اور اس کے باپ ''دارائے بزرگ کی روح'' کو ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈرامے میں خشایارشاہ جسے یونانی XERXES (زرکسیز) کہتے تھے، ۴۸۰ ق م کی جنگ سلامس کے بعد اسٹیج پر آتا ہے ایتھنز کا بحریہ ایرانی بحریے کو بالکل تباہ و برباد کر چکا ہے۔ دارائے اعظم کی بیوہ یعنی خشایارشاہ کی ماں اور ایرانی امراء کے کورس کو ایک پیغامبر مان کر شکست کی مفصل اطلاع دیتا ہے۔ اس سے قبل دارا کی روح (ہملٹ کے باپ کی اولین جھلک!) اسٹیج پر آ کر کہتی ہے کہ اس کے نوجوان لڑکے کی جذباتیت اور جلد بازی نے یہ دن دکھایا۔ دارا خود ایک عاقل حکمران دکھایا گیا ہے جسے اپنی فتوحات کے باوجود یہ معلوم تھا کہ حد سے زیادہ بلند حوصلے ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ملکہ کہتی ہے کہ اس کے بچے کو مشیر اور صلاح کار غلط ملے۔ اب خشایارشاہ سامنے آتا ہے جو اپنی تباہ حالی اور ہزیمت خوردگی کی وجہ سے کلاسیکل ٹریجڈی کی مجسم تصویر ہے۔ ڈرامے کے پہلے حصے میں اس کی ماں ایک شاندار سلطانہ نظر آتی ہے جو اپنے بیٹے کی معرکہ آرائی کے سلسلے میں کورس کے ایتھنز کے متعلق سوالات کرتی ہے۔ اس عظیم المرتبت شاہ بانو کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ دُور افتادہ پھٹیچر شہر کہاں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شہر ایران کی طاقت کا بھلا کیا مقابلہ کر سکے گا۔ شکست کی ناقابل یقین خبر سننے کے بعد وہ اپنے شوہر یعنی دارائے اعظم کی روح بلاتی ہے اور اس سے مشورہ اور دلاسہ چاہتی ہے۔ دارا یہی مشورہ دیتا ہے کہ آئندہ ایران حملے کا ارادہ نہ کرے ___ لیکن دارا کی روح یہ بھی جانتی

ہے کہ اس کی رائے پر عمل نہیں کیا جائے گا اور جلد ہی (یعنی اگلے سال ۴۷۹ ق م میں آیا) ایران کو دوبارہ یونان کے ہاتھوں شکست فاش ہوگی۔ اس المناک پیشن گوئی کے بعد دارا کی روح اپنے مقبرے میں واپس چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کی صلاح پر خوددار اور باوقار ملکہ اپنے محل میں جا کر بہترین پوشاک زیب تن کرتی ہے اور اپنے مصیبت زدہ بیٹے کے بشاش اور باہمت خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ جنگ کے صرف سات سال بعد یعنی ۴۷۲ ق م میں اسٹیج کیا گیا۔ اور جس طرح آج کسی قومی ظفریابی کے بعد اس کے متعلق کامیاب فلم بنتے ہیں ایتھنز کے تھیٹر میں (جہاں تیس ہزار تماشائی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے) اس نے کھڑکی توڑ ہفتے منائے [1]

خشایارشاہ اوّل ۴۶۵ ق م میں مرا اور اس کی جگہ ارتخشیر یا اردشیر اوّل تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی اپنے پیش رو کی مانند پرسی پولس میں مزید محل بنوائے۔ اس کے ایک ایوان کی دیوار پر خط پیکانی میں چار مرتبہ درج ہے ــــ ''یہاں جو چیزیں حسین معلوم ہوتی ہیں ہم نے انہیں خدا کی مرضی سے بنایا۔'' یہ ایرانی حسن پرستی اور حسن کاری کا گویا اوّلین ریکارڈ ہے!

اردشیر کے مرنے کے بعد ۴۲۴ ق م میں خشایارشاہ دوئم صرف تین ماہ حکومت کر سکا۔ جس کے بعد داریوش دوئم نے ۴۰۴ ق م تک راج کیا۔ اردشیر دوئم (۴۰۴ ق م ۔ ۳۵۸ ق م) اور اردشیر سوئم (۳۵۸ ق م ۔ ۳۳۷ ق م) کے زمانے سے سلطنت میں انحطاط شروع ہو گیا۔ دارا سوئم (۳۳۶ ق م ۔ ۳۳۱ ق م) آخری ہنجامنشی حکمراں تھا جس کا سکندر مقدونی نے تختہ اُلٹ دیا۔

ہنجامنشی سلطنت اپنے وقت کی گویا برٹش ایمپائر تھی کہ اس میں دنیا کے سارے برِاعظم شامل تھے (امریکہ و آسٹریلیا دریافت ہی نہ ہوئے تھے) بادشاہ زمین کا مالک تھا۔ وفادار رعایا ''آزات'' اور ''بزرگ'' میں منقسم تھی۔ بادشاہ جس سے خوش ہوتا اسے جاگیر بخش دیتا۔ اس شاہانہ عادت نے فیوڈل نظام کو جنم دیا۔ گدھوں اور چیلوں کو اپنے مرحومین کھلانے

---

[1] روایت ہے کہ ایتھنز میں ڈرامہ نگاری کے ایک مقابلے میں اسکائی لس کے بجائے اس کے کم عمر معاصر سوفوکلز کو ادبی انعام دے دیا گیا۔ جب غصے میں آ کر وہ سسلی چلا گیا جہاں اُس نے ۴۵۶ ق م میں انتقال کیا۔

کی مجوسی اور بافتری رسم بھی رائج تھی مگر شاہانِ ہنحامنشیہ کے مقابر بنائے جاتے تھے جہاں اُن کی مصری وضع سے تجہیز وتکفین ہوتی تھی کہ بادشاہ کی لاش کو موم میں لپیٹ کر رکھنا شرق اوسط کی قدیم رسم تھی۔ زمانے کے دستور کے مطابق بادشاہ کو الوہی درجہ مل گیا تھا۔ جشن نو روز پر وہ خود پروہت بنتا تھا۔ جشن تاج گزاری اس کے جنم دن پر منعقد کیا جاتا تھا۔ گویا اس نے تاج پہن کر نئے شاہی لقب کے ساتھ حیات نو حاصل کی۔ (اسی ہنحامنشی روایت کی بنا پر شاہ محمد رضا پہلوی کا جشن تاج گزاری ان کی سالگرہ کے روز منایا گیا اور پارلیمنٹ نے ان کو نیا لقب شہنشاہ آریہ مہر عطا کیا۔) پسارگاد میں تاجپوشی کے بعد بادشاہ کورش بزرگ کا جامہ تبرکاً پہنتا تھا جنگ کی دیوی کی پوجا کرتا تھا اور ایک غریب کسان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے ذاتی آتش کدے کی آگ ٹھنڈی کر دی جاتی تھی اکثر اس کے اہلِ خاندان اور ملازمین اس کے مرنے کے بعد اظہارِ غم کے طور پر یا خودکشی کر لیتے تھے یا اپنا ایک ہاتھ یا ٹانگ کاٹ ڈالتے تھے (یہ اچھی مصیبت تھی) فرزند اکبر وارث تخت و تاج ہوتا تھا۔ شاہی حرم بے حد وسیع تھے جن میں غیر آریہ بیویاں بھی موجود تھیں آریہ نسل پر فخر کرنا ساسانی دَور میں شروع ہوا۔ مصر کی مانند شاہی خاندان کی شادیاں آپس کے بے حد قریبی رشتوں میں کی جاتی تھیں۔ ہنحامنشی فوج میں ساری محکوم اقوام کے افراد بھرتی کئے جاتے تھے۔ (جس کا نتیجہ جنگِ یونان میں برا نکلا) خوارزمی سپاہی مصر میں اور مصری افسر بلخ میں تعینات تھے۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت نہایت عمدہ سول سروس کام کر رہی تھی، محکمہ ڈاک قابلِ تعریف تھا۔ ہر تین میل کے فاصلے کو ''فرسنگ'' کہا جاتا تھا۔ وشوپتر یا شاہزادے صوبائی گورنر بنائے جاتے۔ (گو صوبہ یہودیہ کے لئے حضرت عزراؑ، اور نحمیاہ نبی وغیرہ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا) وزیر کا عہدہ شروع میں نہیں تھا۔ بعد میں ''ہزارہ پتی'' یعنی شاہی باڈی گارڈ کے افسرِ اعلیٰ نے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ ہنحامنشی سلاطین عموماً مذہبی رواداری برتتے تھے۔ (ورنہ اتنی وسیع سلطنت زیادہ مدت نہ چل پاتی) بعد کی صدیوں میں جب دینِ زرتشت کو فروغ ہوا اس وقت خیر و شر کے مستحکم عقیدے کی وجہ سے اہلِ پارس اخلاقی پاکیزگی میں، ہم عصر اقوام سے ممتاز سمجھے جانے لگے۔ عبرانیوں سے اُن کی دوستی کی ایک وجہ بھی یہی تھی کہ مشرق اوسط میں جہاں انسانی قربانیاں ابھی تک رائج تھیں، ''نیک خیالات، نیک الفاظ،

نیک اعمال'' کی زرتشتی تعلیم کے ان نئے پیروؤں کو اخلاقی و مذہبی لحاظ سے قید بابل کے بعد والے معقول یہودی اپنے ہم مشرب معلوم ہوتے تھے۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ایرانی بچوں کا زمانۂ تعلیم پانچ سے بیس سال کی عمر تک ہے جس میں ان کو صرف تین چیزیں سکھلائی جاتی ہیں: شہسواری۔ تیراندازی اور راست گوئی! ایرانی یونانیوں کے قومی دشمن تھے۔ اس کے باوجود یونانی موزخوں نے ان کی ہمیشہ تعریف کی۔

ہنحامنشیوں نے اشوری اور اراتو فن سنگ تراشی اور طرزِ تعمیر سے بہت کچھ اخذ کیا اور اُن کی ہم عصر موریہ سلطنت کا فن ایک حد تک متاثر ہوا۔ (اشوک کے تین شیروں والے ستون میں جواب ہندوستان کا سرکاری طغریٰ ہے۔ پرسی پولس کے ستونوں کی جھلک نظر آتی ہے) بادشاہوں اور شیروں کی دست بدست لڑائی اشوری سنگتراشی کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ایک اشوری بار ریلیف میں شیر پنجرے سے نکل کر جھپٹ رہے ہیں ان کا رکھوالا پنجرے کے اوپر چڑھا بیٹھا ہے اور بادشاہ سلامت سامنے کھڑے تیر سے نشانہ باندھ رہے ہیں۔ اس سنگی تصویر کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ حضرت دانیال کو قطعی اسی قسم کے پنجرے میں شیروں کے آگے ڈالا گیا ہوگا۔ شیر، بیل مینڈھے، گھوڑے اور عقاب، طاقت پرست اشور کے فنِ سنگ تراشی کے محبوب موتیف تھے۔ STYLISED گھنگھریالے پٹے اور گھنگھریالی داڑھی بھی صورت سازی کی خصوصیت تھی۔ حتیٰ کہ بیلوں کے چہروں پر بھی داڑھی لگادی گئی تھی۔ اس زمانہ میں داڑھیوں کا بڑا زوروشور تھا۔ چنانچہ ہر ایرانی اور اشوری بادشاہ ایک سا نظر آتا ہے۔ یونان و ہند میں داڑھیوں کا فیشن نہیں تھا۔ چنانچہ انڈوگریک فنکاروں نے یونانی دیوتاؤں کی مانند مہاتمابدھ کو بھی کلین شیو دکھایا۔ ورنہ کیا پتہ مہاتمابدھ داڑھی رکھتے ہوں۔ مسلسل گیان دھیان کی مصروفیت میں ان کو شیو کرنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہوگا۔ مگر آپ کو ان کا مجسمہ بھی باریش نظر نہ آئے گا۔ اس کے برعکس قدیم موئین جودڑو والے پروہت کا داڑھی دار مجسمہ شرق اوسط کی روایت میں شامل معلوم ہوتا ہے۔

ہنحامنشی زوال دراصل یونان سے خشایارشاہ کی شکست کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ جنگ سے واپس آنے کے بعد وہ بےچارہ پرسی پولس میں اپنے حرم کی توسیع اور مزید محل بنوانے میں جٹ گیا تھا۔ دربار میں خواتین کا اثر بڑھتا گیا۔ سازشیں شروع ہوئیں اور اسے قتل

کیا گیا۔ یونانی اناطولیہ پر قابض ہوگئے اور مغربی ایشیا میں یونان کا تہذیبی اثر پھیلنا شروع ہوا۔ اِدھر قتل، سازش اور جاسوسی ہنحا منشی دربار کی روایت بن گئی۔ مصر نے یونان کی اعانت سے بغاوت کردی۔ اور آزاد ہوگیا۔ یونانی صوبوں میں بغاوتیں جاری رہیں اور ایرانی مرکزی حکومت یونانیوں میں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کرتی رہی۔ اردشیر اوّل کے بعد تخت حاصل کرنے کے لئے خانہ جنگی ہوئی۔ اردشیر سوئم نے جو ایک خونخوار بادشاہ تھا کچھ عرصے تک سلطنت کو مکمل انتشار سے بچائے رکھا۔ مگر اب فلیقوس (فلپ) مقدونی کے زیرِ اثر یونان متحد ہو چکا تھا۔ اردشیر سوئم کو بھی ایک خواجہ سرا نے زہر دے کر مار ڈالا۔ اور اس کے ایک دُور کے رشتے دار یعنی دارا سوئم کو تخت پر بٹھال دیا گیا اور سکندر مقدونی کے ہاتھوں ہنحا منشی عظمت کے خاتمے کا وقت آن پہنچا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ سکندر کو ذوالقرنین اور خدا کا ایسا نیک بندہ سمجھا جس نے ایک کافر آتش پرست بادشاہ دارا کا قلع قمع کیا۔ چنانچہ پندرہویں صدی عیسوی کی مشہور، فارسی تصنیف روضۃ الصفا میں اس کے مصنف خوندمیر نے دارا و سکندر کی نہایت پرلطف اور عبرت آموز خط و کتابت درج کی ہے۔ مؤرخ لکھتا ہے کہ جب دارا کو سکندر کی فتوحات کی خبر ملی تو اس نے تہرُوس کے باشندوں کو حکم دیا: ''مابدولت کو روم کے اس چیڑ قنات ڈاکو کے متعلق اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم اس لفنگے اور اس کے حوالی موالیوں کو اُٹھا کر ایک دم سمندر میں پھینک دو۔'' بعد ازاں دارا نے سکندر کو مندرجہ ذیل مکتوب بھیجا:

''شہنشاہِ عالم کے پایہ تخت سے:۔

سکندر نامی لُٹیرے کو معلوم ہونا چاہئے کہ مابدولت کی اطلاع کے مطابق تم نے چوروں اور قزاقوں کی ایک نامعقول بھیڑ جمع کر کے ہماری سلطنت پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا ہے۔ اس قسم کی بیہودگی ظاہر ہے کہ رومیوں ہی کو زیب دیتی ہے۔ اب تم پر لازم ہے کہ یہ فرمان پڑھتے ہی اُلٹے پاؤں جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ مابدولت تم کو ایک سونے سے بھرا صندوق اور گدھے پر لدا تِل کا بورا بھیجتے ہیں تا کہ ہمارے مال و دولت کا تمہیں اندازہ ہو جائے جو تِل کے دانوں کی مانند بے شمار ہے۔ ساتھ ہی ایک گیند اور ایک عدد کوڑا ارسال ہے۔ تمہارے لونڈہارپن کا تقاضہ ہے کہ تم اس گیند سے کھیلو اور یہ کوڑا تمہاری پٹائی کے

لئے ہے۔"

سکندر نے بواپسی ڈاک جواب دیا:۔

"ذوالقرنین کی طرف سے اس شخص کے نام جو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور عالمگیر حکمرانی کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ اتنا بڑا شہنشاہ ایک چپڑ قنات سکندر سے خائف ہو گیا؟ کیا دارا کو علم نہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے طاقت اور عزت دیتا ہے۔ ایک فانی انسان جس کی سلطنت کسی لمحے بھی چھن سکتی ہے خدا کس طرح ہو گیا؟ لیکن ہر فرعون نے پکارا موسیٰ۔ سنو۔ اب میں میدانِ جنگ ہی میں تم سے ملاقات کروں گا کہ میں خود کو جلّ شانہٗ کا ایک ادنیٰ اور کمزور بندہ سمجھتا ہوں اور فتح و نصرت اسی پروردگارِ عالم کی جانب سے ہے۔ تم نے جو اشیاء مجھے بھیجی ہیں میں انہیں ایک نیک شگون سمجھتا ہوں۔ یہ کوڑا خود تمہارے لئے تازیانہ عبرت ثابت ہو گا۔ گیند سے ظاہر ہوا کہ جلد ہی ساری دنیا میرے قبضے میں ہو گی۔ سونے کا صندوق اس بات کی علامت ہے کہ تمہارے خزانے عنقریب میری ملکیت بننے والے ہیں۔ رہی تمہاری بھیجی ہوئی تِل کی بوریاں تو گو کہ تِل کے دانے بے شمار ہوتے ہیں مگر بڑی آسانی سے مٹھی میں بھی بھرے جا سکتے ہیں۔ جواباً میں تم کو سرسوں ارسال کر رہا ہوں تاکہ تم اپنی شکست کی تلخی کا مزا ابھی سے چکھ لو۔"

چنانچہ گھمسان کی جنگ ہوئی اور سکندر میاں جیت گئے۔ دارا نے فرات کے اُس پار جا کر مزید فوج جمع کی اور صلح کے طور پر اپنی آدھی سلطنت نذر کرنا چاہی۔ مگر بھائی سکندر سارے ایران پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مندرجہ ذیل خط دارا کو بھیجا:۔

"دارا! اگر مؤرّخ سچ بولتے ہیں تو اس دارا نے جس کے تم ہم نام ہو، عرصہ گذرا یونانی شہروں اور نو آبادیوں کو تاراج کر دیا تھا۔ گو بحری جنگ میں اسے منہ کی کھانا پڑی مگر اس کے جنرل ماردونیس نے سارے یونان کو تباہ کیا ہمارے شہر اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور باغات اُجاڑ کر رکھ دیئے۔ میں تم کو یہ بھی یاد دلا دوں کہ تم نے میرے والد فلپ کے قاتلوں کو رشوت دی اور حالیہ جنگ بھی بزدلی سے تم ہی نے شروع کی۔ (یہ بات قابلِ غور ہے ہر فریق، فریق ثانی پر جنگ شروع کرنے کا الزام لگاتا ہے اور اسے بزدل کہتا ہے) اور تم نے میرے قتل کے لئے ایک ہزار اشرفیاں قاتلوں کو دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ یہ جنگ جو میں

لڑ رہا ہوں محض دفاعی جنگ ہے۔ اور تمہاری مملکت کے بیشتر حصّوں پر میری فتح سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوتا میرے طرف دار ہیں۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم میرے مطیع ہو کر میرے سامنے حاضر ہو تو میں تم کو اور تمہارے بیوی بچوں کو بغیر کسی تاوان کے آزاد کر دوں گا۔ میری فاتحانہ حیثیت کا تمہیں تجربہ ہو چکا ہے اب تم یہ بھی دیکھ لینا کہ میں اپنے مفتوح سے کس عزت کے ساتھ پیش آتا ہوں اس دوران میں مجھے خط لکھو تو یاد رکھنا کہ تم اس سکندر سے مخاطب ہو جو نہ صرف ایک فرمانروا ہے بلکہ تمہارا آقا بھی ہے۔"

ستمبر ۳۳۱ ق م میں مقدونی لشکر نے فراتؔ عبور کیا اور نینوا کے کھنڈروں سے کچھ دور پر وہ جنگ ہوئی جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ بے چارہ دارا میدان چھوڑ کر بھاگا مارا مارا پھرا اور باختر کے صوبیدار کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پچیسؔ سالہ سکندر چند روز بعد اسی بابل میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا جہاں دو سَو سال قبل دارا سوئم کے پیش رو اور ہخامنشی سلطنت کا بانی سائرسؔ اعظم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وارد ہو کر بخت نصرؔ کی جاہ و ثروت کا وارث بنا تھا۔

بابل سے آگے بڑھ کر سکندر نے سُوشؔ اور پرسیؔ پولس کی اطاعت قبول کی اور قصر پرسی پولس میں قیام کیا۔ یہاں اس نے بسلسلہ بین الاقوامی مصالحت خود ایرانی شہزادیوں سے شادیاں کیں۔ قبا پہن کر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھنا شروع کیا اور اپنے فوجیوں کی شادیاں مقامی خواتین سے کروائیں۔ ایک ہنگامہ رہا۔ لیکن شراب بہت پیتا تھا۔ ایک شام ضیافت کے دوران ایتھنز سے ہمراہ آئی ہوئی ایک گلیمر گرل تائیس کی مسرور تجویز پر قصر پرسی پولس میں آگ لگوا دی۔ پھر سوچا ذرا ایک چکّر ہندوستان کا بھی لگا آؤں۔ چنانچہ باختر اور سغد یہ و غیرہ کو جیب میں ڈالتے ہوئے جہلم کے کنارے پہنچ کر اسی مقام پر بھائی پورس کا مقابلہ کیا جہاں کوئی سوا دو ہزار برس بعد ایک اور یوروپین فاتح ایک اور پنجابی فوج سے بھڑے گا[1]۔ پھر بلوچستان ہوتے ہوئے سُوشؔ واپس گیا۔ ۳۲۴ ق م کے موسم بہار میں دوبارہ بابل آ کر سوچتا تھا کہ اسی شہر کو ہیڈ کوارٹرز بنائے کہ سال بھر بعد ہی بخار میں مبتلا رہ کر راہی ملک عدم ہوا۔ اور دنیا کے لئے اپنے افسانے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اس کی سلطنت اس کے سرداروں نے آپس میں بانٹ لی۔ سیلوکس نے ایران کی حکومت سنبھالی اور ہندوستان کا ٹرپ لگایا۔ دریائے سندھ عبور

---

[1] انگریزوں اور سکھوں کا معرکہ چلیاں والا۔ ۱۸۴۹ء

کر کے مہاراجہ چندر گپت موریہ سے ملاقات کی اور معاہدے پر دستخط کیے۔ جس کی تصویریں کھینچیں۔ جن میں دونوں حکمراں مصافحہ کر کے کیمرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ مہاراجہ نے سیلوکس کو پانچ سَو ہاتھی بھی بطورِ تحفہ پیش کئے۔ (آج بھی ہندوستان بسلسلہ خیر سگالی بذریعہ ایر انڈیا بیرونی ممالک کو ہاتھی بھیجتا رہتا ہے۔ یہ ایلیفنٹ ڈپلومیسی کہلاتی ہے) یہ بے حد مفید ہاتھی تھے، کیوں کہ سیلوکس کی فوج ان کی وجہ سے اناطولیہ اور شام میں کامیاب ہوئی۔ اب باختر سے لے کر یہودیہ تک کے ممالک سیلوکس اور اس کے جانشینوں کی عملداری میں آ گئے۔ اور ایک یونانی مؤرخ نے لکھا۔ ''میں تم سے پوچھتا ہوں۔ آج سے پچاس برس قبل پارسیوں یا ان کے تاجدار یا مقدونیہ کے کسی دیوتا نے یہ پیشن گوئی کی ہوتی کہ آج کے دور میں یعنی جب کہ ہم زندہ ہیں اہلِ پارس کا نام و نشان تک مٹ چکا ہوگا جو ایک وقت تھا کہ ساری دنیا کے مالک تھے اور اہلِ مقدونیہ جو پہلے گمنام تھے آج سارے عالم کے فرماں روا ہوں گے ___ تو کوئی یقین کرتا؟''

سیلوکس کے علاوہ دوسرا یونانی سردار جس نے سکندر کے بعد اپنی حکومت قائم کی بطلیموس تھا جو فرعونِ مصر بن بیٹھا۔ اور تین سو سال تک اس کی اولاد وادیٔ نیل پر راج کرتی رہی۔ اسی زمانے میں ہم ایک بار پھر یہودیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔

ہخامنشی دور میں یہودیوں نے مدتوں بعد اطمینان کا سانس لیا تھا۔ تب ہی بابل سے لوٹ کر آلِ ابراہیم نے مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ توراۃ کے قوانین رائج ہوئے اور انجیل کے وہ ابواب لکھے گئے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہودیہ اب بطلیموسی فراعنہ کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن حصولِ اقتدار کے لئے بطلیموسی اور سیلوکسی خاندانوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں اور یہودیہ پر مختلف اوقات میں شام اور مصر کا تصرّف رہا۔ بطلیموسی حکمران یہودیوں کے دوست ثابت ہوئے۔ بطلیموس اوّل نے اسکندریہ بسا کر اس میں یہودیوں کی نوآبادی قائم کی اور اسکندریہ یونانی اور یہودی علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا۔ بطلیموس اوّل ہی نے اس شہر کی مشہور لائبریری اور میوزیم[1] تعمیر کروایا۔ بطلیموس دوئم نے اسکندریہ کے قریب روشنی کا وہ مینار بنوایا

---

[1] یہ لفظ اب عجائب خانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ دراصل فنونِ لطیفہ کی نَو یونانی دیویوں یعنی MUSES کا مندر تھا جس میں دار العلوم آرٹ گیلریاں وغیرہ شامل تھیں۔

جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا۔ بطلیموس سوئم ایران جا کر وہ قدیم مصری نوادر اور دیوتاؤں کے بت واپس لے آیا جو ہنجا منشی فاتح مصر کمبوجیہ دوئم یہاں سے سُوش لے گیا تھا۔ اسکندریہ ہی میں ستر یہودی عالموں نے انجیل مقدس کا ترجمہ عبرانی سے یونانی میں کیا لیکن دوسری صدی قبل مسیح میں ایران و شام کے سلوقی حکمران انطیوکس چہارم نے (جسے نسلاً اپنے یوروپین ہونے پر بے حد فخر تھا) اپنی ایشیائی رعایا کو "مہذب" کرنے کا بیڑا اُٹھایا اس وقت یہودیہ شام کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ سرکاری حکم سے یروشلم میں جمنزیم قائم ہوا یونانی نام رائج کئے گئے اور ایتھنز سے ایک فلسفی عوام کو یہ سمجھانے کے لئے بلوایا گیا کہ یاہ وِیہہ دراصل جیوپیٹر دیوتا ہی کا نام ہے۔ ہیکل میں یونانی دیوتاؤں کے بت سجا دیئے گئے اور دین موسویؑ کی پابندی جرم قرار پائی۔ اسی زمانے میں غصّے کے مارے یہودی مصنّفین نے صحیفہ دانیالؑ میں زوال یونان کی اس پیشن گوئی کا اضافہ کیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کچھ عرصے بعد سلطنت یونان کے بھی برے دن آ گئے اور مغرب میں اس کی جگہ روم نے لے لی۔ جس نے یہودیہ پر تسلّط جما کر اس کا نام فلسطین رکھ دیا۔ اِدھر تیرہویں بطلیموس کی لڑکی ملکہ مصر ایلز بتھ ٹیلر نے رچرڈ برٹن اور ریکس ہیریسن دونوں کے ساتھ بیک وقت فلرٹ کیا اور ۳۰ ق م میں اپنی جان گنوائی۔ اس کی موت کے بعد مصر بھی روم کا ایک صوبہ بن گیا۔ فلسطین کے رومی گورنر کے دور میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت عوام کی حالت بیحد خستہ ہو چکی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ نے بھی قدیم عبرانی پیغمبروں کی روایت کے مطابق جابر حکومت اور حکومت کے پٹھو کاہنوں کی مخالفت کی اور ان کو صلیب پر پہنچایا گیا۔ چند سال بعد ہی یہودی بغاوت زیادہ شدید ہوئی، جسے فرو کرنے کے لئے رومی فوج نے بیت المقدس پر دھاوا بولا اور ۷۰ء میں تقریباً اسی روز جب آج سے ساڑھے چھ سو سال قبل بخت نصر نے ہیکل کو تباہ کیا تھا۔ رومیوں نے اس نئے ہیکل کو جو دارائے اعظم کے حکم سے دوبارہ بنایا گیا تھا۔ نذرِ آتش کر دیا۔

رومن عہد میں یہودی ایک بار پھر جلاوطن ہوئے اور فلسطین سے نکل کر سارے مغربی ایشیا شمالی افریقہ اور یوروپ میں بکھر گئے۔

سلیوکی یونانی اقتدار مغرب میں روم اور مشرق میں وسط ایشیائی قبائل کے ہاتھوں ختم ہوا۔ باختر میں سیلز کی تسلّط سے علیحدہ ایک یونانی باختری حکومت قائم ہوگئی جس نے اپنا

دائرۂ اقتدار شمالی مغربی ہند تک پھیلایا۔ دوسری طرف جنگجو شہسواروں کے پارتی قبیلے نے سلیوکی آقاؤں سے بغاوت کر دی۔ اس قبیلے کے سردار بھائی ارشک اور تیرداد تھے جنھوں نے ۲۵۰ ق م کے لگ بھگ ایران میں پارتھین یا اشکانی عہد کی بنیاد رکھی۔ معلوم پارتھین خود اپنے آپ کو کیا کہتے تھے۔ بہر حال یونانیوں نے ان کے علاقے مشرقی ایران یا خراسان کو پارتھیا کہا۔ سلیوکی حکومت بہت تیزی سے تتر بتر ہونے لگی اور سو سال کے اندر اندر پارتھین حکمران مہرداد اول نے فرات سے لے کر ہرات تک اپنے تصرّف میں لے لیا۔ مہرداد پنجاب جا کر وہاں کی باختری حکومت کا تیاپانچہ بھی کرتا آیا۔ اُس نے دجلہ کے کنارے ایک وسیع فوجی چھاؤنی قائم کی جو بعد میں پارتھین دارالسلطنت تیسفون کہلائی مہرداد کے لوکے فرہاد نے ۱۲۹ ق م میں سلیوکی حکمران انطیوکس چہارم کو زبردست شکست دی اور اس تاریخ سے گویا ایشیا میں ہیلینی یونانی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

اس طرف ایک وسط ایشیائی قبیلے شاکا نے افغانستان اور مشرقی ایران کے خطوں پر قبضہ جما رکھا تھا جس کی وجہ سے ان جگہوں کو شاکستان یا سیستان کہا جاتا تھا۔ یونانیوں نے ان کو سیتھیا کہا (سارے وسط ایشیائی قبائل کو عام طور سے سیتھین ہی کہا جاتا تھا) پھر اہلِ پارتھیا نے سیستان پر قبضہ کیا اور سیتھین اور پارتھین سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اسی دوران میں یہ حضرات ہندوستان میں براجتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے ناموں اور نسلوں اور مختلف حکومتوں میں بڑا سخت کنفیوژن ہے۔ مثلاً یہ شاکا پہلوا اور انڈو پارتھین یا سیتھین پارتھین سبھی کچھ کہلاتے ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون کیا ہے۔ پھر ان ہی میں باختری یونانی اور بعد میں یوچی یا تو خاری مزید جھمیلے پیدا کرنے کے لئے شامل ہیں۔ گتھی کچھ اس طرح سلجھ سکتی ہے کہ شاکا لوگوں نے ہندوستان پر یلغار کی اور حکومت قائم کرنا اتنی آسان بات معلوم ہوتی ہے کہ جسے دیکھئے اس نے حکومت قائم کر لی۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں بھی یہی حرکت کی اور یہاں سات عدد ''کھشتر اپ'' اور ''مہا کھشتر اپ'' قائم کر لئے۔ پہلی صدی عیسوی میں یہاں باختری یونانی ریاستیں تو تھوڑی سی رہ گئی تھیں۔ شاکا صاحبان متھرا میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اب پھر کچھ گھپلا ہوتا ہے اور یہ ''شاکا پہلوا'' بن جاتے ہیں یعنی ان میں ایران کے پارتھی پہلوان شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا بڑا بھاری بادشاہ GONDOPHARES ہے اور اس

کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ اسے مسیحی حکایت کے ان تین مشرقی بادشاہوں میں سے ایک سے مماثل کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش پر تحفے تحائف لے کر بیت لحم گئے تھے۔ دوسری مسیحی روایت کے مطابق اس نے اپنا ایک سفیر ملک شام بھیجا تا کہ وہاں سے چند معمار چنڈی گڑھ کی قسم کا ایک نیا شہر تعمیر کرنے کے لئے منگوائے۔ یہ سفیر کسی مستند آرکی ٹیکٹ کے بجائے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ طامس کو ساتھ لے آیا۔ سینٹ طامس نے اس شا کا پہلوا بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ میں ایک ایسے شہر کی تجھے خوشخبری دیتا ہوں جسے انسانی ہاتھوں نے نہیں بنایا۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ اے بادشاہ تو سیدھے سیدھے عیسائی ہو جا۔ چنانچہ بادشاہ (جس کا نام دوبارہ لکھنا بہت طوالت ہے) مع اپنے اہل و عیال و دربار کے کرسچین ہو گیا اور اس کے بعد سینٹ طامس نے ساؤتھ انڈیا جا کر وہاں تبلیغ کی۔ بہر حال ان انڈو پارتھین پہلوانوں نے مالوہ، کاٹھیاواڑ، گجرات، ٹیکسلا، متھرا اور شمالی دکن وغیرہ پر مدتوں حکومت کی اور مقامی آبادی میں مدغم ہو گئے (کاٹھیاواڑ کے ہندو کسان آج تک یونانی وضع کی کرتیاں پہنتے ہیں اور پیچدار پگڑیاں اور گھیردار شلوار نما دھوتیاں باندھتے ہیں) بعد ازاں چینی ترکستان سے یوچی یا توخاری صاحبان وارد ہوئے۔ انہوں نے ہند کے باختری یونانیوں اور شاکا پہلوا دونوں کا صفایا کیا اور کشان سلطنت مشہور و معروف قائم کی۔ چنانچہ کنشک اوّل وہ زبردست شخص تھا جس نے باختر سے لے کر بنارس تک راج کیا اور بدھ مت کی جو سرپرستی کی وہ الگ۔ یہ یوچی یا کشان بھی شاکاؤں کی طرح ایرانی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبان بولتے تھے۔ گو چہرے مہرے سے اقوام زرد پوست کی مانند تھے۔ مہاراجہ کنشک جس کی راجدھانی پشاور تھی خود نسلاً شاکا نہیں تھا مگر ناموں کے اسی کنفیوژن کی وجہ سے وہ کیلنڈر جو اس سے منسوب ہے شاکا کہلاتا ہے (یہ ۷۸ء سے شروع ہوتا ہے اور جنوبی ہند ہوتا ہوا یہی کیلنڈر جنوبی مشرقی ایشیا جا پہنچا۔)

اسی راجہ کنشک والی یوچی قوم نے ایران پہنچ کر بھی تباہی مچائی اور وہاں کا پارتھین بادشاہ مہرداد دوئم ان سے نپٹتا رہا۔ فرہاد دوئم اور مہرداد سوئم روم سے لڑنے جھگڑنے میں مشغول رہے۔ دونوں نئی طاقتوں کے درمیان فساد آرمینیہ نے کھڑا کروایا تھا جس نے رومن اور پارتھین سلطنتوں کی درمیانی BUFFER ریاست کی حیثیت سے بڑی پیچیدہ سازشیں شروع

کر رکھی تھیں بالآخر ۵۳ ق م میں پارتھیا نے روم کو وہ زبردست شکست دی کہ ایک بار پھر ایک یوروپین سلطنت کو ایران کا لوہا ماننا پڑا۔ ایرانی شہسواروں نے روم کی پیادہ فوج کا بھرتہ بنا دیا۔ ادھر روم کی سام النسل محکوم اقوام یعنی یہودی اور عرب قبائل ایک مرتبہ پھر ایران کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے اور انجیل مقدس کے ابواب میں پارتھین شہسواروں کی فتح کی پیشن گوئی کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ فرہاد چہارم اور مارک انطونی کی افواج میں گھمسان کا رن پڑا۔ مارک انطونی کو پسپا ہونا پڑا اور فرہاد نے مارے خوشی کے مالِ غنیمت میں جو رومی سکے ہاتھ آئے تھے ان کے اوپر ''انطونی اور کلیوپیٹرا'' کے ناموں کے اوپر اپنے نام کا اضافہ کروا دیا۔ سیزر آگسٹس نے جو سکندر کے جانشین کی حیثیت سے تسخیر ایشیا کے خواب دیکھ رہا تھا اپنا ارادہ بدل دیا اور فرہاد چہارم سے دوستی کر لی۔ لیکن ہنحامنشیوں کے دورِ انحطاط کی مانند اشکانی ساسین کے ہاں بھی خانہ جنگیاں اور سازشیں شروع ہو گئیں اور اسٹیج پر ساسانیوں کے نمودار ہونے کا وقت آ گیا۔

پارتھین سلاطین پہلے یونانی اور بعد میں رومی تمدن سے بہت متاثر تھے۔ ان کے شہزادے اکثر سیاسی یا کلچرل کانفرنسوں میں شامل ہونے کے لئے اٹلی جایا کرتے۔ لیکن اس کے باوجود اشکانی دور میں ایرانی کلچر کی تجدید ہوئی۔ اشکانی سماج بنیادی طور پر دلاور سورماؤں کا سماج تھا۔ قدیم ہنحامنشیوں کی طرح ان کے ہاں بھی ایک نوع کا فیوڈل نظام قائم ہوا۔ رزمیہ داستان گوئی فیوڈل سماج کا خاصہ ہے۔ پارتھین اشکانی سورما پہلوان کہلاتے تھے اور ان پہلوانوں کی داستانیں درباروں میں سنائی جاتی تھیں۔ زیادہ تر ان ہی قصوں پر ایران کے قومی رزمیہ شاہنامے کی بنیاد رکھی گئی۔ اہلِ پارتھیا کی زبان ہنحامنشی فارسی سے مشابہ تھی۔ اور چونکہ پہلوانوں کی زبان تھی اس لئے پہلوی کہلائی سیستان کے مشرق یعنی توران کے یُوچی یا تو خاری قبیلے سے اہلِ پارتھیا کی مسلسل جنگوں نے افراسیاب تُورانی اور رستم سیستانی کی جنگ کی روایت تیار کی۔ (قصہ رُستم کا کچھ حصہ سُغدی زبان میں لکھا ہوا چینی ترکستان میں بھی دستیاب ہوا ہے۔) پارتھین سماج جاگیرداروں، آزاتان (آزادان) وزرکان (بندگان) اور پہلوانوں یعنی فوجی سرداروں پر مشتمل تھا۔ یونانی اور رومی اثر کی وجہ سے ہرقلیس پہلوان کا بھی بہت چرچا تھا۔ (پہلوانی اکھاڑے آج تک اہلِ ایران کی محبوب تفریح گاہ ہیں۔) دین

زرتشت نے بھی خراساں ہی میں جنم لیا تھا۔ چنانچہ قدیم حکایات، مذہبی روایتوں اور دلاوری کے قصوں نے ایک قومی دیو مالا کی تخلیق کی۔ گھوڑا ایک نہایت قابل قدر جانور تھا بہترین گھوڑے کا مالک ہونا دلاور کا ایک وصف تھا۔ چنانچہ داستانوں میں لہرسپ (تیز گھوڑے کا مالک) طہماسپ (زورمند گھوڑے کا مالک) ارجاسپ (قیمتی گھوڑے کا مالک) وغیرہ ناموں کی افراط دیکھ لیجئے۔ پارتھین مذہب کے معاملے میں روادار تھے۔ یہودیوں سے ان کی دوستی کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ پارتھین دور میں بابل یہودیوں کا علمی مرکز قائم ہوا۔ رومیوں کے خلاف یہودی بغاوت میں بھی اشکانیوں نے بنی اسرائیل کی مدد کی (اور فلسطین میں یہ کہاوت مشہور ہوئی کہ جب تمہیں ایک پارتھین گھوڑا کسی سنگ مزار سے بندھا کھڑا نظر آئے تو جان لو کہ ظہور مسیح کا وقت آن پہنچا۔) پہلی صدی عیسوی میں ایرانی، یونانی اور پرتھین فنی امتزاج سے ایران کے درباری آرٹ نے جنم لیا۔ اپنی تہذیبی اور سیاسی عظمت کے ایک نئے دور کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

پارتھین دور کے خاتمے اور آلِ ساسان کے عروج کے درمیانی وقفے میں ایک نئی سیاسی پیچیدگی پیدا ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ کرسٹان لوگ عالم وجود میں آچکے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک محنت کش یہودی جو خیمے بنانے کا کام کرتے تھے اور جن کا اصل نام ساؔل تھا اور پھر عیسائی ہوکر سینٹ پال کہلائے زور شور سے اپنے تبلیغی سفر پر نکلے اور اناطولیہ ایشیائے کوچک اور یونان میں کلیسا قائم کئے اٹلی پہنچے وہاں اُن کو قید کرلیا گیا۔ روم والے نیرو نے (جسے سارنگی پر بے وقت کی راگنی چھیڑنے کا بہت شوق تھا) انہیں بہت ستایا اور ۶۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سینٹ پال نے شریعت موسویؑ کے بہت سے قوانین منسوخ کئے اور یوروپین عیسائیوں کو پورک کھاتے رہنے کی اجازت دے دی لیکن سب سے زیادہ عیسائی سب سے پہلے مصر میں ہوئے جو قبطی کہلائے۔ (COPT=GOPT=EGYPT) قبطیوں ہی نے رہبانیت کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک قبطی بزرگ سینٹ انطونی (غالباً ۲۵۱ء۔۳۵۶ء) نے مصر میں سب سے پہلی خانقاہ قائم کی اور بہت جلد سارے صحرائے مصر و شام میں ان گنت خانقاہیں بن گئیں جن کے راہب ہندو سادھوؤں کی طرح طرح عجیب عجیب طریقوں سے تزکیہ نفس کرتے ایک مقبولِ عام طریقہ اونچے اونچے ستونوں پر چڑھ کر بیٹھ رہنے کا تھا۔ تیسری

صدی عیسوی تک نظریہ تثلیث زیادہ رائج نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسکندریہ میں یونانی فلسفے کا زور تھا۔ وہاں یونانی LOGOS کے نظریے کے زیرِ اثر ''کلمہ جو خدا کے ساتھ تھا اس نے یسوع کے روپ میں اوتار لیا (دین زرتشت میں بھی کلمہ تخلیق کائنات سے قبل موجود تھا۔) اب ''ایک'' اور ''تین'' والے عیسائیوں میں سخت جھگڑا شروع ہوا۔ تثلیث والے کہتے تھے کہ مسیح کی ذات بشریت اور الوہیت کا مجموعہ ہے۔ یہ مسیح کی وحدتِ فطرت'' کے حامی کہلائے۔ قبطی ہزارہا سال سے دیوی اسس کی مورتیاں پوجتے آئے تھے جن میں وہ اپنے بچے یعنی دیوتا ہورس کو دودھ پلاتی دکھائی جاتی تھی۔ اور چوں کہ مسیح کی وحدت فطرت کے قائل ہو چکے تھے لہٰذا حضرت مریم لامحالہ ''مادرِ خداوند'' ہوگئیں۔ اسس اور ہورس کی جگہ عیسیٰ و مریم کے مجسموں نے بآسانی لے لی۔ اس طرف قیصر روم قسطنطین نے عیسائی ہوکر ۳۲۶ء میں قسطنطنیہ بسایا اور روم سے علیحدہ بازنطیم کی حکومت قائم کی۔ (بازنطیم اس جگہ پر عہدِ قدیم میں ایک یونانی شہری ریاست کا نام تھا۔) اور مسیحت اناطولیہ اور آرمینیہ میں بھی پھیل گئی۔ ''ایک'' اور ''تین'' والوں کا جھگڑا زیادہ شدید ہوتا جارہا تھا۔ چنانچہ کلیسا کی جنرل کونسل نے جونیسیا (اناطولیہ) میں منعقد ہوئی ۳۲۵ء میں بالاتفاق رائے یہ ریزولیشن پاس کر دیا کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین خدا ہیں۔ جو ایک بھی ہیں۔ تھیوڈوسیس اعظم شہنشاہِ بازنطیم نے ۳۸۱ء میں اپنے فرمان کے ذریعے ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ خدا قطعی تین ہیں۔ عبرانی انبیاء نے ایمان بالغیب اور توحید کے پرچار کے لئے پچھلے دو ہزار سال تک جدو جہد کی تھی اور یہودی اب صدیوں سے توحید کے بڑی شدت سے قائل تھے۔ تثلیث اور اوتار کے عقیدے کے اس فروغ نے پیغمبروں کی ان ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ انبیاء اور یہودی علماء نے گردوپیش کی بت پرستی سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ عیسائیت نے مصر اور یونان و روم کے اساطیری تصورات سے بھی سمجھوتہ کرلیا۔ چنانچہ ردِعمل کے طور پر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو پیغمبر تک ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ ادھر عیسائیوں نے یہودیوں کو'' قاتلان مسیح[1] '' کہہ کر ان پر جور و تشدد شروع کیا اور آئندہ دو ہزار سال تک یوروپ میں اُن کا بھرتہ

[1] کیمونزم کے خلاف مذاہب کے اتحاد اور عالمی سیاست کی دوسری مصلحتوں کی خاطر حال ہی میں پاپائے روم نے اپنے فرمان کے ذریعے یہودیوں کو ''قتل مسیح'' کے جرم سے بری کر دیا ہے۔ ادھر عرب قوم پرستی کے خلاف مغرب کے عیسائی اور یہودی سب ایک ہو چکے ہیں جو دراصل خود کو برتر سمجھنے والی مغربی اقوام کا مشرقی نشاۃ ثانیہ کے خلاف اتحاد ہے۔ چنانچہ اب مغرب کی یہودی مصنف'' عیسائی یہودی غلط فہمیوں'' کا ازالہ کرنے میں جٹے ہیں۔

بناتے رہے مصری کلیسا حد سے زیادہ کٹر ثابت ہوا۔ اور اوائل پانچویں صدی میں اسکندریہ کے عیسائیوں نے یہودیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ اور یہودیت اور یونانی عقلیت پرستی دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا گیا۔ اس زمانے کا سب سے المناک واقعہ یونانی فلسفی اور ماہرِ ریاضی خاتون ہائی پیشیا[1] ادھر اسکندریہ کے اسقف اعظم سرل کو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی عیسائیوں کو مارنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ عیسائی یہودیوں پر حملہ کر دیتے ہیں یعنی بڑا سخت فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے۔ بھائی فلیمن بھی مارا ماری میں شامل ہو کر یہودیوں کا صفایا کرنے میں جُٹ جاتے ہیں آپ ہائی پیشیا سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ جو ابھی تک یونانی دیوتاؤں کی قائل ہے لہٰذا فلیمن پر ارتداد کا الزام لگایا جاتا ہے رفائیل بن عزرا ایک امیر یہودی نوجوان بھی ہائی پیشیا کا شاگرد ہے مگر وہ عیسائی ہو جاتا ہے۔ فلیمن کی بہن ملیچیا ایک حسین طوائف ہے جو بعد میں صحرا میں جا کر تائیس کی طرح راہبہ بن جاتی ہے اور بطریق سرل کے راہب ہائی پیشیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔) کا قتل ہے۔ جسے بشپ سرل کے حکم سے رتھ کے پہیے سے باندھ کر انتہائی بربریت کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ ۴۱۴ء میں یہودیوں کو اسکندریہ سے بھی جلاوطن کر دیا گیا۔ (ان کارناموں کی وجہ سے بشپ سرل کو مرنے کے بعد کلیسا نے سینٹ سرل بنا دیا۔) گو خود کلیسا کے اندر مختلف فرقے بڑھتے گئے۔ نسطوریس بطریقِ قسطنطنیہ نے ۴۲۸ء میں اعلان کر دیا کہ مسیحؑ کی فطرت میں الوہی اور انسانی صفات علیٰحدہ علیٰحدہ تھیں۔ چنانچہ پھر سخت تکرار ہوئی اور نسطوری کلیسا علیٰحدہ ہو گیا بازنطیم کا کلیسا ''مشرق قدامت پرست'' یا ''یونانی قدامت پرست'' کلیسا کے نام سے بہت طاقتور ہو گیا (اور بعد کی صدیوں میں روس تک پھیلا) اسی زمانے میں ڈالمیشیا کے سینٹ جیروم نے انجیل مقدس کا ترجمہ لاطینی میں کیا) لیکن اب مسیحی بازنطیم کو مشرق میں ایک نئے اور زبردست حریف کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی آتش پرست ساسانی ایران۔!

---

[1] وکٹورین مصنف چارلز کنگز لے کے ناول ہائی پیشیا میں بیان کیا گیا ہے کہ فلیمن نامی ایک نوجوان راہب صحرا سے نکل کر سکندریہ کی زندگی دیکھنے شہر آتا ہے۔ (اسی طرح اناطول فرانس کے ناول میں ایک صحرائی راہب شہر آ کر طوائف تائیس کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے اور خود اس کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔

پہلوی کتاب کارنامک اردشیر کا کہنا ہے (اور یہ بھی سائیرس اعظم کی پیدائش کی حکایت سے مشابہہ ہے) کہ پرسی پولس کے نزدیک شاہ پاپک حاکم شہر کے ہاں ایک گڈریہ ملازم تھا جس کا نام ساسان تھا یہ ساسان دراصل شاہن ہنحامنشیہ کی نسل سے تھا۔ (سلطنت کے بانی کا شاہی نسل سے ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح آل ارشک اپنا سلسلہ نسب اردشیر سوئم سے ملاتے تھے) مگر کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی، پاپک نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کا بیٹا ساری دُنیا کا بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ پاپک نے اپنی لڑکی کی شادی اس گڈریے سے کردی اور اردشیر پیدا ہوا۔ ایک اور حکایت کے مطابق ساسان اصطخر کے مندر کا پروہت تھا۔ اس کے بیٹے پاپک ________ نے مقامی شہزادے گوچہر کی لڑکی سے شادی کی اور اس سے زبردستی حکومت چھین لی۔ (یاد کیجیئے اسی طرح سائرس اعظم نے اپنے نانا سے میڈیہ کا تخت چھین لیا تھا) ایک رومن مورّخ نے لکھا کہ پاپک ایک جوتشی اور منجّم تھا۔ اس کے گھر میں ساسان نامی ایک سپاہی مہمان ٹھہرا۔ اس کی بلند بختی کا اندازہ لگا کر پاپک نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور اردشیر پیدا ہوا۔ چند اور روایات کے مطابق ساسان فارس کا ایک امیر زادہ تھا پاپک اس کا بیٹا اور اردشیر پوتا تھا اور غالبًا یہی صحیح ہے کیوں کہ پرسی پولس میں شاہ پور اوّل کے کتبے سے قیاس کیا گیا ہے ساسان ایک امیر، اور شاہ پاپک کا پُرکھ تھا۔ اور پاپک شاہ پور کا دادا تھا۔ بہر حال اسی پاپک (جو غالبًا فارس کا گورنر تھا) کے لڑکے اردشیر نے اشکانی بادشاہ اردوان پنجم سے ۲۲۵ ق م جنگ کر کے تیسفون پر قبضہ کرلیا۔ اور کشان سلطنت، بین النہرین اور آرمینیہ کے علاقوں پر تسلّط جمایا۔ اس کے بیٹے شاہ پور اوّل نے ۲۶۰ ق م میں قیصرِ روم ولیرین کو شکست دے کر ستّر ہزار رومی سپاہ کو قید کیا۔ رومی بہترین انجینئر تھے (آج تک "اٹلی والے انجینئر نگ میں لاثانی ہیں) چنانچہ انہی اطالوی جنگی قیدیوں سے ایرانیوں نے فنِ تعمیر میں بہت کچھ سیکھا۔ شاہ پور دوئم کے عہد میں کشان سلطنت بھی ایران کا ایک حصّہ بن گئی اور بلخ اس کا مستقر قرار پایا۔ بازنطیم کا شہنشاہ قسطنطین شاہ پور اوّل کا ہم عصر تھا۔ چوں کہ ارمنی عیسائی ہو چکے تھے حکومتِ ایران نے ان کو بازنطیم کا جاسوس سمجھنا شروع کردیا۔ لیکن

اسی زمانے سے زرتشتی اور مسیحی عقائد کی تبلیغ شروع ہوئی۔ ایرانی مصور مانی نے یونان کے غناسی، مسیحی، زرتشتی اور بودھ تصورات کو ملا جلا کر ایک نیا کشادہ مشرب مذہب ایجاد کیا عالمگیر اخوت جس کی اساس تھی۔ اسی وجہ سے مانی کو دین بہائیہ کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ مانی کی ماں روایت کے مطابق اشکانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور یہ کنبہ ہجرت کر کے ہمدان سے بابل چلا گیا تھا۔ دین مانی دُور دُور روم و چین تک پھیل گیا اور روم میں پیروانِ مانی کو ایران کا جاسوس سمجھا جانے لگا۔ قرونِ اولیٰ کے عظیم مسیحی مفکر سینٹ آگسٹین جو شمالی افریقہ کے باشندے تھے شروع میں مانوی عقائد کے پیرو رہے۔ مانی کو غالباً بہرام اوّل کے حکم سے ۲۷۴ء میں قتل کیا گیا۔ بہرام گور اور کواد اوّل (عربی= قباد) کے دور میں مجوسی موبدوں اور امراء کا زور بہت بڑھ گیا۔ جاگیرداروں نے کسانوں پر ظلم توڑنے شروع کئے۔ اور مزدک خراسانی نے اپنی سوشلزم کا پرچار کیا۔ مزدکیت دین مانی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ چنانچہ قباد اوّل نے مزدکیوں کا قلع قمع کیا اور بائیں بازو کی تحریک کو کچلنے کی رسم کا اجراء ہوا۔ مگر خسرو اوّل یعنی نوشیرواں عادل (۵۳۰ء۔ ۵۷۶ء) نے موبدوں اور امیرزادوں کو مطیع کر کے مزدکیوں کی سرپرستی کی اور قیصرِ روم سے لڑ کر شام پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ بعہد نوشیروانِ عادل محمدؐ رسول اللہ ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔

نوشیرواں کا بیٹا ہرمز چہارم (۵۷۹ء۔ ۵۹۰ء) بے حد ذہین اور بہت پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے بھی اپنے والد کی طرح جاگیرداروں اور موبدوں کو قابو میں رکھنا چاہا۔ (اقتدار کے لئے بادشاہ کا طبقہ امراؤ اور مذہبی قائدین سے کش مکش ایران کا پرانا مسئلہ ہے جو موجودہ شہنشاہ ایران کی لائی ہوئی اصلاحات سے قبل تک باقی تھا)۔ اپنی حمایت کے لئے اس نے اپنی عیسائی رعایا کا سہارا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موبد اس کے اور زیادہ خلاف ہو گئے۔ بہرام چوبیں ایرانی فوج کا سپہ سالار تھا جس نے شمال کے ترکستانی قبائل کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ لیکن بازنطیم کے مقابلے میں اسے متواتر ہارنا پڑا۔ اسی وجہ سے ہرمز نے ناخوش ہو کر اسے اپنے عہدے سے معزول کرنا چاہا۔ بہرام چوبیں فوج اور عوام میں بے حد مقبول تھا۔ اس نے بغاوت کر دی۔ امراء نے اس کا ساتھ دیا۔ ہرمز کو زنداں میں ڈال دیا

گیا۔ اور اس کے لڑکے خسرو پرویز دوئم کو تاج شاہی پہنا دیا گیا۔ لیکن بہرام چوبیں جو اشکانی امراء کے ارفع ترین خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اشکانی بادشاہت کی تجدید کا آرزومند تھا۔ فوج کی اعانت حاصل کر کے اس نے دارالسلطنت اور ایوان شاہی پر قبضہ کرلیا اور سال بھر تک حکومت کی۔ خسرو پرویز نے بھاگ کر بازنطیم میں پناہ لی جہاں شاہ جسیٹن نے اسے اپنا بیٹا بنالیا اور ایک بازنطینی شہزادی ماریا سے اس کی شادی کر دی (جو نظامی گنجوی کی مثنوی ''خسرو شیریں'' میں مریم کے نام سے جلوہ گر ہے۔ ادھر بہرام چوبیں کو بھی ایک عوامی ہیرو کا درجہ مل گیا) بازنطیم سے فوجی امداد لے کر خسرو پرویز وطن لوٹا اور بہرام چوبیں کو قتل کر کے اپنی شاہی وراثت کا مالک بنا۔ کچھ عرصے بعد بازنطیم میں بھی بغاوت ہوئی اور ایک صوبے دار ہرقل نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا۔ اب ۶۰۳ء میں خسرو پرویز نے ہرقل کے خلاف قسطنطنیہ پر چڑھائی کر دی اور فلسطین سمیت متعدد بازنطینی صوبوں پر قابض ہو گیا بیت المقدس کے یہودی بازنطینی حکومت سے پہلے ہی سخت نالاں تھے۔ انہوں نے حسب معمول ایک بار پھر ایرانیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کا ساتھ دیا۔ اس صلیب کو جس پر مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا تھا خسرو پرویز اکھاڑ کر ایران لے گیا اور یہودیوں نے خوب بغلیں بجائیں۔ بعد ازاں خسرو نے مصر پر حملہ کیا اور طرابلس کو اُجاڑا۔ ہرقل کی اس سے کنار دجلہ اسی جگہ جہاں سکندر دارا سوئم سے بھڑا تھا، بڑی بھیانک جنگ ہوئی۔ اب ہرقل بغلیں بجاتا ایران جاکر صلیب واپس لے آیا۔ اور جب یروشلم میں داخل ہوا ہے تو عیسائیوں نے اس کی راہ میں قالین بچھائے۔

خسرو پرویز نے سلطنت کو بے حد وسعت دی تھی۔ لیکن شان و شوکت عیش و عشرت کا دلدادہ اور سخت فضول خرچی اور بد دماغ بادشاہ تھا (اسی کو رسولؐ اللہ نے دعوت اسلام دی تھی اور وہ مسلمان قاصدوں سے انتہائی بدتمیزی اور گستاخی کے ساتھ پیش آیا تھا)۔ بے حد رومینٹک بھی تھا۔ چنانچہ ارمنی شہزادی شیریں پر عاشق ہوا۔ اور بازنطینی ماریا کی وفات کے بعد اس سے شادی کی۔ شیریں سے اس شادی میں عشق و محبت سے قطع نظر اس کے وزیر شاپور کی مصلحت یہ بھی تھی کہ آرمینیہ جو مدتوں سے ایران کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا سلطنت میں شامل ہو جائے۔ خسرو پرویز کے لئے ہرقل سکندر ثابت ہوا۔ اس نے کوہِ قاف کے قبائل سے

اتحاد کر کے وادئ دجلہ کو تاراج کیا۔ اور تیسفونؔ کا محاصرہ کرلیا۔ خسرؔو نے فرار ہونا چاہا لیکن اس کی اپنی باغی فوج نے اسے قید کرلیا۔ اسی وقت دجلہ میں قہرناک سیلاب آیا جس کی وجہ سے تخت کسریٰ کا ایک حصہ تباہ ہوگیا۔ خسرو پرویز قید میں بیمار پڑ گیا۔ ان سب آفتوں کے باوجود اس نے ہرقلؔ سے صلح کرنے سے انکار کیا فروری ۶۲۸ ء میں خود اپنے سفاک بیٹے کے ہاتھوں (جو ملکہ مارؔیا کے بطن سے تھا) موت کے گھاٹ اُترا۔ ساسانی ایران جو خسرو کے دور میں اپنی سطوت کے نکتہ عروج پر پہنچ چکا تھا اس افسانوی تاجدار کے عبرت ناک انجام کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ اگلے پانچ برسوں میں بارہ سلاطین تخت پر چڑھے اور اترے۔ (یہی آخری منظر ہم ہنحامنشی اور اشکانی ڈراموں میں دیکھ چکے ہیں) عوام خسرو پرویز کے لگائے ہوئے بھاری ٹیکسوں سے نالاں تھے۔ سرحد پر ترکستانی قبائل حسب عادت اودھم مچار ہے تھے۔ ملک کے اندر مجوسی مؤبدوں کا زور حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ عیسائی رعایا الگ تباہ حال تھی اور اخلاقی تنزل سماجی بے انصافی اور سیاسی بے چینی کا یہ دور اپنے ابراہیمؔ کی تلاش میں تھا۔

مجھے ہے حکم اذاں______ !

۶۴۲ ء میں کوہ البرؔز کے دامن میں تاریخ کی ایک اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ نہاونؔد کے محاذ پر یزدگرد سوئم مغلوب ہوا۔ صحرا بہ صحرا مارا مارا پھرا۔ اور دُور افتادہ ترکستان میں ایک پنسہارے کے جھونپڑے کے اندر بیکسی کے عالم میں قتل کیا گیا۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل یہی حشر داؔرا سوئم کا ہوا تھا۔ ایک تھکی ماندی، بوڑھی تہذیب ایک ترقی پسند، جوشیلے، تازہ دم نظام کے آگے دوبارہ سرنگوں ہوگئی۔

سیّد امیر علی لکھتے ہیں کہ جب تیسفوؔن سے حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت مدینہ پہنچا ہے تو حضرت عمرؓ رونے لگے۔ اور فرمایا کہ مجھے اس مال و دولت میں امّت کی تباہی کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ اسلام نے ملوکیت کا مخالف نظام حیات پیش کیا تھا۔ مگر اس کے پیرو بہت جلد عجمی شہنشاہیت کے طور طریق اختیار کرنے والے تھے۔

عہدِ عتیق کے ان تمام سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ بڑا سخت لنگوئج پرابلم بھی چل رہا تھا۔ مصر قدیم کے تصویری رسم الخط کے بعد دوسری اسٹیج آئیڈوگرافی کی تھی جس میں تصاویر اشیاء کے علاوہ خیالات کی نمائندگی بھی کرنے لگیں۔ یہ ''عبوری'' اسٹیج تھی۔ کلاسیکل مصری رسم الخط اور عروق کا خطِ مینخی مخلوط تصویری اور صوتی طرزِ تحریر تھا۔ (چین جاپان میں آج تک اسی قسم کا ''عبوری'' رسم الخط رائج ہے) اہلِ عروق نے گاؤدم مثلث شکل کا ''خطِ مینخی'' اس لئے ایجاد کیا کہ وہ مٹی کی الواح پرنو کیلے قلم یعنی اسٹائلس سے اپنے افسانے لکھتے تھے اور ادیب لوگ ایک دوسرے کے ''اسٹائل'' کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اس زمانے میں سُومیری اور اکادی بین الاقوامی ڈپلومیسی کی زبانیں تھیں اور آر اور نینوا اور عیلام اور ممفس کے سفارتی ڈنرز کے مواقع پر سب فرفر اکاڈی بولتے تھے فنیقی تاجروں نے بہی کھاتے رکھنے کے لئے کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح عبوری طرزِ تحریر ترک کر کے ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ایجاد کرلیا۔ اس کی مختصر علامتیں تعداد میں غالبًا بائیس تھیں۔ بنی اسرائیل نے کنعان میں آباد ہونے کے بعد یہی حروف اختیار کر لئے۔ فنیقی رسم الخط بہت جلد مقبول ہوگیا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں ایک تو یہ ان کا شہر بائیبلوس پچھلے دو ڈھائی ہزار برس سے مصر سے تجارت کر رہا تھا۔ مصر میں دریائی نرسلوں سے پیپائیرس بنایا جاتا تھا۔ بائیبلوس میں بھی اس کی فیکٹریاں کھل گئیں۔ یعنی غور فرمائیے کہ بائیبلوس میں پیپروس یعنی بائیبل کا پیپر یعنی کتاب کا کاغذ تیار ہونے لگا۔ کاغذ پر ابجد لکھنا اس سے کہیں زیادہ آسان تھا کہ بیٹھے لوح و قلم لئے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو رہے ہیں۔ چنانچہ بائیبلوس کی انارکلی میں بے شمار ناشرین کی دوکانیں کھل گئیں۔

سامی النسل فنیقیوں کے اس رسم الخط کی لگ بھگ ایک ہزار سال قبل مسیح کئی شاخیں ہوگئیں (۱) شمالی سامی: (الف) کنعانی جو ابتدائی عبرانی رسم الخط میں تبدیل ہوئی۔ (ب) فنیقی جو قرطاجنہ میں بھی رائج ہوئی (جو شمالی افریقہ میں فنیقی نوآبادی تھی) شمالی سامی کی دوسری شاخ آرامی کہلائی جس نے عربی، سریانی، ارمنی اور جارجین تحریروں کو جنم دیا۔ لیکن جدید عبرانی کی اماں حوا کنعانی کے بجائے آرامی تھی۔ (۲) جنوبی سامی جو جزیرہ نمائے عرب میں محدود رہی مگر اس کی ایک شاخ نے ایتھوپین رسم الخط کو جنم دیا۔ (۳) یونانی۔

یونانی انڈو یوروپین زبان ہے اس نے سامی رسم الخط کیسے اختیار کرلیا؟ اس کا قصہ

یوں ہے کہ یونانی لوگ فلسفے وغیرہ کے چکر میں پڑنے کا ارادہ کرر ہے تھے۔انہوں نے اپنی بندرگاہوں پر آنے والے[1] فنیقی تاجروں سے ان کے نرم و نازک حروفِ تہجی الف بیتھ جیمل، دالیتھ، زین، کاف، لامید، میم، نون، پے ماریش، ح، واؤ، ط وغیرہ مستعار لے کر انہیں لکّوتوڑ الفا، بیٹا، ڈیلٹا، گاما وغیرہ بنالیا۔ چند حروف اپنی طرف سے شامل کئے اور اس طرح ایک انڈو یورپین زبان میں فنیقی حروف تہجی میں اپنے سامی ناموں سمیت داخل ہو گئے (شروع میں یونانی بھی سامی دستور کے مطابق دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی تھی) فنیقیوں سے لکھا پڑھی سیکھ کر اہلِ یونان اب دُنیا کے سمندروں اور بازاروں میں اپنے استادوں کے بھی کان کاٹنے لگے۔ (آج تک یہ بتانا مشکل ہے کہ مشرق قریب کے یونانی اور لبنانی تاجروں میں کون زیادہ تیز ہے۔)

آرامی شمالی سامی زبان تھی جس میں کلدانی اور سریانی شامل تھیں۔حضرت ابراہیم (جو کلدانیہ کے پایہ تخت اُر میں پیدا ہوئے تھے) کی زبان ''عرب ارمی[1]'' تھی۔کیونکہ بنی ارم دراصل صحرائے عرب کے باشندے تھے اور چراگاہوں کی تلاش میں ہجرت کر کے وادیٔ دجلہ میں جا بسے تھے۔کلدانیہ سے ہجرت کر کے کنعان میں آباد ہونے کے بعد آلِ ابراہیم کی ''عرب ارمی'' زبان پر مقامی کنعانی بولی کا اثر پڑا اور اس ابتدائی عرب ارمی اور کنعانی لسانی اختلاط نے اس قدیم عبرانی کو جنم دیا جس میں توراتِ صحف انبیا اور بعد میں تلمود (عربی= تلمیذ) اور ترگم (عربی= ترجمہ) یعنی اس کی تفاسیر لکھی گئیں نسبتاً جمہوری سماج انہی مما لک میں پیدا ہوا۔ (فنیقیہ، اسرائیل، یونان وروم) جہاں حروفِ تہجی کی وجہ سے یہ لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوگئی تھی۔اشور۔مصر۔بابل۔عیلام وغیرہ کے آمریت پرست معاشروں میں ''عبوری'' طرزِ تحریر کی وجہ سے تعلیم محدود اور کاتبوں اور کاہنوں کے اجارے میں رہی۔ بعد کی صدیوں میں کاغذ یا چھال پر لکھی جانے والی ترقی پذیر آرامی مصر سے لے کر ایران تک رائج ہوگئی۔

سامی زبانوں میں معبود کے لئے لفظ اِل کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔یہی اِل ہمیں

---

[1] حضرت موسیٰ کے آخری وعظ کے مؤثر الفاظ یاد کیجئے:۔'' تمہارا باپ ایک بے خانداں ارمی تھا جو مصر جا کر ایک طاقتور قوم بن گیا۔''

الہٰ ، الوہی اللہ ، کی مختلف اشکال میں اور انجیل کے ناموں میں نظر آتا ہے ۔ (ہر مغربی نام جو ایل پر ختم ہوتا ہے اسی عبرانی اِل سے مشتق ہے ۔ مثلاً ڈینئل ۔ (وانی ایل = اللہ میرا منصف ہے) یوایل (اللہ آقا ہے) ایمونیل (اللہ ہمارے ساتھ ہے) رفائیل (اللہ شافی و کافی ہے) مائیکل (اللہ کی مانند) گیبرئیل (قدرت اللہ) وغیرہ ۔ اسی طرح ایلزبتھ خدا کو سونپ ہوئی یعنی اللہ رکھی ! اب یاہ و یہہ والے نام لیجئے ۔ ایلیاہ (الیاس) یعنی یاہ و یہہ خدا ہے ۔ ذکریاہ (خدا نے یاد کیا یا ذکر کیا ۔) اوریاہ (خدا کا شعلہ) میتھو (خدا کا تحفہ) یرمیاہ (خدا کا برگزیدہ) ۔ اب ایک اور بے حد عام انگریزی نام JOHN پر آیئے ۔ بعل فنیقیوں اور کنعانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا ۔ حنی بعل یعنی بعل کی برکت ایک عام کنعانی نام تھا ۔ (ایک مشہور و معروف حنی بعل صاحب وہ تھے جنہوں نے قرطاجنہ سے نکل کر روم پر دھاوا بولا تھا) عبرانیوں نے بعل کے بجائے حنا یہ اور یوحنا اپنے نام رکھے یعنی یاہ و یہہ کی برکت ۔ یہی یوحنا ہمارے مسٹر جان JOHN حضرت عیسیٰ آرامی زبان بولتے تھے ۔ آپ نے صلیب پر جانکنی کے عالم میں پکارا ۔ '' الوہی ۔ الوہی ۔ ابا ۔ ابا ۔ مجھے تو نے کیوں چھوڑ دیا ۔'' اسی ابا یعنی باپ سے بزرگ ترین مسیحی راہب کے لئے انگریزی لفظ ABBOT فرنچ ABBE اور مسیحی خانقاہ کے لئے ABBEY نکلا ۔ قدیم عبرانی الفاظ سمع ۔ ملکہ ۔ ملک ۔ کتاب ۔ تحت ۔ کبیر ۔ امت ۔ ارض و سما ۔ عبد ۔ حکمہ ۔ خلیل ۔ رب ۔ کفارہ قربان ۔ اربع ۔ ظہر ۔ نبی ۔ سلام وغیرہ عربی میں موجود ہیں اور ہماری اپنی روزمرہ کی بول چال میں شامل ہیں ۔ بیت یعنی گھر امت شمس وغیرہ قدیم ترین اشوری الفاظ ہیں ۔ عبرانی لفظ برک (برکت) لاطینی BENEDICO اور انگریزی BLESS میں منتقل ہو چکا ہے ۔ یونانی میں فرشتہ کا تصور ناپید تھا ۔ ANGELOS پیغامبر کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ۔ عبرانی '' ملائکہ '' نے لفظ ANGEL کو جنم دیا ۔ قدیم میڈین بادشاہوں کے باغات '' فردوس '' کہلاتے تھے ۔ یونانیوں نے اسے PARADEISOS بنایا انجیل کے یونانی ترجمے میں یہ لفظ جنت اور '' باغِ عدن '' کے لئے استعمال کیا گیا اور انگریزی میں PARADISE بنا ۔ خود باغ عدن کا سراغ لگایئے تو

معلوم ہوگا کہ جیسے کہ پہلے کہا گیا۔ باب پیدائش وغیرہ کا کچھ حصہ بابل میں لکھا گیا جہاں قدیم اساطیر[1] کا پس منظر موجود تھا۔ بابل سے واپسی کے بعد عربی نے ایک عالمگیر تہذیبی زبان کا درجہ حاصل کیا۔ لیکن ایران میں اس کی وجہ سے ایک نیا لینگوئج پرابلم پیدا ہو گیا جو ''عربی فارسی کا جھگڑا'' کہلایا۔

معرکہ نہاوند کے بعد آریہ ایران پر آلِ ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی بنی اسمٰعیل یعنی مسلمان عربوں کی بالفاظِ دیگر ایک سامی قوم کی حکومت قائم ہوئی۔ ۶۴۴ء میں فاروق اعظمؓ کا انتقال ہوا۔ جنگ جمل کے بعد کوفہ دارالخلافہ قرار پایا۔ شیعان علیؓ اور خوارج کے تفرقے پیدا ہوئے۔ ۶۶۱ء میں ایک خارجی ابنِ ملجم نے جناب امیرؑ کو شہید کیا۔ ۶۸۱ء میں حسینؑ ابنِ علیؑ نے دشتِ کربلا جامِ شہادت نوش فرمایا۔ رسولؐ اللہ نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا تھا۔ ''یہ تم کو میری آخری نصیحت ہے کہ تم سب آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔'' اس نصیحت پر عمل کس طرح کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔

دارالاسلام کے نئے معاشرے میں موالی یعنی غیر عرب مسلمان اور ذمی یعنی غیر مسلم بڑی تعداد میں شامل تھے۔ لیکن حکمراں طبقہ عرب تھا۔ موالی اور عربوں کے درمیان سماجی اور اقتصادی تفاوت بڑھتا گیا۔ اور عرب و عجم کی کشمکش شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے شیعہ تحریک نے ایرانی یعنی موالی آبادی میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ایران کے زرتشتی جاگیردار طبقے کے بیشتر افراد فتح اسلام کے بعد مازندران کے پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ سب مسلمان ہو گئے۔ اور اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر عرب حکومت کے وفادار رہے۔ موالی شیعوں نے جن میں زیادہ تر غریب ایرانی عوام شامل تھے ظہورِ مہدیؑ کا انتظار شروع کیا۔ انواع و اقسام کے نقلی ''مہدی'' سیاسی ہنگاموں کی قیادت کے لئے سامنے آئے۔ خراسان گویا ایران کا بنگال تھا کہ عموماً تشدد پسند تحریکیں یہیں سے شروع ہوتیں۔ بہت جلد ان تحریکوں نے ایرانی

---

[1] یہودی روایات میں تاریخی واقعات کے علاوہ جو اسطوری عناصر شامل ہو گئے تھے ان کے معجون مرکب سے بعض مسلمان راویوں نے حکایات تیار کیں جن کی بنیاد پر قصص الانبیاء وغیرہ کی عوج بن عنق، جنت شداد، چاہ بابل وغیرہ کی محیر العقول داستانیں قلمبند کی گئیں جو یونانی اور ہندو دیومالاؤں سے کسی طرح کم نہیں۔

قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ خلفائے بنو اُمیہ کے بے پناہ مظالم کے خلاف جب ابو مسلم خراسانی نے علمِ بغاوت بلند کیا تو اس نے (وہی خود کو قصہ رستم کے پہلوان گودرز کیانی کی اولاد بتاتا تھا) یہ کہہ کر امام محمدؑ کے سوگ میں اپنی فوج کی وردی سیاہ بنوائی کہ گودرز نے بے گناہ سیاؤش کے غم میں سیاہ پوشی اختیار کی تھی۔ (اس کے بعد دولتِ عبّاسیہ کا سرکاری لباس بھی سیاہ ہو گیا!) ابو مسلم کے ہاتھوں اگست ۷۵۰ء میں اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا مگر بدامنی ختم نہ ہوئی۔ برمکی خاندان نے جو قبول اسلام سے قبل بلخ کے آتشکدہ نو بہار کے موبدوں کا گھرانا تھا بغداد میں اقتدار حاصل کیا۔ ساسانی وزیر کا عہدہ مع آداب و رسوم شاہانہ وجود میں آیا۔ امیر المومنین اب ساسانی بادشاہوں کی طرح دربار میں پردے کے پیچھے بیٹھتے تھے! اور انہوں نے اب جی بھر کے بنو اُمیہ پر ظلم توڑے!!

جیسے جیسے عرب مرکز کمزور پڑا ایران میں خود مختار حکومتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ طاہر یہ خاندان کے بانی کو خلیفہ المامون نے ۸۰۱ء میں خراساں کا گورنر بنایا تھا۔ انہوں نے موقع پاتے ہی اپنی ریاست قائم کر لی اور ۸۲۰ء سے ۸۷۰ء تک نیشاپور میں ٹھاٹھ کئے۔ اسی زمانے میں سیستان میں یعقوب بن لیث صفاری نے جو ایک لوہار کا لڑکا تھا طاہری حکمران کو معزول کر کے خراساں پر قبضہ جمایا۔ اسی نے قومی احیاء کا باقاعدہ آغاز کیا عربی کے بجائے فارسی سرکاری زبان قرار دی اور نئے فارسی ادب کی سرپرستی کی داغ بیل ڈالی۔ شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے جشن تاجگذاری کے موقع پر ایران قدیم و جدید کے متعلق جو بے انتہا نفیس باتصویری کتابیں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں مغربی اور دوسرے غیر ملکی مہمانوں اور نامہ نگاروں کو پیش کی گئیں ان میں سے ایک میں یعقوب صفاری کے لئے لکھا ہے۔ ''یعقوب بن لیث خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کیوں کہ اس نے خلیفہ وقت سے بغاوت کی اور عباسی سفیر سے کہا۔ جاؤ اور جا کر اپنے آقا سے کہہ دو کہ اگر میں زندہ رہا تو تلوار ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اگر میں جیت گیا تو جو میرے دل میں آئے گا کروں گا۔ اگر تم کامیاب رہے تو روٹی اور پیاز ہی میری قسمت میں لکھے ہیں۔ لیکن تم یا قسمت دونوں ایسے انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جسے روکھی سوکھی روٹی پیاز کھانے کی عادت ہے ____'' آگے چل کر اسی کتب میں مرقوم ہے:۔'' گو عرب تسلّط کی وجہ سے ایران نے کئی صدیوں کے لیے اپنی

آزادی کھودی مگر ایرانی قوم کا جذبہ حریت فنا نہ ہوسکا۔ اسلام ایران میں آیا مگر یہاں پہنچ کر پہلے جیسا نہ رہا۔ ایران ایک مسلم ریاست بنا لیکن عرب ریاست نہ بن سکا نئے مذہب سے مطابقت ایرانیوں کے لیے ایک ولولہ انگیز ذہنی تحریک بنی۔ لیکن یہ مطابقت ابتدا ہی سے پیدا ہوئی جب اہلِ ایران نے اپنا رشتہ وفا البیت رسولؐ یعنی جناب زہراؑ اور ان کے شوہر حضرت علیؑ (جو رسول اللہ کے کزن بھی تھے) سے استوار کیا۔ اور شیعیت کی بنیاد اسی وفاداری پر قائم ہے جو عربوں کے سُنی عقائد سے مختلف ہے۔ دراصل ایران میں شیعیت نے اسلام کے استقلال کے ساتھ ہی ساتھ عرب روحانی تسلط کا قیام ناممکن بنانے کا دوہرا فریضہ انجام دیا۔ سیاسی لحاظ سے گو ایرانی اب محکوم تھے لیکن بہت جلد ان کو حکومت میں شامل کرلیا گیا کیوں کہ عرب امورِ مملکت سے بالکل نابلد اور انتظامی معاملات میں ناتجربہ کار تھے۔ اور ملکی امور کے سلسلے میں ایرانیوں ہی کے دستِ نگر تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ خلیفہ سلیمان نے کہا۔ ایرانیوں نے ایک ہزار سال تک ساری دُنیا پر حکومت کی لیکن دوسری اقوام کے تعاون کے محتاج نہ رہے۔ افسوس کہ ہمیں روزانہ امورِ سلطنت میں ایرانیوں کے مشوروں اور تعاون کی حاجت رہتی ہے، عربوں نے ساسانی طرزِ حکومت کو تبدیل نہیں کیا۔ عرصے تک پہلوی رسم الخط سرکاری کاروبار کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوئم کے سکے بھی ٹکسال میں ڈھالے جاتے رہے۔ بعد میں عربی الفاظ فارسی میں داخل ہوئے جس طرح المانوی زبانوں میں یونانی اور لاطینی الفاظ شامل ہوگئے تھے۔ لسانی لحاظ سے عرب سلطنت میں جو بحرِ ہند سے بحرِ اطلانتک تک پھیلی تھی ایران ہی واحد ملک تھا جس نے اپنی قومی زبان برقرار رکھی۔ ورنہ باقی سارے ممالک میں عرب تسلّط کے بعد وہاں کی مقامی زبانیں فنا ہوگئیں۔ لیکن ایران میں جو عربی الفاظ فارسی میں داخل ہوئے ہیں ان کے تلفظ اور معنی مختلف ہوگئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عرب تسلّط کے صرف دو سو[1] برس بعد ایران میں وہ حیرت انگیز تہذیبی گہما گہمی اور ادب، فلسفہ، آرٹ، سائنس اور کلچر کا وہ فروغ ہوا جو بہت صدیوں بعد اٹلی اور یوروپ کے نشاۃ ثانیہ میں ظہور میں آیا۔ گو درجنوں ایرانی دانشوروں نے عربی میں لکھا جو سرکاری ''انٹلکچوئیل'' زبان تھی مگر آج جسے اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ایرانی تہذیب ہی ہے۔ ابنِ سینا، رازی، فارابی، خیام، طوسی وغیرہ وغیرہ سب ایرانی تھے[1]۔

---

[1] Profile of Iran ص ۲۷، ۲۸۔ Printed by Offset Press Inc Tehran

اس طویل اقتباس کے بعد زندہ رود یعنی وقت کی بھی سن لیجئے کیا کہتا ہے:

بعد مدت چشم خود برخود کشاد ‏ لیکن اندر حلقہ دامے فتاد
کشتۂ ناز بتان شوخ و شنگ ‏ خالق تہذیب و تقلید فرنگ
کارآں وارفتہ ملک و نسب ‏ ذکر شاپور و تحقیر عرب!
باوطن پیوست داز خرد درگذشت ‏ دل بہ رُستم وادواز حیدرؓ گذشت
پیریٔ ایراں نہ ماں یزد جرد ‏ چہرہ اوبے فروغ از خون سرد
موج مے درشیشہ تاکش نبود ‏ یک شرر در تو وہ خاکش نبود
تاز صحرائے رسیدش محشرے ‏ آنکہ داد اور احیات دیگرے
ایں چنیں از حشر از عنایات خدااست ‏ پارس باقی! رومتہ الکبر لے کجاست؟
آنکہ رفت از پیکر او جانِ پاک ‏ بے قیامت برنمی آید زخاک
مردِ صحرائی بایراں جاں ومید ‏ باز سوئے ریگ زار خود رمید
کہنہ را از لوح مابُسترد و رفت ‏ برگ و ساز عصر نو آورد و رفت!

آہ احسانِ عرب نشنا ختند
زاتش افرنگیاں بگدا ختند[1]!

زندہ رود کے ہمراہ پھر یعقوب صفاری کے ہاں واپس چلیے جس کی اولاد ۹۰۲ء تک ہی حکمرانی کرسکی اور اس کی جگہ ترمز کے ساسان نے لے لی جنہوں نے خراساں اور ماورالنہر کے علاقے صفاریوں سے چھین کر ۸۷۴ء سے ۹۹۹ء تک بڑی دُھوم دھام سے حکومت کی اور بخارا اپنا پایہ تخت بنایا دوسری طرف زیاری خاندان ۹۳۲ء سے ۱۰۴۲ء تک طبرستان (موجودہ مازندران) میں اپنا ڈنکا بجواتا رہا۔ بحیرہ کیسپین کے قریبی علاقے میں ویلمی خاندان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان لوگوں نے جو آل بویہ کہلائے ۹۳۲ء سے ۱۰۵۵ء تک وسطی اور مغربی ایران کو اپنے زیرِ نگیں رکھا اور ان کا اقتدار اتنا بڑھا کہ ۹۴۵ء میں انہوں نے عین بغداد پر اپنا تسلّط جمالیا اور عبّاسی خلیفہ وقت کو پنشن دینے لگے۔

ان ساری ایرانی ریاستوں کے بانی قدیم ارسٹوکریسی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور

---

[1] جاوید نامہ۔

سب مارے قوم پرستی کے اپنا رشتہ قدیم شاہانِ عجم سے ملاتے تھے۔ ابو مسلم خراسانی نے خود کو گودرز کیانی کی اولاد بتایا اور اسے نوشیرواں عادل کے شہرۂ آفاق وزیر حکیم بزرجمہر کے اخلاف سے بھی منسلک کیا گیا۔ ساسان نے بہرام چوبیں اور زیاری حکمرانوں نے انوشیروان عادل سے اپنے اپنے شجرے ملائے۔ اور یہ سب شاہی گھرانے آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔

ان خاندانی ریاستوں کی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مذہبی شورشیں بھی جاری تھیں جو سب ابو مسلم خراسانی کی تحریک کی آل اولاد تھیں۔ معاشی اور سیاسی بے اطمینانی نے حسب معمول مزدکی اور انتہا پسند شیعہ یا خارجی احتجاج کا جامہ پہنا۔ ۷۴۹ء میں نیشاپور میں بہہ آفرید نے سر اٹھایا تھا۔ یہ صاحب اپنے آپ کو اصلاح پسند زرتشتی پیغمبر بتلاتے تھے خود زرتشتی موبدوں کے کہنے پر نئی عباسی حکومت نے ان کا اور اُن کے پیروؤں کا قصہ پاک کیا۔ ابو مسلم کے مرنے کے بعد اس کے انتہا پسند پیروؤں نے کسان بغاوتوں کی قیادت کی۔ اور دعویٰ کیا کہ ابو مسلم بھی امام مہدی القائم المنتظرؑ کی طرح روپوش ہے۔ ۷۵۵ء میں ابو مسلم کے ایک ساتھی سالار فیروز یا سن باد نے جو غالباً خود بھی مزدکی تھا۔ ہنگامہ کھڑا کیا۔ مغربی ایران کے کسان اور زرتشتی منافق اور مسلمان بدعتی اپنے جھنڈے تلے جمع کر لئے اور متعدد شہروں میں گویا اپنی آزاد سرکار قائم کی۔ اُن کی خلیفہ منصور کی افواج نے سرکوبی کی۔ پھر ''اسحٰق ترک'' کی باری آئی جن کو ابو مسلم نے اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے ترکستان بھیجا تھا۔ ۷۵۸ء میں اُن کی بغاوت فرو کی گئی۔ اس کے بعد مقنع صاحب اپنا سنہرا بیجا پہنے تشریف لائے۔ مرو کے باشندے تھے۔ آپ نے حلول کے عقیدے کا پرچار کیا اور سالار فیروز کی مانند اعلان کر دیا کہ ابو مسلم دراصل خدا تھا۔ المقنع کی عوامی تحریک خراساں اور ماوراالنہر میں پھیل گئی۔ اور بڑی ہلچل مچی۔ مقنع ذات کے دھوبی تھے مگر کس قدر حیرت انگیز شخصیت تھی کہ آج تک لوگوں کو نہیں بھولے۔ مُلاؤں کا مذاق اُڑانے کے لئے کہ اُس نے شہر نخشب کے پاس ایک کنویں میں ایک طاس پارے سے بھر کر رکھوایا اور انعکاس شعاع قمر کا ایسا عمل کیا کہ وہ چاند آسمان پر نظر آنے لگے۔ کمال ہے بھئی۔ (طامس مور کی مشہور ''لالہ رُخ'' میں '' خراساں کا نقاب پوش پیغمبر'' موصوف ہی ہیں)۔ بہر حال زابلستان بخارا وغیرہ میں اس کے بے شمار مرید

ہو گئے ۔ اہلِ ترکستان نے مقنع کا ساتھ دیا۔ سب نے مل کر خوب لوٹ مار مچائی اور کوہستانی قلعوں پر قبضہ کیا مقنع سرکاری افواج کا مستقل مقابلہ کرتا رہا۔ بالآخر جب قلعہ کش کا محاصرہ ہوا ہے تو مقنع کو ہار ماننا پڑی ۔ پھر بھی اس کی ٹیں نہیں گئی ۔ اپنے بی بی بچوں کو زہر پلا کر خود مع رفقاء کے چتا میں کود گیا۔ مقنع اپنے زمانے کا بڑا زبردست انقلابی اور ANTI-ESTABLISHMENT لیڈر تھا جس کے رول کو دورِ حاضرہ کے مبصر زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

مقنع کی تحریک ۷۷۵ء، ۷۷۹ء تک جاری رہی ۔ پھر بابک خرمی کا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ بابک بھی ایک سنسنی خیز بدعتی لیڈر تھا اور مجوسیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو تناسخ ارواح اور NIHILiSM کے قائل تھے۔ ۸۱۶ ءمیں اس نے آذربائیجان کے علاقے میں ایک بے حد منظم کسان بغاوت شروع کروائی ۔ یہ بغاوت جنوبی مغربی ایران، آرمینیہ اور شمالی صوبوں میں پھیلی اور دہقان یعنی پرانے زمیندار طبقے نے بھی اس کا ساتھ دیا کیوں کہ زیادہ تر دہقان اپنا پرانا طمطراق کھونے کے بعد معمولی کاشتکار رہ گئے تھے۔ سات برس میں مسلح بابکی گروہوں نے خلیفہ المامون کے چار جنرلوں کو شکست دی۔ بازنطیم سے بھی ساز باز کی۔ لیکن خلیفہ معتصم کے زمانے میں انہیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ چند برس بعد فلسطین میں نقاب پوش مبرقع صاحب نمودار ہوئے ۔ جو ایک اموی کی حیثیت سے عباسیوں سے انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے بھی بے شمار مرید جمع کر لیے ۔ خلیفہ واثق نے اُن کو قید کروایا۔ سب سے زیادہ اہم سیاسی ہنگامہ حبشی غلاموں کا تھا جو کانوں بحری بیڑوں اور کھیتوں پر کام کر رہے تھے اور مسلمانوں کے نئے سرمایہ دار طبقے کی اہم ملکیت تھے۔ بصرے میں ہزار ہا بدحال زنگی غلام نمک نکالنے اور ساحلی دلدلیں خشک کرنے کی جان لیوا محنت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حالت بے حد دگرگوں تھی۔ ان کو بھی ستمبر ۸۶۹ء میں علی بن محمدؐ نامی ایک ایرانی ہی نے باقاعدہ منظم کیا۔ اور پرولتاری بغاوت شروع ہوگئی۔ سرکاری فوج جوان کی گوشمالی کے لیے بھیجی گئی اس کے حبشی سپاہی اپنے بھائی بندوں سے جا ملے۔ کسانوں نے بھی حبشیوں کا ساتھ دیا۔ (علی بن محمدؐ کے دو نائبوں میں سے ایک آٹا پیسنے والا اور ایک شربت فروش تھا) باغی حبشیوں نے سرکاری لشکر کے چھکے چھڑا دیئے ۔ جنوبی مغربی ایران پر یلغار کی۔ بصرے پر حملہ کیا اور

۸۵۹ء میں وہ بغداد سے سترہ میل کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ فروری ۸۸۱ء میں بالآخر حکومت عباسیہ کا پلّہ بھاری رہا اور زنگیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ علیؓ بن محمدؐ نے معافی چاہنے اور سرکاری پنشن لے کر سیاست سے دستبردار ہو جانے کی پیش کش مسترد کر دی اور نومبر ۸۸۳ء میں نوکِ علم پر اس کا سر بغداد لایا گیا۔ کوئی منظم پروگرام اور واضح مقاصد سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے جمہوری انقلاب آج بھی بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ تو اس وقت بھلا کیا ہو پاتا زنگیوں کے بعد بڑا بھاری فتنہ اسمٰعیلیوں اور قرامطیوں کا تھا۔ جس نے سارا معاشرہ تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ عالمِ اسلام میں اب اَن گنت مذہبی فرقے پیدا ہو چکے تھے اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔

لیکن ایران کی خاندانی ریاستوں کو جو ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے میں اور ان سیاسی اور مذہبی ہنگاموں کا سامنا کرنے میں مصروف تھیں جلد ہی ایک نئے غنیم یعنی اپنے پرانے دشمن تورانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا جو اب غزنویوں اور اُن کے بعد سلجوقیوں کے روپ میں سرحد پر نمودار ہو رہے تھے۔

پیدائش مسیح سے قبل کے ایک ہزار سال میں وسط ایشیا اور جنوبی روس کی چراگاہوں پر سیتھین غالب رہے تھے۔ پہلی پانچ عیسوی صدیوں میں ہُن اقوام کا ہنگامہ رہا۔ ان لوگوں نے کشان اور گپتا[۱] سلطنتوں کا شیرازہ بکھیرا۔ پھر ایک طرف چین اور دوسری طرف یورپ میں آفت جوتی اور ہالی ووڈ پہنچ کر ''ایٹلا دی ہن'' نامی رنگین فلم بنوایا۔ ہن حضرات سمرقند و بخارا و سُغدیہ کے نخلستانوں سے اُٹھے تھے اور ساری متمدن دنیا پر اس طرح چھائے کہ اُن کا نام خونخوار کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ترک سامنے آئے۔ دراصل وسط ایشیا میں ایرانی النسل اور ترک التائی نسلیں کافی گڈمڈ تھیں۔ یہ سارے خانہ بدوش جنگجو قبائل ایرانی اور التائی اور یورالی زبانیں بولتے تھے۔ رفتہ رفتہ ترک باقی سب پر غالب آتے گئے۔ انہوں نے چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحیرۂ اسود تک اپنی دھاک بٹھادی۔ بتدریج آسمان پرستی، شامانیت، بدھ مت اور عیسائیت اختیار کی۔ آغازِ خلافت کے وقت

۱۔ ہند میں ہن حکومت کے صدر مقام سیالکوٹ اور مالوہ تھے۔ مہرگل نامی ہن راجہ کا بڑا زور رہا۔ رفتہ رفتہ پچھلے شاکاؤں وغیرہ کی طرح ہن بھی راجپوت آبادی میں گھل مل گئے۔

ایران سے اوپر یہ ترک اقوام اناطولیہ سے لے کر منگولیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ان کا سب سے طاقتور سردار خان کاشغر تھا۔وسط ایشیا پر اسلامی تسلّط کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ایرانیوں کا اثر کم کرنے کے لئے خلیفہ منصور نے ترکمان سخت کوش کو فوج میں بھرتی کیا۔اور اسلامی معاشرے میں بقول پروفیسر مجیب[۱] ترکوں کی وہی حیثیت ہوگئی جو ہندوستان میں کھشتریوں یعنی راجپوتوں کی تھی۔خلافت کا شیرازہ سرعت سے منتشر ہو رہا تھا اس وقت سیاسی فوقیت حاصل کرنے کی جدوجہد میں ایرانیوں کو ان ہی اہلِ سیف تورانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ایڈمنسٹریشن اور علم و ادب کا میدان ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔بالآخر اہلِ سیف اہلِ قلم پر غالب آئے۔

الپتگین ایک ترکستانی غلام تھا جسے خاندان سامانیہ کی طرف سے خراساں کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔سانی امیروں کے تنزل سے فائدہ اُٹھا کر اس نے ۹۶۰ ء میں غزنی میں اپنی حکومت قائم کرلی اور اپنے غلام سبکتگین کو جو اس کا داماد بھی تھا وہاں کا فرمانروا بنادیا۔سبکتگین کے بیٹے محمود نے سامانیہ،زیاریوں،ویلمیوں وغیرہ سب کو راستے سے ہٹایا اور سارے ملک پر چھا گیا۔ہندوستان کا رُخ کیا اور اس کے ذریعے فارسی زبان وتہذیب پنجاب[۲] پہنچی۔

چنانچہ اب اسلامی سیاست وتمدن میں تین نسلی اور لسانی عناصر ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدال میں مشغول تھے۔عرب ایرانی اور ترک!اور بقول نغمہ سرا تھا۔

درجہاں باز آمد ایام طرب دین ہزیمت خورداز ملک و نسب[۳]

عجمی شہنشاہیت کا رُعب دلوں پر اس قدر طاری تھا اور اپنے آپ کو تاجداران فارس

---

[۱] سلطان محمود غزنوی۔از پروفیسر محمد مجیب۔مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی۔الٰہ آباد۔۱۹۴۰ء

[۲] آٹھویں صدی عیسوی تک سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے افغانستان ہندوستان میں شامل سمجھا جاتا تھا جس کی آبادی میں پارتھین سیتھین تورانی سب خلط ملط تھے۔کابل میں اب ''سیتھی ترکوں'' کی ''ترک شاہی'' قائم تھی جس کا بانی برہاتگین اپنا سلسلہ نسب مہاراجہ کنشک سے ملاتا تھا۔اور مذہباً بودھ تھا۔اس خاندان کے آخری حکمران کو معزول کرکے اس کے برہمن وزیر کلار نے ''ہندوشاہی'' قائم کی۔یہی زمانہ تھا جب سارے ہندوستان میں بدھ مت کو زوال اور برہمنیت کو عروج حاصل ہوا۔کلاری کونسل کے راجہ جے پال اور آنند پال پنجاب کے فرمانروا تھے جو سبکتگین اور محمود سے لڑے۔

[۳] جاوید نامہ۔

کی اولاد ظاہر کرنے کی ہوا ایسی چلی تھی کہ بقول فرشتہ محمود بھی خود کو آل ساسان میں سے سمجھتا تھا۔ مصنف منہاج السراج کے حوالے سے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب یز دگرد سوئم مرو میں ہلاک کیا گیا ہے اس کے تابعین اور اولاد ترکستان فرار ہوئی اور وہاں ترکوں سے شادیاں کیں۔ چنانچہ ''سبکتگین بن جوقان بن قراالحکم بن قزل ارسلان بن قرانامان بن فیروز بن یزدگرد۔ (شہزادہ فیروز کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ وہ بھاگ کر چین چلا گیا تھا) محمود بہر حال تاریخ اسلام کا پہلا فرمانروا ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اور نئی شہنشاہی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے دربار کے چار سو شعراء میں سے اکثر نے بادشاہوں کے مضمون پر طبع آزمائی کی اسدی نے گرشاسپ نامہ اور فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔

شاہنامہ فردوسی کے پس منظر میں ایران قدیم کی نیم اسطوری لسانی اور مذہبی تاریخ پنہاں ہے۔ اس لئے ہم ایک بار پھر ماضی کی سیر کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

قدیم ترین ابتدائی انڈو یوروپین زبان کی بیٹی وہ آرین یا انڈو ایرانی تھی جس کی دو شاخیں مادی اور ہنحامنشی کہلائیں۔ ان دونوں کی تیسری بہن ویدک سنسکرت تھی۔ اس وقت متمدن دنیا میں سومیری اور اکاڈی رائج تھیں۔ ایران میں آریہ قبائل یعنی مادیوں اور پارسیوں کی آمد سے قبل عیلام میں یہی سامی زبانیں مستعمل تھیں۔ ہنحامنشی سلطنت میں آرامی سرکاری زبان بن گئی۔ قدیم ہنحامنشی کتبات ہمیں بیک وقت عیلامی اکادی، قدیم فارسی اور آرامی[1] میں لکھے ملتے ہیں۔ مادا کے مجوسی پروہتوں نے دین زرتشت کی تعلیمات کو گاتھا (سنسکرت گیتا) کے عنوان سے منظوم کیا اور اپنے مذہبی قوانین کو قلمبند کر کے اس مجموعے کا نام یشتھا رکھا۔ کچھ عرصے بعد گاتھا اور یشتھا کو ملا کر اوستا کہا جانے لگا (اوستا میں مجوسی پروہت کے لئے لفظ آذروان استعمال کیا گیا ہے)۔ اوستا کے، ایک اشلوک اور اس کے سنسکرت ترجمے کی مماثلت ملاحظہ ہو:۔ اوتسا: تم امہ وتم یزتم سپورم دام ہو۔ سوشتم متہرم یزائے زوتر۔

سنسکرت:۔ تم امہ وتم یجتم سُورم دھام سو۔ سوشتم مترم یجائے ہوترے[2]۔ سلوکی دور میں

---

[1] اشوک کے قندھاری کتبات بھی یونانی اور آرامی دونوں میں موجود ہیں شمال مغربی ہند میں ۲۰۰ ق م کے لگ بھگ آرامی رسم الخط کی جگہ خروشٹی نے لے لی۔

[2] بحوالہ ایران صدیوں کے آئینہ میں از ڈاکٹر سنوہر لعل عشرت۔

یونانی رائج ہوئی۔ اشکانی عہد میں رستم وغیرہ پارتھین پہلوانوں کی داستانیں مقبول ہوئیں۔ ایرانی زبان آسان ہوتی گئی۔ پہلوانوں کی یہ زبان یعنی پہلوی ہنخامنشی فارسی سے بہت مشابہ تھی۔ ساسان شاہی میں اسے مزید ترقی حاصل ہوئی۔ عربی الفاظ میں ساسانی پہلوی میں داخل ہوئے۔ یہ ایرانی تجدیدیت تھا۔ لہٰذا قومی روایات، اساطیر اور دین زرتشت کی باقاعدہ تشکیل کی گئی۔ مجوسی مصنفین اوستا میں قدیم انڈوایرانی دیومالا شامل کر چکے تھے۔ چنانچہ وید میں منو اور یم ووشوت (سورج) کے توام بیٹے ہیں منو آریہ نسل کا باپ اور قانون ساز ہے۔ اوستا میں یم وونگت کا لڑکا ہے جسے خدا پیغمبری عطا کرتا ہے مگر وہ مارے انکسار کے قبول نہیں کرتا بعد میں زرتشت قبول کر لیتے ہیں۔ جس طرح منو ہندی نوحؑ ہیں یم ایران میں یہی رول ادا کرتا ہے۔ طوفان سے قبل وہ اھورمزدہ کے حکم سے ایک زیر زمین محل تیار کرتا ہے۔ یہی یم جمشید ہے۔ [یم اور خشیت (بادشاہ) کا مرکب = جمشید]۔ ہندو دیومالا میں ایک صاحب ترےتن نے راکھشوں کو زیر کیا تھا۔ یہی بزرگ اوستا میں ترائے تاؤفا کے نام سے موجود ہیں۔ آپ نے دھاک نامی اژدھے[۱] کا کام تمام کیا۔ ہندوستانی سوم رس کا رکھ والا گندھروا اوستا میں گندریپ دیو ہے جسے کیرساسپا قتل کرتا ہے۔ کیرساسپا ایک نہایت کروک قسم کی پیریکا یعنی پری کے دام میں پھنس جاتے ہیں جو دراصل اہرمن کی ایجنٹ ہے۔ (بعد میں شاہنامے میں یہ سب خواتین وحضرات نئے تلفظ والے ناموں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ترتیا جس نے دھاک مارا فریدوں بن جاتا ہے جس نے ضحاک کا قصہ پاک کیا۔ ترتیا کے تین لڑکے سیریما، تورا اور آریو، سلم تور اور ایرج بن جاتے ہیں۔ کیرساسپا اور نریمانو وغیرہ گرشاشپ اور نریمان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ منوش چھتر منوچہر کا روپ دھارتا ہے۔ باؤ شینگھا اور تخمہ اروپا ہوشنگ اور طہمورس کا بھیس بدلتے ہیں۔ تین سر والا بھیانک اژدہا یعنی اژی دھاک اہرمن نے خاص طور پر ایرانی قوم کو ستانے کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس کی دو حسین بیویاں شہری ناز اور ارنواز تھیں۔ شاہنامے میں ضحاک جمشید کی بہنوں شہرناز اور ارنواز سے بیاہ رچاتا ہے اور فریدوں اس کا کچومر نکال کر اسے کوہ دماوند[۲] قید کر دیتا ہے۔

[۱] اژدھا چین سے لے کر یوروپ تک ایک خاص اسطوری کردار تھا۔ مغربی حکایات میں سینٹ جارج نے DRAGON پر فتح پائی۔ ہندوستان میں سری کرشن نے ایک مہیب ناگ کو تسخیر کیا۔

[۲] قتل ضحاک کی حکایت اتنی دیرپا ہے کہ ہندوستان میں راون پھونکنے کے تہوار کی مانند شہر دماوند کے باشندے زمانہ حال تک ضحاک کے جہنم رسید ہونے کی خوشی میں "عید کردی" مناتے رہے ہیں۔

لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی آریائی لفظ ہندوستان اور ایران میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ ساری انڈو یوروپین زبانوں میں ''دیو'' یا اس کے ہم شکل الفاظ خدا کے لئے مستعمل ہیں۔ ایران میں دیو عفریت بن گیا۔ ''وید کا اندر اوستا میں انگر یا اہرمن ہے۔ یم ہند میں موت کا دیوتا ہے۔ اوستا میں یہ زندگی کی نمو بنا یعنی یم یا جم جس سے ہم ابھی ابھی جمشید کے روپ میں متعارف ہو چکے ہیں۔

اوستا مجوسیوں کی مادری زبان میڈین یا مادی میں لکھی گئی تھی۔ اشکانی اور ساسانی زبانوں میں جب قدیم ہنحامنشی فارسی کو آسان بنایا جا رہا تھا اور وہ بدل کر شین یعنی پہلوی میں تبدیل ہو رہی تھی اس وقت بھی موبدوں نے تندہی سے اوستا کی زبان کی حفاظت کی تاکہ مذہب پر ان کی اجارہ داری باقی رہ سکے شاہان ساسانیہ نے دین زرتشت کی ترویج و ترقی کا بیڑہ اُٹھایا اور عوام کی تربیت کے لئے اوستا کی تفسیر لکھی گئی جو ژند کہلائی۔ جس طرح گاتھا اور یشتھا کو ملا کر اوستا تیار ہوئی تھی اسی طرح اوستا اور اس کی تفسیر کا مجموعہ ژنداوستا اور اس کے قاری ژندیک کہلائے (جسے عربوں نے زندیق کر لیا) سلیو کی اور پارتھین ادوار میں اوستا کے ذریعے قدیم انڈو ایرانی اور ہنحامنشی سُورماؤں کو زندہ رکھا گیا۔ ساسانی قوم پرستی کے زیر اثر یہ اسطوری کردار تاریخی مشاہیر سمجھے جانے لگے۔ اسی اسطوری چوکھٹے میں پارتھین رزمیہ داستانیں، تاریخی واقعات یعنی اشوری حاکموں کے مظالم، تورانی حملے، یونان و روم و بازنطیم سے معرکہ آرائیاں، ڈرامائی انداز سے شامل ہو گئیں۔ مجوسیوں نے اسرائیلی کاہنوں اور ہندوستانی برہمنوں کی مانند اپنی پیشہ ورانہ اہمیت تاریخ کے نشیب و فراز کے باوجود بڑی شدّ و مد کے ساتھ برقرار رکھی تھی۔ انہوں نے اپنی قدیم زبان مادی اور رسوم و رواج باقی رکھ کر اپنے طبقے کو بیرونی تبدیلیوں سے بچائے رکھا[1]۔ مجوسیوں کے نزدیک ضحاک اور افراسیاب کی مانند سکندر بھی اہرمن کا خاص چیلا تھا۔ جس کے حملے کے بعد بہت عرصے کے لئے اُن کی طاقت ختم ہو گئی۔ پارتھین دور میں بھی اُن کی پہلی سی اہمیت نہ تھی کیوں کہ اشکانی گو آتش و آفتاب پرست تھے مگر وہ یونانی بابلی سبھی دیوی دیوتاؤں کے قائل ہو گئے تھے۔ ساسانی ایران میں مجوسیوں کو ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا وقار اور رعب داب واپس ملا۔ زمانہ قدیم سے اُن کے اہم

---

[1] ان کی اولاد یعنی ہندوستان کا پارسی موبد اور دستور آج بھی بڑی شدت سے قدامت پرست ہے۔)

مراکز رہے، شیز اور بلخ تھے۔ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ دورِ عباسیہ میں آل برامکہ نے جو پہلے بلخ کے موبد تھے ایک دوسرے روپ میں اقتدار حاصل کیا۔) شیز آذر بائیجان کی جنوبی سرحد پر واقع تھا یہاں کے آتش کدے کی زیارت کے لئے (جس کے متعلق مشہور تھا کہ خود زرتشت نے قائم کیا تھا) شاہان ایران پیدل جایا کرتے تھے۔

کہاجاتا ہے کہ اوستا کا اصل نسخہ جو پرسی پولس کے دبیر خانے میں محفوظ تھا سکندر کی لگوائی ہوئی آگ میں محل کے ساتھ جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اوّلیں ساسانی حکمراں اردشیر کو ازسرِ نومرتب کروایا۔ شاہ پور دوئم کے موبد آذر باد مارسپنداں نے صحیفے کی نئی انداز سے پہلوی میں ترتیب کی اور یہ خوردہ اوستا کہلایا۔ اس کتاب میں اوقات پنجگانہ اور کشتی اور تن درستی کی دعائیں درج ہیں[۱] (کشتی بستن یعنی کمر کے گرد مقدس دھاگہ باندھنے کی آریائی رسم ہندوؤں کے ہاں جینیو کے نام سے مروّج تھی۔) اسی کشتی کی رعایت سے پہلوانوں کا کشتی گرفتن نکلا یعنی پہلوان اس دھاگے کی مانند ایک دوسرے کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے تھے۔ (ذرا غور فرمایئے کہ کشتی لڑنے کا محاورہ کہاں سے آیا ہے!) خوردہ اوستا عیسائی مشنریوں کے اثر سے عوام کو بچانے کے لئے لکھی گئی تھی جو انطاکیہ اور آرمینیہ سے ایران پہنچ چکے تھے اسی طرح ردّ مزدکیت کے طور پر اوستا میں مزید اضافے کروائے گئے۔ ساسانی عہد کے آخری دنوں میں ژنداوستا کی تفسیر پاژند کے نام سے قلم بند کی گئی یہ ساری کتابیں مذہب کی اشاعت کی غرض سے مروّجہ پہلوی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ سنسکرت، قدیم مادی یعنی اوستا کی زبان، ہنخامنشی فارسی یعنی اولڈ پرشین۔ پہلوی یعنی مڈل پرشین اور فارسی جدید کے چند الفاظ سے زبان کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔ سنسکرت کا اسورامیدہ، مادی کا اھورمزدہ جدید فارسی کا ہرمزد یا ہرمز ہے سنسکرت کا سوادھا تا مادی کا خاواتا جدید فارسی میں خدا ہے۔ سنسکرت کا کیشا، مادی کا گیسا فارسی جدید میں گیسو بنا۔ پاتیاخش یعنی نائب حکمراں سے غالباً ''پادشاہ'' نکلا درسی یعنی سونا زر بن گیا لیکن درمی سے گھڑا ہوا سکہ درہم اسی صورت میں باقی رہا۔

اب ہمارے پرانے اور عزیز دوست دارائے اعظم کا نقش رستم والا ایک کتبہ

---

[۱] ہر پارسی روزانہ بلاناغہ اپنی کشتی جواب کستی کہلاتی ہے میں عناصر اربعہ کے نام پر چار گرہیں ڈال کر خوردہ اوستا کی ملی لی مادی اور پہلوی زبان کی دعائیں پڑھتا ہے۔

ہنحامنشی فارسی میں ملاحظہ فرمائیے:۔

ژات ی	داری وش	خشائےژسی	وشنا اُرم زُدُ اہا
کہتا ہے	داریوش	شاہ	خواہش اھورمزدہ
ام ا	وھامئ ار	تَ ئ ا	آدم
یہ	بہت سے دیہہ	کہ	میں
آگ رَبُ ائ م	(دیہہ بمعنی شہر) اَپَ ت رَم	در بدح ا	پارسَ
گرب یعنی پکڑ ہے	پَرےدُور	از	پارس

ژات داریوش خشائے ژی دشنا اھورمزدہ امادھاؤ تا آدم اگر یہ ایم اپترم مچہ پارس ___ کہتا ہے داریوش شاہ۔ بخواہش اھورمزدہ یہ بہت سے شہر کہ میں نے پارس سے دُور حاصل کیئے[۱]۔

اب پہلوی ایک عبارت اس کا جدید فارسی ترجمہ دیکھئے:۔

پہلوی:۔ اوہرمزد پنخو دات کو سپیتماں زرتو خشت ماہِ فرور تین روچ ی ہرودت گان می گیہانیکاں دات ہم۔

فارسی جدید:۔ ہرمزد پانخ داد کہ سپیتماں زردشت ماہ فروردیں روز خور داد جان جہانیاں داوم[۲]

ساسانی عہد میں ہنحامنشی فارسی اس حد تک متروک ہوچکی تھی جیسے آج ہم چاسر یا ولی دکنی کی زبان استعمال نہیں کرتے۔ مذہبی کتابوں کے پہلوی تراجم نے مروّجہ نئی زبان کی ترقی میں بہت مدد کی۔ الہامی صحف کا تصور یہودی اور مسیحی اناجیل کی مقبولیت کی وجہ سے ہر جگہ واضح ہو چکا تھا۔ ممکن ہے اس نے بھی ساسانی حکمرانوں کو اپنا باضابطہ مذہبی ادب مرتب کروانے کی ترغیب دلائی ہو۔ شاہ بہرام دوئم (۲۷۶ء۔ ۲۹۶ء) نے مسیحیت کے نئے میلان کو سختی سے کچل کر جارحانہ زرتشتیت کو فروغ دیا۔ ساری سلطنت میں ''چہار طاق'' یعنی

---

۱ و ۲ بحوالہ ''ایران صدیوں کے آئینے میں'' از ڈاکٹر منوہر لعل عشرت۔

چھوٹی چھوٹی چوکور عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کے اندر آتش بہرآم روشن کی گئی۔ اس شہنشاہ کے بے حد طاقتور و متعصب موبد موبدان یعنی چیف اگنی ہوتری کی لکھوائی ہوئی پہلوی عبارتوں میں جو پرسی پولس کے قریب نقشِ رستم اور کعبہ زرتشت وغیرہ کی دیواروں پر موجود ہیں بتلایا گیا ہے کہ آتش بہرام ایران سے باہر سلطنت کے کون کون سے ممالک میں روشن کی گئی۔ کعبہ زرتشت کی تحریر کی دسویں سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موبد موبدان کے حکم سے سلطنت میں بسنے والے ''یہودی و ساماناں[۱] و براماں[۲] ونصرئے[۳] و کرستیاں ازندیک[۴] پر حملے کئے گئے اور اُن کے معبدوں کو مسمار کر دیا گیا[۵] مذہبی کتب کے علاوہ پہلوی میں دوسرے مضامین پر بھی طبع آزمائی ہوئی۔ یونانی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ انوشیرواں عادل کے دربار میں یونانی حکماء کا اجتماع اور سنسکرت کتابوں خصوصاً پنچ تنتر وغیرہ کے پہلوی میں تراجم مشہور واقعات ہیں جن کو دہرانا لاحاصل ہے لیکن زیادہ زور بادشاہوں کے نسب ناموں اور نیم اسطوری تواریخ پر تھا۔ ساسانی دوبار اور صوبائی حکومتوں میں نکھرتی ہوئی فارسی رائج تھی پہلوی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

عہدِ عباسیہ کے فارس میں تین زبانیں موجود رہیں۔ عربی جو سرکاری اور علمی زبان تھی۔ پہلوی جس میں زرتشتی صحف محفوظ تھے اور جو اب عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو چکی تھی اور

---

۱ غالباً وسط ایشیائی شامانیت اور بدھ مت کے پیرو۔

۲ برہمن۔

۳ غالباً نسطوری عیسائی۔

۴ پیروان مانی کو اب زندیک کہا جارہا تھا۔ بعد میں عربوں نے بھی یہ لفظ HERETICS کے لئے استعمال کیا۔

۵ اُن سختیوں کے باوجود بڑی تعداد میں ایرانی اکابر و معززین عیسائی ہوتے رہے۔ مسیحی روم (بازنطیم سے مسلسل جنگ رہتی تھی اور وہاں سے قیدی لائے جاتے تھے جنہوں نے ایران میں عیسائیت پھیلائی۔ آرمینیہ کے قرب کی وجہ سے نسطوریت کا بول بالا ہوا۔ چھٹی صدی عیسوی میں سیرین عیسائی راہب ہندوستان کی سیر کے لئے آیا اور اس نے لکھا کہ مالابار اور لنکا کے گرجاؤں کو ایران کے نسطوری پادری چلا رہے ہیں فتح اسلام کے بعد ایران میں نسطوری کلیسا کا زور گھٹ گیا۔ لہٰذا جنوبی ہند کے عیسائیوں نے اپنا تعلق انطاکیہ کے بطریق سے قائم کیا اسی وجہ سے ان کا کلیسا اب ایرانی کے بجائے سیرین چرچ کہلاتا ہے لیکن مدراس اور کیرل کے دو قدیم گرجاؤں کی صلیبوں پر پہلوی زبان کی لکھی ہوئی عبارتیں آج تک موجود ہیں۔

جدید فارسی جو عربی الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے زیادہ مالا مال اور شستہ ہوتی جارہی تھی اور پہلوی سے مختلف ہوچکی تھی۔ باقی سارے ایران میں مقامی بولیاں رائج تھیں۔ نویں اور دسویں صدی ء میں زرتشتی سماج میں بھی ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہ نئی ذہن پرستی اور آزادخیالی کا دور تھا۔ ہرطرف اسلام کے مختلف فرقوں کے دانشور فلسفیانہ مباحثوں اور مناظروں میں مصروف تھے۔ زرتشتیوں نے بھی جواَب سیاسی طاقت بالکل کھو چکے تھے۔ تحریر کے ذریعے مذہبی مدافعت کی کوشش کی اس کے علماء ابنِ امندیم جن پہلوی کتابوں کے عربی تراجم کا ذکر کرتا ہے ان میں غیر مذہبی تراجم کا ذکر کرتا ہے ان میں غیر مذہبی مضامین بھی شامل ہیں۔ ساسان شاہی میں لکھنا پڑھنا بہرحال انہیں موبدوں اور اگنی ہوتریوں تک محدود تھا اور یوں بھی تحریر کے بجائے اب تک زبانی روایت کی اہمیت زیادہ تھی۔ عربوں کی لائی ہوئی نئی اور روشن علمی فضا سے زرتشتی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک مرتبہ اس سے بہت قبل اُن کو اناجیل کی مقبولیت تصنیف وتالیف کی طرف راغب کیا تھا۔ موجودہ دور میں تو عربوں نے دُنیا کے علوم وفنون کو کہیں سے کہیں پہنچادیا تھا۔ قصہ یہ کہ زرتشتی ۹۷۹ء سے قبل تک (جب ان کی خاصی بڑی تعداد نے ہندوستان ہجرت کی) پہلوی میں متواتر لکھتے رہے۔ جواب بول چال کی زبان نہیں رہی تھی۔ اسی وجہ سے ماہرینِ لسانیات اس عہد کی زبان کو کتابی پہلوی کہتے ہیں۔

جہانِ دیگر

نوٹ: یہ مضمون سن ۱۹۶۰ء سے قبل شائع ہوا تھا اور اِسے میں نے پروفیسر مرزا محمد سعید کے صاحبزادے کمانڈر حسن عسکری کے اس مضمون کے لئے بطور نوٹ نوٹ لکھا تھا جو غالباً نقوش کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا تھا۔

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

''موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے اُلفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اُن کے کمروں کا رنگ ہلکا آبی ہے۔ پردے چمپئی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے مہکتے ہیں۔''

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح ''شخصیت نگاریاں'' اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم نہایت ذوق شوق سے رسالہ ''شمع'' بھی پڑھتے ہیں، اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہوتی تو ہے ایک چنڈوخانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاء اللہ۔ ایک کمرے میں ریڈیو دہاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں ''چوہے دوڑ بلّی آئی'' کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ (یعنی تایازاد بہن کی لڑکی)

اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائٹ لفٹیننٹ کے عہدے پر فائز مگر اُن کا یہ عالم ہے کہ اُن کو ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ دُنیا بھر کے معاملات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، فنونِ لطیفہ سے شدید اُنس ہے اور کومکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ لیٹل لُولُو اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کوئی اُن سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ میں ان سب سے علیٰحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ ابنِ سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ سب گپ ٹھوکی ہے۔) ایک روز ہم حسبِ معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شُکرا کو کیدار میں منتقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اَب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز ــــــ مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا۔) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہوگئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید حِس مزاح غالباً ہماری اپنی ''خصوصیات'' بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اُٹھ کر کینیڈا چلا گیا۔)

میری تین عزیز سہیلیاں[1] اور دوسری سہیلیاں ان سے قطعِ نظر ہم سب ماشاء اللہ سے اٹھارہ اُنیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح بہت دُور تک پہنچتا ہے) ہمارے چچا میاں کا مکان بیکٹ ہاؤس کہلاتا تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہ جہان پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری پر جا کر ایک چھوٹا سا کنکر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اُترے گی۔

---

[1] لکھنؤ کی مشہور، جسپال سسٹرز۔ شکنتلا قدوائی، کملا جسپال، وملا سال

یہ سب بڑے ہوئے تو اے لیجیے ایک سے ایک عالم فاضل چلا آ رہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے۔ ننیہال میں جو بہن بھائی ہیں، اُن کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست دان بن گئے۔

ہمارا کنبہ اب بہت دُور تک تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے۔ مختلف لوگوں سے ملے۔ متنوع کی مصروفیتیں رہیں۔ بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد بحری جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے بمبئی، کلکتہ، ایران کے ساحل، کربلائے معلّٰی۔

پہلی کہانی بعمر چھ سال لکھی۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ" کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا، رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لال ٹینیں لیے اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ اسی زمانے کا ایک منفرد منظر یاد ہے ضلع پرتاپ گڑھ کی ایک شکارگاہ (اس ضلع کے جنگلوں کے بارے میں بعد میں پڑھا کہ اس میں .... شیر کا بھیس بدل کر گھوما کرتے تھے) تو اس شکارگاہ میں رات کے وقت مچان پر ہم بچوں کو چند منٹ کے لئے بٹھالا گیا۔ وہاں ہمارے ایک شکاری ماموں اور ممانی شیر کا شکار کھیلنے کی غرض سے آئے تھے۔ جب ہم مچان پر بیٹھے تھے تو دُور ایک ٹرین جاتی نظر آئی۔ میرے ایک کزن نے بعد میں ماموں سے کہا وہ ٹرین ایسی لگی جیسے جگنوؤں کی لکیریں، اور میں نے کہا وہ ٹرین ایسا لگا جیسے جگنوؤں کی قطار۔ ماموں بولے ایک انگریزی داں اور ایک اُردو داں۔

گڑیوں کا باقاعدہ اسکول کھولا تھا۔ ایک نصف جرمن لڑکی نی نی چچا عبدالستار خیری کی لڑکی تھی اُس کی والدہ جرمن تھیں۔ اُس زمانے میں اکثر ہندوستانی قوم پرست نوجوان انگلستان کے بجائے بغرضِ اعلیٰ تعلیم جرمن جاتے تھے اور وہاں سے جرمن بیبیاں لے آتے تھے جو بہت ہی وفادار اور پتی ورتا اور گھریلو ثابت ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر سلیم الزماں اور ظہیر شمسی کی

بیویاں بھی جرمن تھیں اور نورالدین احمد بیرسٹر کی بیوی انگریز چونکہ تینوں گوری یوروپین اقوام سے تعلق رکھتی تھیں جرمن اور انگلستان کی لڑائی کے دوران بھی اِن تینوں میں آپس میں بہت دوستی رہی نی نی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ ''لیڈی بیلنڈا'' سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی اُس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہر حال میرا گڈا خالص جرمن ہے، سیدھا برلن سے آرہا ہے۔ تمہاری ''لیڈی بیلنڈا'' گو بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے لہٰذا ہے تو ہندوستانی۔ اس در غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی۔

ہمارا کتا نیگس بھی جرمن تھا وہ ایک طویل، پستہ قد اور چھوٹے پیروں والا بے حد پیارا کتا تھا۔ وہ بے چارا دِن بھر اور رات بھر برساتی کے باہر رہتا اُسے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ امّاں ایک بے حد نمازی خاتون تھیں وہ بے چارا گھر میں کیسے آتا لیکن مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا اور میں نے ایک روز پوچھا کہ یہ کتا بھی تو اللہ میاں نے بنایا ہے اور اتنا سویٹ محبت کرنے والا جانور ہے اُسے نجس کیوں قرار دیا گیا ہے، اور بلّی ایسی مکار ذات اور بے وفا شئے ہے اور وہ ہر وقت آپ کے پلنگ پر بیٹھی رہتی ہے۔

جب پہلی کتاب ستاروں سے آگے چھپ کر آئی تو ایک خاتون نے کہا ''آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!'' ______ اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کے لئے میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ ''میرے بھی صنم خانے'' میں سوائے ''پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجئے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجیڈی کی داستان قلمبند کی تھی، کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس ''فٹ نوٹ'' کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں، اُن کی وجہ سے لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے

COMPLEX میں گھرا ہوا ہے NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں اُن لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری ''شخصیت۔'' تو بھئی یہ تو ایک بڑا جدید قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری ''شخصیت'' ـــــ یہ کیا مسخرہ پن ہے!

قرۃ العین حیدر

☆

اُڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور

منجانب: یوحنا عارف

اس کی طرف سے جو ہے اور جو تھا اور جو ہوگا۔ اور مَیں نے اپنے پیچھے نرسنگے کی آواز سنی کہ جو کچھ نظر آتا ہے، اس کو کتاب میں لکھ۔"

یہ روداد جہد البقاء میں ہارنے اور جیتنے والوں کی ہے۔ ظفریاب وہی ہوتے ہیں جنہوں نے خود کو فتح کا اہل بنایا۔ (خدا ان قوموں کی حالت نہیں بدلتا، جنہوں نے خود اپنی حالت نہیں بدلی) بقائے اصلح کا فطری قانون یہ نہیں دیکھتا کہ کون مشرک ہے کون کلمہ گو کون بُت پرست اور کون کمیونسٹ۔

ورجن کوئن ایلزبتھ اوّل سے لے کر ریننگ کوئن ایلزبتھ ثانی تک بنے ہوئے زمرّدیں شجر کے نیچے پھیلا چھوڑ کر امریکن اُڑن ہاتھی زن سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا۔ مشرکین ارض و سمٰوات مسخر کر کے کرۂ قمر پر اپنی انا جیل چھوڑ آئے اور نصف کرۂ ارض پر حاوی ہیں اور ان کا تمدن اپنانے اور اُن کے طرز و معیار زندگی تک پہنچنے کے لیے "قدیم مشرقی روحانی تہذیبوں" کے نام لیوا بیتاب و مضطرب۔

سامنے فرسٹ کلاس میں نیویارک کے ایک سندھی تاجر کی عمر رسیدہ زوجہ ایک فربہ پنجابی لڑکی سے ایک مائیکرو ویو تنور کا تذکرہ کر رہی ہے جو اس نے حال میں خریدا ہے اور جس میں کھانا تین منٹ میں پک جاتا ہے۔

(یادرکھواورایمان لے آؤ کہ دوسرا طوفانِ نوح بڑھیا کے اس مائیکرو ویو تنور سے نکلے گا)

فربہ پنجابی لڑکی نے گلے میں اپنے تازہ ترین فیشن ایبل گرو کی مالا پہن رکھی ہے، جو فلاڈلفیا میں ٹھاٹھ کر رہا ہے۔

ادھر ملحد دہریے روسی کرۂ قمر پر اپنے ہتھوڑے اور درانتی کا نشان چھوڑ آئے ہیں اور باقی دنیا پر وہ حاوی ہیں۔

''رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۔''یعنی خداوند تعالیٰ نے جن اہلِ اسلام کو چھپّر پھاڑ کر بذریعہ تیل دولت عطا کی وہ نیا پٹروڈالر یتی مسلمان فی الحال مونٹی کارلو اور لاس ویگاس جا رہا ہے اور جب تک اس دولت کو اُڑا نہ لے گا انشاءاللہ جاتا رہے گا۔

فرسٹ کلاس میں سندھی خاتون سے آگے چند عرب جلوہ گر ہیں۔ ہاتھ میں اُن کے تفریح گاہوں اور ان قمار خانوں کے متعلق مفصّل اطلاعات کے چمکیلے مصوّر رسالے ہیں۔ ''ملکۃ الملائکہ'' جہاں پہنچ کر وہ لاکھوں پٹروڈالر جوئے میں ہاریں گے (کوئی مضائقہ نہیں اگر برِصغیر پاکستان و ہند کے غریب مسلمان طلباء اسکول اور کالج کی فیس نہ ادا کر سکیں۔) ان عربوں کی بیویاں ناک پر لکڑی کی چونچ لگائے نقاب اوڑھے بیٹھی ہیں۔ یہ لندن اور پیرس میں بے دریغ خریداری کر کے آ رہی ہیں اور اب امریکہ میں بے دریغ خریداری کریں گی۔ (کوئی مضائقہ نہیں اگر مصیبت زدہ فلسطین عورتیں اپنے شکستہ خیموں میں بمباری کا نشانہ بنتی رہیں۔)

اس خالی الذہن گروہ کی منزلِ مقصود امریکہ کی ''سلور اسٹیٹ'' نیواڈا کا شہر لاس ویگاس ہے جو شہر ہسپانیوں نے بسایا تھا۔ اور جو پچھلی صدی میں اس علاقے میں سونے چاندی کی کانیں تلاش کرنے والوں کا قمار خانہ تھا اور اب ساری دُنیا کا قمار خانہ ہے۔ صد حیف کہ جب جہانِ نو پیدا ہونے کی گھڑی آئی تو شیوخ حرم اپنے کنبے لے کر فرنگی مقابروں کی سمت پرواز کر گئے۔

سنہری لڑکیاں انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی) زبانوں اور ریشمی آوازوں میں اعلانات کر رہی ہیں ــــــ لاس اینجلز کا ایک ہسپانوی نژاد امریکن ٹی وی اسٹار کھڑکی سے

باہر شفق کو دیکھ رہا ہے۔ یہی سورج چھ سو برس قبل اسلامی اُندلس کے مدینۃ الزہرا پر ڈوب کر اس بانکے ایکٹر کے اجداد پر اس وقت طلوع ہُوا تھا جب وہ نئی دُنیا کے مغربی ساحل پر الحمرا اور مدینۃ المریم ملکۃ الملائکہ۔ ایل پیلسبو دی، نیوترا اسینورا الارینا دی لاس اینجلز آباد کر رہے تھے، تب سے یہ سورج یہیں چمک رہا ہے۔

مور کی آخری آہ

اسپین میں وہ مقام جہاں آخری شاہ غرناطہ ابوعبداللہ اپنی شکست کے بعد کھڑا ہو کر رویا تھا، ''مور کی آخری آہ'' کہلاتی ہے۔ ''لوک ہارٹ'' نے اپنے ''اسپینش بیلیڈ'' میں لکھا:۔

''بوعبدل نے غرناطہ کی کنجیاں فرڈی ننڈ کو تھمائیں اور اپنے شہر پر الوداعی نگاہ کی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر کوہستان کی سمت چلا گیا۔ اس پہاڑی پر پہنچ کر اس نے اپنی سلطنت پر نظر ڈالی جسے وہ کھو چکا تھا ''اللہ اکبر''۔ اس نے آہ بھری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ماں عائشہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے کہا ''تم عورتوں کی طرح رو سکتے ہو کیوں کہ تم مردوں کی طرح لڑ نہ سکے۔''

جب سورج ڈوب رہا تھا، غرناطہ میں لوگ روئے۔ کچھ نے تثلیث کو پکارا۔ کچھ نے محمدؐ کو۔ قرآن یہاں سے چلا گیا۔ صلیب آ گئی۔ گرجاؤں میں گھنٹیاں بجیں۔ الحمراء کے میناروں سے ہلال نوچ کر پھینک دیئے گئے۔ ایک بادشاہ ظفرمند آتا ہے۔ ایک سلطان روتا ہُوا رُخصت ہوتا ہے۔ گریہ کناں اپنی سفید داڑھی نوچتا نوحہ زن ہے۔ الوداع غرناطہ! الوداع بے مثال شہر! رُخصت اے فخرِ جہاں۔ سات سو سال تو نے ایک مغرور توانا بلند مرتبت نسل کی پرورش کی۔ اعلیٰ نسب شاہی خاندان تیرے محلات میں بسے رہے اب جاتے ہیں۔ دلاور سُورما تیری گلیوں میں پھرے جو مسیحیوں سے لڑتے تھے اور حسیناؤں کی خاطر اور اپنے رسولؐ کی خاطر اور اپنی سلطنت کی حجازی اُمیدوں کے گھر جا کے دیکھو وغیرہ کی خاطر تیغ زنی کرتے

تھے۔صد حیف کہ تیرے باغات اور آبشاروں اور مرغزاروں کا حسن گہنا گیا۔

واحسرتا ____ واحسرتا ______

بوعبدل افریقہ چلا گیا جہاں اُس کی اولاد نے بھیک مانگی جس طرح سات سو سال بعد مغلوں کی اولاد دلّی میں بھیک مانگنے والی تھی۔ بقائے اصلح کا قانون اٹل ہے۔

اس الحمراء کے ایوانِ سفراء میں جس کے زرّیں تخت پر چند روز قبل تک خلفائے اُندلس جلوہ گر ہوئے تھے، سن چودہ سو ترانوے عیسوی میں ایک صبح ملکہ ازابل متمکن تھی اور ڈون کرسُفر اس کے سامنے دوزانو جُھکا نئی دُنیائیں تلاش کر کے ''ملکہ کے تاج میں ایک ہیرا جڑنے'' کی درخواست پیش کر رہا تھا۔ زردوزی کے کلمۂ طیّبہ سے مزیّن خلفائے اُندلس کا سرخ بیضوی پرچم سرنگوں ہُوا۔ ڈون کرسٹفر نیا بیضوی صلیبی پھریرا جہاز لے کر اس کے پورے دس سال بعد پُرتگالی جھنڈا الہراتا بادبانی جہاز پر اطالوی مہم جُو سینورا مریگو ____ برازیل کے ساحل پر ______

اب ذرا قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھو۔

اگر ہسپانیہ کی مختلف مسلمان ریاستوں کے حکمراں بری طرح آپس میں لڑ کر کمزور نہ پڑتے اور آخر میں عیسائیوں سے مغلوب نہ ہوتے تو کیا خود نئی دنیاؤں کی تلاش میں نہ نکل سکتے تھے۔ مگر خداوند تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ مولانا حالی مسدّس اور علّامہ اقبال شکوہ لکھیں۔

ایک ہسپانوی فادر ٹہلتا ہُوا واپس آ کر ٹی وی اسٹار کے نزدیک کرسی پر آ کر بیٹھا۔ اور تسبیح پھیرنے میں مصروف ہُوا۔

سنو! بے شمار شکست خوردہ اندلسیوں کو جبراً اصطباغ دیا گیا تھا۔ غرناطہ کیتھڈرل کے شاہی چیپل میں الطار کے پیچھے دیوار پر ایک بڑی چوبی اُبھری ہوئی رنگین تصویر میں (جو زوالِ غرناطہ کے چوبیس سال بعد تیار کی گئی تھی) گرجا میں حوض کے گرد جمع اندلسی مَردوں اور عورتوں کو پادری بپتسمہ دے رہے ہیں۔ نئی عیسائی حکومت نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ باقی یورپینوں کی طرح نہانا ترک کر دیں۔

۱۸۶۷ء میں فلپ دوئم نے الحمراء کے تمام حمام توڑ ڈالے کہ مفتوح مسلمان نہانے سے باز آئیں۔ زوالِ غرناطہ کے بعد وہ بے چارے ناکام گوریلا لڑائیاں لڑتے پھرے۔

مارے گئے۔ مراکش جلاوطن ہوئے۔ باقی ماندہ کو زبردستی بپتسمہ دیا گیا اور وہ مسیحی آبادی میں مدغم ہو گئے۔

مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک ہسپانیہ کو یورپ کا دانش کدہ اور زرخیز ترین ملک بنائے رکھا۔ اُن کے خاتمے کے بعد اُندلس ایک بار پھر صحرا میں تبدیل ہُوا۔ نہریں اور کھیت خشک۔ مدارس ویران۔ نئے مفلوک الحال عیسائی ہسپانوی قسمت آزمائی کے لئے سمندروں پر نکلے۔ بہت جلد بحیثیت ایک بددماغ بے رحم امپریل بحری طاقت اپنے عرب ورثے کا غرور اور بانکپن اور موسیقی اور مورش طرزِ تعمیر ساتھ لئے وہ دنیا پر چھا گئے۔ مشرق میں گوا اور فلپائن، شمالی امریکہ میں فلوریڈا مغربی صحرا، کیلی فورنیا، میکزیکو، جزائر غرب الہند، سارا جنوبی امریکہ ـــــــ

سیاہ چشم ٹی وی اسٹار اور میڈرڈ سے آنے والا ہسپانوی فادر دونوں اپنے اس عرب ورثے سے لاعلم اور بے نیاز ہیں۔ عرب امیج اس وقت یہ قمار باز پٹرو ڈالر پتی اور چونچ نما نقاب پہنے اُن کے حرم کی عورتیں دُنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

گلِ آفتاب

اسپینش فادر کے عقب میں ایک فربہ اطالوی بیٹھا ہے (اس کی قوم نے مارٹن لوتھر پیدا کیا تھا) اس کے ہاتھ میں جرمن رسالہ ہے اور رسالے کے سرورق پر ایک دوسرے درجے کی طاقت برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ اپنی عمر سے سترہ سال چھوٹے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک کشتی کے ڈیک پر شمس خوری میں مصروف۔

مارگریٹ کی طلاق پر تہلکہ نہیں مچتا۔ ہنری ہشتم نے بسلسلہ شادی وطلاق پاپائے روم سے ''کٹی'' کر کے اپنا ڈیڑھ انچ کا گرجا الگ بنالیا تھا تو سارے یورپ میں ذہنی زلزلہ آ گیا۔ کیتھولک چرچ کی زیادتیوں کے خلاف پروٹسٹنٹ یعنی پروٹسٹ کرنے والے انگریز کیتھولک ہسپانیہ کو بحری شکست دے کر دُنیا کو مسخر کرنے نکلے۔ المانوی شورشِ اصلاحِ دین کے مفید نتائج سے بہرہ ور ہو کر ولندیزیوں نے کشور کشائی شروع کی۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے ورک ایتھک، سخت کوشی، محنت، ضمیر پرستی اور فرد کی آزادی پر زور دیا نشاۃ ثانیہ کی ولوہ خیزی پروٹسٹنٹ وِرک ایتھک، نیا ذوقِ تجسس، عقلیت پرستی۔ چنانچہ دورِ جدید ایلزبتھ اوّل کے وفادار امیر سر والٹر ریلے نے امریکہ میں برطانیہ کی پہلی نوآبادی ۱۶۰۷ء میں اپنی ورجن کوئن کے نام پر ورجینیا آباد کی تھی۔ عہدِ ایلزبتھ میں برطانوی پارلیمنٹ کی مذہبی اصلاحات کو ناکافی سمجھنے والے PURITAN لوگ مذہبی بدعتوں کے مکمل خاتمے کے خواہاں۔ گویا وہابی۔ لہٰذا کاؤنٹرز ریفارمیشن کے مظالم سے عاجز آ کر رائے حصولِ آزادیٔ افکار و ضمیر ایک سو دو

پروٹسٹنٹ مہاجر ۱۶۲۰ء میں بروز ۵ راگست مے فلاور نامی جہاز پر (مے فلاور انگریزی میں گلِ آفتاب کا نام ہے اور انگلش موسمِ بہار میں کھلتا ہے) پینسٹھ دن بعد بروز ۲۱ ستمبر امریکہ کا سر سبز مشرقی ساحل۔ امریکن خزاں کے شاندار رنگوں سے معمور اور سُرخ فام اصلی امریکن اپنی جنت میں بیٹھے مزے سے تمباکو کا دُھواں اُڑا رہے تھے۔

سفید دیو جہاں پہنچا نیٹو برباد ہوئے۔ چین، سارا مشرق۔ سارا امریکہ۔ اور وہ سترہویں صدی تھی۔ اور سفید ساحر ساری دُنیا پر اپنا منتر پُھونکنے نکلا تھا۔

گو اس کشتی پر سوار اُصول پرست انگریزوں نے آزادیٔ ضمیر کی خاطر وطنِ عزیز ترک کیا۔ مے فلاور کے یہ مسافر پلگرم فادر کہلائے۔ نیٹو "ریڈ انڈین" کہ ہر اسکول کا بچہ جانتا ہے۔ ڈون کرسٹفر کولمبس انڈیا کی تلاش میں امریکہ جا پہنچا تھا اور وہاں کی آبادی کو "انڈین" سمجھا تھا۔

یہ وہابی پلگرم فادر اپنے ساتھ کنگ جیمز بائیبل لائے تھے جو پروٹسٹنٹ انجیل نو سال قبل چھپی تھی۔ جرمنی کے مارٹن لوتھر نے مذہب کو کیتھولک پاپائے روم اور پادریوں کے شکنجے سے آزاد کرایا تھا۔ چرچ میں عبادت پُر اسرار مذہبی رسوم کی ادائیگی پر مبنی تھی۔ سادگی پسند پروٹسٹنٹ مذہب میں منبر پر کھڑا اخلاقیات کا درس دینے والا واعظ اہم قرار پایا۔ (بلی گرئیم اسی پروٹسٹنٹ روایت کی دین ہے اور بلی گرہم صرف امریکہ میں پیدا ہو سکتا تھا۔)

کنگ جیمز بائیبل بہت جلد انگریزی ادب کا سنگِ میل بنی۔ جب پلگرم فادر امریکہ پہنچے ولیم شیکسپئیر کی وفات کو صرف چار سال ہوئے تھے۔ "اسی دوسرے باغِ عدن نصف فردوس" انگلستان میں آمریت پسند چارلس اوّل کے وفاداروں اور جمہوریت پسندوں کی خانہ جنگی کے دوران مزید جمہوریت پسندوں نے امریکہ پہنچ کر نیو انگلینڈ بسایا۔

سترہویں صدی کے نصف اوّل کی کیتھولک پروٹسٹنٹ جنگوں میں کام آنے سے بچنے کے لیے جوق در جوق اہلِ یورپ شمالی امریکہ پہنچا۔

سترہویں صدی میں یورپ اور انگلستان کے باشندے اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے۔ لیس کے بے حد چوڑے کالروں اور کفوں والے جھال پال کوٹ۔ بے حد وسیع پھچوں کی ٹوپیاں۔ کمال یہ ہے کہ اس قدر مفصل کپڑے پہن کر یہ لوگ کسی ذوق و شوق سے

بے تکان لڑتے تھے۔ جہانِ تازہ ڈسکور کرتے تھے اور سائنس کی ایجادات کرنے میں جُٹے تھے۔ فرانس اور انگلستان والے امریکہ میں نوآبادیاں قائم کرنے والے ایک دوسرے سے بھڑ رہے تھے۔ غرضیکہ بڑی رونق کا زمانہ تھا۔ اہلِ فرانس نے کینیڈا آباد کیا اور وہاں سے ذرا نیچے آ کر۔ CREAF LAKES کا سارا علاقہ جہاں سے مسی سپی دریا شروع ہوتا ہے۔ اس دریا پر جہاز رانی کرتے وہ جنوب تک جا پہنچے۔ وہاں لوزیانا کی ریاست اور شہر نیو اولینز بسایا۔ شمال مغرب میں ولندیزیوں نے نیو ایمسٹرڈم آباد کیا جسے بعد میں انگریزوں نے چھین کر اس کا نام نیو یارک کر دیا۔ اور سب نے مل کر لال بھارتیوں کا بھرتہ بنایا جو ہسپانیوں کے ہاتھوں مارے جانے سے بچ رہے تھے۔ اہلِ ہسپانیہ نے میکزیکو کی قومی تہذیب بالکل نیست و نابود کر دی تھی۔ جس طرح وہ کچھ عرصہ قبل اُندلس کو نابود کر کے آئے تھے۔

انتہائی زرخیز زمین، گھنے جنگلات، معدنیات، ہزاروں میل لمبے دریا، شاداب مرغزار، متنوع قدرتی ذخائر، اور اُن کو کام میں لانے اور ترقی دینے والے جفاکش مہاجرین۔ شمالی امریکہ کی تیرہ برطانوی نوآبادیوں کی دولت تیزی سے بڑھی۔ یورپ کی لڑائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے انگلستان نے اپنی متمول امریکن نوآبادیوں پر مزید ٹیکس لگائے۔ چائے پر محصول عائد کیا، تو انگریز نژاد امریکنوں نے بھنا کر ساری چائے بوسٹن کی بندرگاہ میں پھینک دی تو دیکھو کہ چائے کی پیالی سے طوفان اُٹھا اور امریکن جنگِ آزادی شروع ہوئی اور ۱۹/اکتوبر ۱۷۸۱ء کے روز انگریز جنرل کارنوالس نے ہتھیار ڈالے ___ مگر یہ بھی دیکھو اور عبرت پکڑو کہ عین اسی زمانے جب برطانیہ نے امریکہ کھویا، ایسٹ کمپنی کا سُرخ صلیب اور سُرخ و سفید دھاریوں والا پرچم اہلِ ہند کی نااہلی اور نفاق کے سبب سرزمینِ ہند میں نصب کیا۔ ٹیپو، جنرل واشنگٹن وغیرہم سے زیادہ جری تھا مگر مرہٹے تو خیر مرہٹے تھے خود نظامِ دکن اس کے خلاف انگریزوں سے جا ملے۔

اور یہ بھی دیکھو کہ پروٹسٹنٹ مشنری اسپرٹ اور واعظ کے تبلیغی جوش سے سرشار بائیبل سنبھالے امریکن مرد اور عورتیں چند سال کے اندر اندر اوائل اُنیسویں صدی میں اسکول اور میڈیکل کالج قائم کرنے برطانوی ہند پہنچنے لگے۔

امریکن انقلاب فرنچ انقلاب کا پیش رو تھا۔ ''آزادی۔ مساوات اور اخوت'' اور

امریکن تموّل کے چرچے یورپ میں شروع ہو چکے تھے۔ زارشاہی روس اور پولینڈ کے مظلوم یہودی۔ مفلس سِسلی اور آئرلینڈ اور یونان اور البانیہ کے کسان، سارے پریشان حال یورپ کے غرباء اور مساکین، یا ایڈونچر کے خواہاں، یا جرائم پیشہ بدمعاش، اور اُن کے علاوہ دانشور، اصول پسند، سیاسی آئیڈیلسٹ، ضمیر پرست، سبھی انیسویں صدی میں ''بہترین مواقع کی سرزمین'' کا رُخ کرتے ہیں۔ ایک انگریز آرٹسٹ فورڈ میڈوکس براؤن دلدوز تصویر بناتا ہے۔ ہَوا کے تھپیڑوں کے مقابل ایک اُداس انگریزی کنبہ کشتی میں بیٹھا ڈوور کی سفید چٹانوں کو آخری بار دیکھ رہا ہے اور بیسویں صدی میں آمریت اور فسطائیت اور ناسیتوں سے پناہ لینے کے لیے یورپ کے دانشور اور سائنس داں بالخصوص اُمّتِ موسیٰ ؑ کے جرمن اہلِ علم و فضل کی ایک اور دلدوز تصویر ہے کہ البرٹ آئن سٹائن۔ سر پر جھوا سفید بال۔ معصوم سویٹ چہرہ، داہنا ہاتھ اُٹھائے حلف وفاداری لے رہے ہیں۔ (مَیں نے اس آواز دینے والے کو دیکھنے کے لئے منہ پھیرا۔ اس کے سر کے بال سفید اون بلکہ برف کی مانند سفید تھے۔) یوحنا عارف نے کہا ____

خداوندِ خدا نے انجیل مقدس میں فرمایا۔

''میں اس زندگی کے درخت میں سے جو خدا کے فردوس میں ہے پھل کھانے کو دوں گا'' ____ گوڈز اون کنٹری۔

لیکن حبشیوں کے لیے نہیں۔

یوحنا نے اپنے مکاشفے میں دیکھا اور اس تخت کے سامنے آگ کے سات چراغ جل رہے ہیں اور اس کے سامنے گویا شیشے کا سمندر بلور کی مانند ہے اور تخت کے بیچ میں اور تخت کے گرداگرد چار جاندار ہیں اور چوتھا اُڑتے ہوئے عقاب کے مانند ہے اور اِن چاروں کے چھ چھ پَر ہیں اور چاروں طرف اور اندر آنکھیں ہی آنکھیں اور جب مَیں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان پر ایک عقاب کو اُڑتے دیکھا اور بڑی آواز سے یہ کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آواز کے سبب سے جن کا پھونکنا ابھی باقی ہے۔ زمین پر رہنے والوں پر۔

مے فلا در بادبان پھیپھٹا تا ساحل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک پلگرم فادر نے اپنی نئی نویلی پروٹسٹنٹ انجیل میں یوحنا کے مکاشفے کی تلاوت کرتے کرتے آسمان پر نظر ڈالی۔ اس

اُمید پر کہ شاید ان روپہلے بادلوں پر سوار مسیح ناصری ابھی واپس آتا ہو، وعدے کے مطابق ___ لیکن آسمان پر ساحلی پرندے اُڑ رہے تھے اور اُڑن ہاتھی بھی ابھی غیب میں تھے۔

تب مَیں نے نیچے اُترتے ہوئے اُڑن ہاتھی پر سے سمندر کی طرف نگاہ کی جہاں فلک شگاف شہر نیویارک دُور دُور تک پھیلا تھا اور اونچے پلوں کے نیچے سے جہاز گذر رہے تھے۔ اور بندرگاہوں میں ہزار ہا بادبانی ڈونگیاں اور موٹر کشتیاں جگمگا رہی تھیں۔ دھند لکے میں مجسمہ آزادی کا ایک بار چمکا۔ مسافروں نے موسیقی کے سماعت کے آلے کانوں سے علیحدہ کیے۔ کانوں میں نرسنگے کا پھونکا جانا ابھی باقی ہے۔

ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آواز جن کا پھونکا جانا ابھی باقی ہے۔ اس زمین کے رہنے والوں پر افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

پہلا افسوس: مسیح ناصری کی دوبارہ آمد کے منتظر اور ظہور امام مہدی آخر الزماںؑ کے منتظر اس زمین کے باسیوں کے درمیان عنقریب صلیب و ہلال کی معرکہ آرائی شروع ہونے والی ہے۔

دوسرا افسوس: جنوبی اصطباغی دیندار خدا پرست عیسائی صدرِ جمہوریت اور مادّیت پرست روس کے مابین سرد جنگ کا آغاز۔

تیسرا افسوس: آلِ اسمٰعیل اور آلِ اسحٰق کے بیچ خونریزی بدستور جاری ہے۔ الاماں۔ الاماں۔ الامان۔

تب کینیڈی ایرپورٹ سے لاگاردیا کے لیے ٹیکسی میں سوار کراتے ہوئے موٹے سادہ مزاج امریکی افسر نے گھڑی دیکھی اور بولا ____ ''پولیش رائٹرز کا پلین وارسا سے چند منٹ میں پہنچنے والا ہے اب مجھے اُن کا استقبال کرنا ہے __ '' گویہ آمدورفت مک آرتھی کے دور میں ممکن نہ تھی۔ لیکن ساری دُنیا ایک بار پھر تلوار کی دھار پر سے گذرنے والی ہے۔

''اب تو ہمارا پوپ بھی پول ہے۔'' موٹے افسر نے لفظ پوپ ادا کرتے ہوئے تعظیماً ہاتھ جوڑے وہ غالبًا نیویارک آئرلیش تھا۔

مغرب کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ لڑائیاں خواب وخیال ہوئیں (آئرلینڈ کا قصہ دوسرا ہے کہ وہاں نہ ریفارمیشن آیا نہ صنعتی انقلاب) چار سو سال قبل چیرونیٹ فادر لالولا نے

یورپ میں اینٹی ریفارمیشن تحریک چلائی تھی۔ سارے برِّاعظم میں ہزار ہا پروٹسٹنٹوں کو زندہ جلادیا گیا۔ آج سارے مغرب میں (مع امریکہ) اس کیتھولک رہنما کے نام پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ پروٹسٹنٹ ان کے سامنے دھرنا نہیں دیتے کہ یونیورسٹی کا نام بدلو۔ لیکن ہمارے ہاں ہندو مسلم شیعہ سُنّی فسادات کیوں نہ جاری رہیں۔ ہم کوئی بے حیا۔ بے دین مغربی تھوڑا ہی ہیں۔

شکاگو کیتھولک آئرلش پولستانیوں ہسپانیوں وغیرہ کا دوسرا بڑا شہرادھر دنیا کا مصروف ترین ایرپورٹ جہاں ہر ایک منٹ پر ایک طیارہ اُترتا اور ایک پرواز کرتا ہے، وقفے وقفے سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جارہا ہے ___ "ایک مذہبی ٹولی صدر دروازے کے باہر مسافروں سے چندہ وصول کرنے کے لیے مستعد ہے۔ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اس طیران گاہ کا ان چندہ بٹورنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

چندہ بٹورنے والے "ہرے کرشنا ہرے راما" کے امریکن لڑکے لڑکیاں گیروا دھوتیاں اور ساریاں پہنے باہر بے تکان کیرتن گا رہے ہیں جہاں کنکریٹ کے میلوں طویل پیچ دار پلوں والے مسقف کار پارک کے اندر کھڑی ہزار ہا کاروں سے اُتر کر بڑھیا کپڑے پہنے بڑھیا سوٹ کیس سنبھالے ہزاروں ہزار مسافر خاموشی سے اندر جا کر ایرپورٹ کی قالینوں سے آراستہ فرلانگوں طویل راہ داریوں سے گزرتا، جھلملاتی پُرتکلف لاؤنجوں اور ریستورانوں میں انتظار کرتا، کمپیوٹرز پر طیاروں کی آمدورفت کے اوقات دیکھتا۔ سُرخ قالینوں سے آراستہ امیرجیٹی کی مسقف گیلریوں کے دروازوں سے جٹ طیاروں پر سوار ہو ہو کر سارے ملک کی عین مین اسی قسم کی دوسری طیران گاہوں کی طرف جانے میں مصروف ہے۔ وہ دھوتی پوش نوجوان اس اشیاء پرست ٹیکنولوجی کل معاشرے کو مسترد کرکے بندرابن فینٹسی سے مسحور ایسی طیران گاہوں سے اُڑ کر ہزاروں میل دُور متھرا ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے، وہاں کے افلاس، بھکاریوں، غلاظتوں، گل غباڑے، گرمی، بندروں، ہانپتے ہوئے فاقہ کش قُلیوں پلاسٹک کے بھدے کھلونے، بیچتے غریب خوانچہ فروشوں، غربت زدہ نحیف لاغر، فرسٹریٹیڈ مسافروں سے کھچا کھچ بھری بدبودار ٹرینوں کی ساری مادی حقیقت کو یکسر نظر انداز کرکے مہامنتر جپتے وہ نوجوان امریکن بندرابن جارہے تھے۔

جب کہ کرشنا کے دُکھی فلاکت زدہ دیس کے باسی امریکہ کے سپنے دیکھ رہے ہیں۔
ٹرینیں امریکہ میں تقریباً عنقا ہوگئی ہیں۔ ساری آبادی بذریعہ ہوا اور کار

رواں ہے۔
شکاگو سے تیسرا طیارہ برائے سیڈر ریپڈ امریکن مڈ ویسٹ۔ اُفق تا اُفق پھیلی جھیلیں بھٹے کے زرد کھیت۔ سپاٹ میدان۔ دریا۔ جنگل۔

سیڈر ریپڈز کی چھوٹی سی طیران گاہ کے گورے ہجوم میں صرف ایک سانولا آدمی نظر آیا سر پر جھوَابال۔ ستواں ناک۔ ذہین چہرہ۔ ساتھ جینز میں ملبوس ایک سانولی نوعمر لڑکی۔ وہ افریقی چھپائی کے کُرتے میں ملبوس تھا مگر اپنے جھوَابالوں کے باوجود بلیک امریکن یا مخلوط النسل امریکن یا افریقی معلوم نہ ہوتا تھا۔

اس نے کہا ____ ''میرا نام پیٹر ناضرۃ ہے۔ میری لڑکی کیتھرین۔ آیوواسٹی سے آپ کو لینے آیا ہوں۔ آئی ڈبلیو پی کے اسٹاف پر ہوں اور یونیورسٹی میں جدید افریقی ادب پڑھاتا ہوں۔ آپ کو انگریزی میں کانی پڑھا ہے اور آپ کے متعلق کلاس میں لیکچر بھی دیئے ہیں۔

''لیکن تم بلیک امریکن تو نہیں لگتے۔''

''یوگنڈا کا رہنے والا ہوں۔''

''تم افریقی بھی نہیں لگتے۔ شکلاً ہندوستانی معلوم ہوتے ہو۔''

''میرے والد گوا سے یوگنڈا چلے گئے تھے۔ ۶۱ء میں مَیں انگلستان گیا۔ مَیں اور میری بیوی برطانوی شہری ہیں۔ عیدی امین کی وجہ سے یوگنڈا واپس نہ جاسکے۔ یہاں آگئے۔ یوگنڈا کے متعلق میرے دو سیاسی ناول یہاں سے شائع ہو چکے ہیں۔''

گھپ اندھیری رات میں پیٹر کار ایکسپریس وے پر لے آیا۔ بے حد طویل جہازی فولادی مال بردار ٹرک ان گنت سُرخ بتیوں سے معمور مبادا اندھیرے میں کاریں اُن سے ٹکرا نہ جائیں، زائیں زائیں برابر سے گذر رہے تھے۔ تیس میل بعد آیوواسٹی کی روشنیاں ان گھپ اندھیری راتوں میں تین چار سو سال پہلے فرانسیسی نو آباد کار اپنی ویگنوں پر تجارت کا مال لادے لشٹم پشٹم چرخ چوں اپنی ایک ٹریڈنگ پوسٹ سے دوسری کی طرف جارہے ہیں۔

سُرخ ہندوستانیوں کے خیموں میں پہنچ کر ان سے لین دین میں مصروف ہیں اور اُن سے یہ زمینیں بھی چھین رہے ہیں۔ (آیووا بھی ریڈ انڈین نام ہے)۔ آیوواندی کے نزدیک نارتھ دوبُیوک اسٹریٹ۔ اور آخر اٹھارویں صدی میں جُولین دوبُیوک فرانسیسی نے مزید علاقے سُرخ فام قبائل سے حاصل کر کے جستے کی کانیں دریافت کی تھیں ـــــ پل پل چھن چھن اہلِ مغرب ساری دُنیا پر چھائے جا رہے ہیں۔

شاہراہ نارتھ دوبُیوک پر سے زناٹے سے کاریں گذرتی جاتی ہیں۔ اس کے کنارے پارک کے مقابل مے فلاور اپارٹمنٹس کی پلیٹ کلاس بیرونی صدر دروازے کے نزدیک گلِ آفتاب کی تصویر۔ عمارت کے کونے پر پیٹر کے گراؤنڈ فلور فلیٹ کے اندر خلیق میری خوش مزاج ناضرت کھانا پکانے میں مصروف۔ چہرے پر شرارت۔ اس کے والدین گوا سے تنزانیہ چلے گئے تھے۔

ٹیلی فون پر بات کر کے پیٹر نے میری سے کہا۔ ''شاؤشن۔ بیکنگ سے کل صبح پہنچ رہے ہیں۔'' مَیں نے میز پر رکھے اخباروں پر نظر ڈالی۔ ۷ اراگست کے ضخیم نیویارک ٹائمز کے ایک صفحہ پر پال اینگل کی تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ''مارک ٹوئن کے دریا پر مارکسسٹ اور غیر مارکسسٹ چینیوں کی دعوت۔ آیوواسٹی کے مشہور انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام میں چینیوں کے علاوہ اس سال اسرائیل، جورڈن، مصر، کولمبیا، ہندوستان، آئرلینڈ، ہنگری، پولینڈ، اسپین' اور ہسپانوی، پرتگالی زبانوں میں لکھنے والے جنوبی امریکن ادیب اُندلس کے ادیب اور شاعروں کی ٹریجڈی سے لاعلم اور بے پرواہ۔ بہت بڑا فاصلہ تھا۔ اور پیٹر اور میری ناضرت جن کی زبانیں انگریزی اور پرتگالی اور کونکنی وہ بھول چکے تھے۔

چند سال ہوئے کنڑ ادیب یوآر رمورتھی نے لکھا تھا: ''حیرت ناک بات یہ ہے کہ جدید ہندوستانی ذہن اوریجنل نہیں رہا۔ ہماری ہر چیز مغرب کی نقالی ہے۔ خود اپنی پرانی تہذیب کی جدید کے رویئے کا محرّک بھی مغرب ہی تھا۔''

''اور تم لوگ ـــــ'' مَیں نے کھانا کھاتے ہوئے پیٹر سے کہا۔ ''زوالِ غرناطہ کے بعد کی اس مسیحی ہسپانوی توسیع کی یادگار ہو۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے سارا مشرق مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے اور اب اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا، وہ جو لطیفہ تھا کہ مہاتما گاندھی

مائیکروفون پر قدیم ہندی رام راج اور گاؤں کی غیر مشینی تمدن کا راگ الاپتے تھے۔ ملّا خمینی ٹیلی ویژن پر ساتویں صدی کا پرچار کر رہے ہیں۔ جہد البقاء میں یہ لوگ ہم سے سبقت لے گئے۔ ہم لوگ جذبۂ تجسس کھو چکے تھے۔ یہ لوگ نشاۃ ثانیہ سے لے کر آج تک متحیر ہیں۔ پیہم سوالات کر رہے ہیں۔ سوچ رہے ہیں، کرید میں لگے ہیں۔ اسی وجہ سے اوریجنل باتیں سوچتے ہیں۔ نت نئے ے فلاورز پر سوار نئی دُنیا کی طرف مسلسل سفر میں ہیں۔"

فون کی گھنٹی پھر بجی۔

مشرق میں ان مغربی ایجادات کا استعمال کرتے ہوئے جن کو یوروپین سامراج نے وہاں متعارف کیا۔ ہم اپنے دل کو خوش کرنے کو قدیم ہندوا اور میڈیول عرب سائنسدانوں کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن پچھلے سات سو سال میں ہم نے خود کیا ایجاد کیا؟۔

پیٹر میز پر واپس آیا۔ "کل صبح ڈاکٹر نادیا بشائی اسکندریہ سے پہنچ رہی ہیں۔ عربی اُن کی مادری زبان ہے مگر انگریزی میں شاعری کرتی ہیں۔ وہی معاملہ کہ تیسری دنیا کا ادیب بیک وقت دو ذہنی کائناتوں میں زندہ ہے۔ مغربی زبانوں میں لکھتے ہوئے کیا اپنے اندرونی شخصی نسلی اور قومی لاشعوری رویئے بدل جاتے ہیں؟۔"

"لیکن شاعری کی تو یونیورسل زبان ہے۔"

میری بولی۔

"نادیا بشائی قبطی نام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قبطی۔ عربی۔ انگریزی رویّے۔" مَیں نے اظہارِ خیال کیا۔

صورِ اسرافیل

ڈاکٹر نادیا یاز کی بشائی کچن کی میز صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''لندن یونیورسٹی سے مَیں نے انگریزی شاعری کی میوزیکل بنیادوں پر کام کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔ اب جامعہ اسکندریہ کے شعبۂ انگریزی کی صدر ہوں۔ انگریزی میں نظمیں لکھتی ہوں۔ فرنچ اور ہسپانوی جانتی ہوں۔ میرے علاوہ مصر میں اور کوئی انگریزی میں شاعری نہیں کرتا۔''

''واقعی؟ــــ'' مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

''مَیں کونسرٹ پیانسٹ بھی ہوں۔ دراصل مَیں اپنی کوالی فیکیشنز کے لحاظ سے مصر میں منفرد ہوں۔''

''مصر تو بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔ یقیناً تمہاری طرح کی بہت سی خواتین وہاں ہوں گی۔'' مَیں نے کہا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر بشائی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ''مَیں منفرد ہوں۔''

انکسار عزیزہ نادیا کی کمزوری نہیں تھا۔

مَیں برتن سجانے میں منہمک رہی۔ میرا اور اس غیر معمولی قبطی خاتون کا مشترکہ باورچی خانہ ہمارے کمروں کے وسط میں واقع تھا۔ مے فلاور کی مختلف منزلوں پر بالکل اسی طرح کے دوہرے اپارٹمنٹس میں ساری دُنیا کے ادیب سیڈر ریپڈز سے آ آ کر سیٹل ہونے میں مصروف تھے۔

''مصر میں کتنے قبطی ہوں گے؟'' مَیں نے دریافت کیا۔

''آبادی کا بہت بڑا تناسب ہے۔ لیکن مردم شماری میں اُن کی تعداد بہت قلیل بتائی جاتی ہے۔'' نادیا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ''بہت سے قبطی ان ہی ___ وجوہات کی بنا پر مصر سے ہجرت کر رہے ہیں۔'' ایک مذہبی اقلیتی فرقے کی نفسیات اور مسائل ہر ایک ملک میں یکساں ہیں۔

نادیا نے سانچ تلنے کے لئے کڑھائی چولہے پر رکھی اور اپنے کمرے میں گئی۔ مَیں اپنے بیڈروم میں آ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں پارک لینڈ میں سے گذرتی دریائے مسی سپی کی شاخ آیوواندی کے پُل پر یونیورسٹی کی فری بسیں آ آ کر رُک رہی تھیں۔

اچانک میرے کمرے میں دیوار میں نصب ٹیلی فون کے اوپر لگے ایک لاؤڈ اسپیکر میں زوردار سائرن سا بجنے لگا۔ مَیں نے اس لاؤڈ اسپیکر کو اب تک نہ دیکھا تھا۔ سوچا شاید اندرونی ریڈیو سسٹم ہے۔ خراب ہو گیا ہے۔

صورِ اسرافیل چند منٹ تک بجا کیا پھر آپ سے آپ بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مَیں اخبار لانے کے لئے (جو ساری عمارت کے کرائے داروں کے لیے مفت رکھے ملتے تھے) نیچے جا رہی تھی۔ لفٹ میں ایگنیس مل گئیں۔ ایگنیس ہنگری کی مشہور شاعرہ تھیں۔ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی۔ پلیٹینم بلونڈ بہت پریشان نظر آتی تھیں کہنے لگیں ''کیا تمہارے بیڈروم میں بھی ایک دم زور کا بھونپو بجنے لگا ہے۔

''جی ہاں۔'' مَیں نے جواب دیا۔ ''کیا سی آئی اے نے یہ فلیٹ BUG تو نہیں کر رکھے ہیں۔''

ایگنیس ہرگز نہ ہنسیں۔ سنجیدگی سے بولیں۔ ''مَیں ابھی کھانا پکا رہی تھی۔ زور سے بھونپو بجا۔ مَیں نیچے عمارت کے دفتر میں پوچھنے گئی کہ یہ کاہے کا الارم سسٹم ہے۔ انہوں نے بتایا SMOKE DETECTOR چولہے پر کوئی چیز ذرا سی بھی جلنے لگے۔ فوراً بجتا ہے۔ تب چولہے پر لگا اَن دیکھا پنکھا چلا دینا چاہیے۔ اور سُنو یہ ان دیکھا پنکھا تو غسل خانے کا دروازہ کھولتے ہی آپ سے آپ چلنے لگتا ہے۔ اور کچن کی چلمچی میں، سارا کچرا ڈال کر ایک بٹن دباؤ گھڑ گھڑ سارا کچرا غائب۔ کل صبح میری ناضرت مجھے یہ سب سمجھا گئی تھی۔ مگر یہ دھوئیں کا بھونپو

اسے یاد نہ رہا۔ اس قدر ٹیکنولوجی۔ حد ہے۔"

"صورِاسرافیل۔" مَیں نے کہا۔

"کیا ___؟"

"قربِ قیامت کے آثار ___ لیکن سوشلسٹ ملکوں میں تو قیامت آنے کی ہی نہیں ___" مَیں نے جواب دیا۔

"ہائی فوکس HI FOLKS" تیسری منزل پر لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے انڈوا یگریٹیریا کے ہنس مکھ ارشویندو نے میری بات کاٹی۔ تین دن میں وہ بے حد امریکن ہو چکا تھا۔

☆

میپل کا درخت

''مَیں سیڈرر یپڈ کے ایک جرمن نژاد کسان گھرانے میں پیدا ہُوا تھا۔'' پال اینگل نے کہا۔

'' کالولسنٹ کیا مطلب؟'' ارشویندو نے دریافت کیا۔

'' جان کالون سولہویں صدی فرانس کا ایک پروٹسٹنٹ ریفارمر تھا۔ اس نے محنت اور عمل پسندی پر زور دیا تھا۔ یہ ساری زراعتی بائبل بیلٹ ہم جیسے لوگوں سے آباد تھی۔ مذہب، قدامت پرست محنتی، بات کے کھرے اور اصول پسند اور جمہوری۔ میرے والد گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ گاڑی میں جُتنے والے گھوڑے، بار برداری اور شہسواری کے گھوڑے، میرا چچا ریس کے گھوڑے بیچتا تھا۔ مَیں گھوڑوں کی اس دنیا میں پروان چڑھا۔ جب آٹو موبیل کی دنیا ابھی نوزائیدہ تھی۔

لڑکپن میں صبح صبح مَیں اپنے باپ کے دو ویگن تنہا ہانک کر ٹیلی فون کمپنی لے جاتا۔ راستے میں ریل کی پٹریاں پڑتیں۔ ایک گاڑی بائیں ہاتھ سے ہانکتا اور دوسری دائیں سے۔ جب سامنے سے ٹرینیں گذرتیں مجھے بہت ڈر لگتا۔ کیوں کہ اگر اس وقت انجن سیٹی بجاتا تو دونوں گھوڑے بدک جاتے تھے۔ دوپہر کو مَیں اخبار بیچتا، کڑکڑاتے جاڑوں میں گھر گھر جاتا۔

سیڈرر یپڈز میں ایک پُرانی وضع کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ سیڈرر یپڈ زگزٹ بیچنے مَیں

وہاں بھی جاتا۔ اس ہوٹل میں چند لڑکیاں رہتی تھیں۔ اُن کا بظاہر کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا نہ کوئی مشغلہ یا ملازمت، کیوں کہ جب میں اخبار لے کر وہاں جاتا تو صبح کے ساڑھے دس بجے وہ اپنے اپنے کمروں میں محوِ خواب ہوتیں۔ میں سمجھتا کہ وہ بہت ہی اہم ہستیاں ہوں گی جو بجائے کام دھام کرنے کے دن چڑھے تک پڑی سویا کرتی ہیں۔

جب میں کالج پہنچا اور رہوڈز وظیفے پر اوکسفرڈ گیا وہاں کی زندگی ہمارے زراعتی جمہوری آیوا سے کس قدر مختلف تھی۔ پُرتکلّف اور طبقاتی درجہ بندیوں کی پابند ___ انگلش طبقاتی نظام مجھے بہت عجیب معلوم ہُوا۔ چند سال میں جرمنی میں رہا۔''

''کرشٹفر اشروڈ کی جرمنی ___ '' مَیں نے کہا۔

ہیمنگوے اگرٹرڈ اسٹین، ایذرا پاؤنڈ کا یوروپ، امریکن ادیبوں کا تیرتھ استھان پیرس تھا۔ جب کہ ایلیٹ اپنے آپ کو پکّا انگریز بنا چکے تھے۔ اس زمانے کے متعلق کتنا لکھا گیا ہے۔ فلم بنے ہیں۔ ایک پوری دیومالا تیار ہوچکی ہے۔

کھانے کے کمرے کی دیوار پر وہ پتوار آویزاں تھی جس کے ذریعے نوجوان پال اینگل اوکسفورڈ کیمبرج بوٹ ریس میں اپنی ناؤ کھیتے تھے۔

آج کی نسل کا مشہور شاعر ماروِن بل ۱۹۷۹ء کی اس شام ''اینگلز بالکنی'' کے جنگلے سے ٹِکا دوسرے مشہور شاعر اسنوڈگراس سے باتیں کررہا تھا۔ اس لمحے کہ گرٹرڈ اسٹین اور ایلیٹ اور پاؤنڈ ایک موضوع بن چکے تھے۔ پال اینگل کی نوعمری کے دنوں میں وہ بھی ماروِن بل اور اسنوڈگراس کی طرح اپنی دنیا میں مگن رہے ہوں گے۔ اب وہ جیتے جاگتے انسان نہیں تھے۔ نظریوں اور حوالوں اور مقالوں اور کتابوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔

پُرسکون اور خاموش آیوا سٹی کی اس سنہری شام سے فلاور کے عقب میں ایک ہری بھری پہاڑی پر استادہ پروفیسر پال اینگل کے دومنزلہ مکان کی چوڑی بالکنی میں چھتنار میپل کے نیچے دنیا کے بائیس ملکوں سے آئے ہوئے ادیب و شاعر اپنے اپنے وقت میں زندہ اسی طرح غائب ہوتے جائیں گے۔ میپل کا درخت اپنی پتیاں گرارہا ہے۔ وہ ساری بالکنی پر اُڑتی پھر رہی ہیں۔ لیکن کنیڈا کا قوف گیت ''میپل کا پتہ ہمیشہ ہمیشہ بھی صحیح ہے اور ایک ہزار سال قبل اندلس کی مسلمان شاعرہ ولادۃ بنت المستکفی کے سالوں میں اسی طرح ادیبوں کا جمگھٹ

ہوتا ہوگا اور اس کی بالکنی کے نیچے کوچہ گرد گویے نغمہ سرا۔ سامنے آیوا ندی پر سورج ڈوب رہا ہے۔

ہسپانیہ بُھلائے نہیں بُھولتا۔ اسپین کا بانکا نوکیلی مونچھوں والا سانچیز الیسپر یسو سامنے کی میز پر کولمبیا کی شاعرہ اولگا سے بزبان ہسپانوی مصروفِ گفتگو تھا۔ ڈرائینگ روم کے اندر اسٹیریو پر چینی موسیقی بج رہی تھی۔ نیچے باغ کی سڑک پر چینی سنگی لالٹین نصب تھیں۔ ڈرائینگ روم کی دیوار پر مختلف ملکوں کے ماسک مع کتھاکلی ماسک کے آتشدان کے اوپر مغل پچی کاری کی مرمریں تھالی۔

''یہ تھالی___ '' پال کی اسپینی بیوی ہوالنگ نے مجھ سے کہا___ '' مَیں نے آگرے میں دس ہزار روپے میں خریدی تھی جب مَیں پال کے ساتھ ہندوستان گئی تھی۔ وہاں کی غربت اور ساجی حالات دیکھ کر مجھے انقلاب سے پہلے کا چین یاد آیا۔ مَیں نے ماؤ کی نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ مگر میں لکھتی چینی میں ہوں۔ میرے ناول___ WOMEN OF CHINA کا یہاں سے انگریزی میں ترجمہ شائع ہوگا۔''

''میرے والد___ '' ہُوالنگ نے دفعتاً اُداس آواز میں کہا۔ ''لونگ مارچ کے دوران مارے گئے تھے۔ ۴۷ء میں مَیں تائیوان چلی آئی۔ ۶۳ء میں پال تائیوان گئے تھے۔ وہاں مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ۷۱ء میں ہم نے شادی کی۔''

''ہُوالنگ بے حد حسین لڑکی تھی۔'' پال بولے۔ ''اور جب مَیں اس سے ملا یہ بحیثیت ناولسٹ تائیوان میں مشہور ہو چکی تھی۔ پال ہُوالنگ پر عاشق تھے۔ ۳۷ء میں جرمنی سے واپس آ کر پال اس یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے لگے۔ پھر اپنے (CREATIVE WRITING) کے کورس کو انہوں نے ۴۱ء میں رائٹرز ورکشاپ میں تبدیل کیا جو ساری دُنیا میں مشہور ہوئی۔ شیورز، ٹینسی ولیمز، فلپ روتھ سب اسی ورکشاپ سے پڑھ کر نکلے۔ ۶۶ء میں پال ریٹائر ہوئے۔ وہ ورکشاپ اب بھی جاری ہے۔ جب مَیں امریکہ آئی پال ریٹائر ہونے والے تھے۔ مَیں نے اسی سال ان سے کہا کیوں نہ ہم لوگ ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال کیا کریں۔ جہاں سارے ملکوں کے ادیب یہاں چھ مہینے اکٹھے رہیں۔ اپنی کتابیں سکون سے لکھیں۔ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کریں تو کتنے تعصبات زائل

ہوں گے۔ پال نے کہا'' تم دیوانی ہوا تنے پروگرام کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا۔مَیں نے کہا کچھ کرلیں گے ___ تو ہم نے یونیورسٹی سے کہا یونیورسٹی نے کہا اچھا ایک سال ایسا اجتماع کر کے دیکھو۔تو ہم نے پہلے سال پندرہ رائٹرز بلائے۔آٹھ ماہ کے لئے۔اگلے دو سال تک آٹھ مہینے کا پروگرام رکھا۔ بہت زیادہ مہنگا پڑا۔اسے چار ماہ کا کر دیا۔تعداد بڑھتی رہی۔ اس سال ۳۷رائٹرز آئے ہیں۔''

''پیسہ کہاں سے آتا ہے؟'' ___ مَیں نے دریافت کیا۔

''یونیورسٹی صرف اسٹاف کی تنخواہیں دیتی ہے۔جنوری میں ہُوالنگ اور مَیں کشکول گدائی لے کر نکلتے ہیں۔ ہر سال کے پروگرام پر ڈھائی لاکھ ڈالر خرچ ہوتا ہے۔ پرائیویٹ مخیروں ،فاؤنڈیشنوں اور بڑے تجارتی اداروں سے اور انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن سے چندہ لیتے ہیں۔صبح سویرے پتہ ہے مَیں کیا کرتا ہوں،مَیں امریکہ کی تمام فاؤنڈیشنوں کے ہینڈ بکس پڑھتا ہوں اور ان کو خط لکھتا ہوں۔بعض دفعہ بہت مایوسی ہوتی ہے اور ذلّت بھی محسوس ہوتی ہے۔پچھلے سال میں نے اسّی کارپوریشنوں کو خط لکھے۔پینسٹھ نے انکار کر دیا۔ پندرہ نے جواب ہی نہیں دیا۔چند ایک نے چندہ دینے کا وعدہ کیا۔مگر بارہ سال سے ہم لوگ اسی طرح بھاگ دوڑ کر کے گاڑی چلا رہے ہیں۔ بارہ سال میں دنیا کے چار سو ادیبوں اور شاعروں کو یہاں مدعو کر چکے ہیں۔''

ارجنٹینا کا روڈلفو بانال آ کر بیٹھ گیا۔

''روڈلفو تم بالکل ہالی وڈ فلم کا ساؤتھ امریکن رومیو یا ویلن لگتے ہو۔'' مَیں نے کہا۔'' کسی طرح ادیب معلوم نہیں ہوتے۔یا کسی جنوبی امریکن ملک کے انقلابی ہیرو جو کسی منٹ جیب سے پستول نکال کر چلانا شروع کر دے گا۔''

''یہ بالکنی تو اچھی خاصی پیرس کے بائیں ساحل کا کوئی کیفے معلوم ہو رہی ہے۔'' نادیا نے اظہارِ خیال کیا۔

مَیں نے نظریں دوڑائیں۔دریائے سین کا بایاں ساحل اور ادب کا بے حد بایاں بازو ___ رقم رقم کے رائٹر اور اُن کی بیویاں اس وقت وہاں بیٹھے مصروف اکل وشرب تھے۔ ہنگری کے نوعمر میکلوس ہرزاتی ،ایگنیس ناگی اور اُن کے شوہر بالا ربینگل بلغاریہ کا نینو نکولوف،

پولینڈ کے آرٹرنڈزز کی ___ جولیا ہارٹ وِگ، جرزی پر زیدو یکی اور مائیکل رونی کو۔ یوگوسلاویہ کا میتو جونسکی۔ مشرقی جرمنی کا وولف گانگ کوبل ہاس۔

''یہ کمیونسٹ ملکوں کے رائٹرز یہاں کیسے آجاتے ہیں۔'' مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

پال اینگل نے قہقہہ لگایا۔ موصوف انتہائی خوش مزاج اور زندہ دل بزرگ تھے۔

''مَیں عالمگیر ادبی منظر سے واقف رہتا ہوں اور وہاں کی ادبی تنظیموں سے رابطہ ہے۔''

بانکے روڈلفو نے پھر پوچھا۔ ''مگر دوسری زبانوں کے رائٹرز کی اہمیت کے بارے میں کیسے معلوم ہوجاتا ہے۔''

''پال چھٹی حس کے مالک ہیں۔'' مَیں نے کہا۔''

پال نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ ایک انوکھا نٹ ورک سا بن گیا ہے۔ بہت سے نام تجویز کیے جاتے ہیں۔ بہت سوں کی چیزیں انگریزی میں بھی چھپ چکی ہیں۔ مثلاً السٹریٹیڈ ویکلی میں تمہاری کہانیاں اور مضامین بھی پڑھے تھے لیکن مجھے کوئی جُل نہیں دے سکتا۔''

مجھے یاد ہے ۷۰ء میں اس پروگرام کے متعلق آپ نے مجھے خط لکھا تھا۔ مَیں نے جواب دیا۔ ''بہت سے ادیب یہاں کافی شک و شبہ کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ کیوں کہ بہت سے ملکوں کا پریس سیاسی وجوہ کی بناء پر کافی اینٹی امریکن ہے چار ماہ اس پروگرام کے لئے یہاں رہ کر اصلیت ان پر خود بخود آشکار ہوجاتی ہے۔ اب یہ ایک ایسا کلب بن گیا ہے جہاں باقی دنیا کے رائٹر جنوبی افریقہ کے کالے ادیبوں سے مل پاتے ہیں۔ اسرائیلی اور عرب، کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ اکٹھے رہتے ہیں۔ جب آپ چار ماہ تک ایک عمارت میں رہئے گا، روز ملیں گے لامحالہ بہت سے تعصبات اور غلط فہمیاں دُور ہوں گی۔ اسی سال پہلی مرتبہ چینی ادیب پیکنگ سے آئے ہیں۔'' پال نے کہا۔

پروفیسر پال اینگل کو ۱۹۷۶ء کے نوبل پیس پرائز کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔

بہت سے لوگ اندر بار پر جمع تھے۔ ایک حسین مغربی خاتون سُرخ بال، سبز آنکھیں، کتھئی رنگ کا فراک، ہاتھ میں جامِ شراب لیے سگریٹ کے کش لگاتی پال کی میز پر آکر بیٹھ گئیں۔

''ہائی لیلیٰ۔'' پال نے خوش دلی سے نعرہ لگایا۔ اور مجھے مخاطب کیا۔ تم ترک ناولسٹ لیلیٰ اربل سے ملیں؟ یہ آج صبح استانبول سے پہنچی ہیں۔ یہ ترکی کی چھ بہترین ناول نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور لیلیٰ تم بھی نوموزلم ہونا؟''۔

''محض نام کی مسلمان ہوں۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ لیلیٰ نے ذرا رُکھائی سے جواب دیا۔ کمال اتاترک کی تخلیق شدہ ترکی کی خاتون۔ اس کے بعد لیلیٰ خاموش رہیں۔ اُن کے چہرے پر ایک خفیف سی اُداسی کی کیفیت طاری تھی۔ ہنگری کی اِیگنیس کی سوچتی ہوئی اور اسی کی طرح۔ ڈنر کے دوران یونان کے ارگریس ہیونس عرف آری۔ بلغاریہ کے نینوا اور یوگوسلاویہ کے میتو نے (جو تینوں بے حد ظریف الطبع تھے، لیلیٰ کے سکوت کو توڑنا چاہا۔ طرح طرح سے اُن کو ہنسانے کی کوشش کرتے رہے۔ یونان کے آری نے کہا۔ ''لیلیٰ۔ لیلیٰ تم ہماری سابق آقا ہو لیکن ہم تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں ہم تمہارے سابق غلام ہیں۔'' کچھ دیر بعد وہ چاروں اکٹھے نظر آئے تو پولینڈ کے مائیکل رونی کیڑ نے آواز دی۔ ''لو صاحب بلقان کانفرنس شروع ہو چکی ہے۔'' مائیکل پولینڈ میں فلموں کے لئے بھی لکھتا تھا اور واژدا کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ بے حد طویل القامت تھا۔ اس وجہ سے اسے اب محض پول کہا جا رہا تھا۔

اسرائیل کا جل ککڑا سا ادیب اسحٰق اُور پاژ جو خود کو لفٹ ونگ کہتا۔ آتشدان کے قریب آ کر بیٹھا۔ نادیا قریب سے گذری۔ مائیکل نے اسے پکارا۔ وہ آ کر اس گروہ میں شامل ہوئی۔ مائیکل نے اس کا تعارف کرایا۔

''اسحٰق اور پاژ۔''

''نادیا بشائی۔''

دونوں سرد مہری سے مسکرائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں جاری تھیں۔ کچھ دیر بعد اسحٰق نے نادیا کو مخاطب کیا۔ ''حال ہی میں مَیں نے اسکندریہ کے متعلق ایک عرب افسانے کا ترجمہ پڑھا تو مجھے معلوم ہُوا کہ وہاں کی زندگی بھی اتنی شائستہ ہے؟۔''

''آپ کا خیال کیا تھا ہم لوگ وحشی ہیں؟۔'' نادیا نے تلخی سے پوچھا۔ ''آپ میری دوست ڈاکٹر حسایا کاف مَین سے واقف تھے۔؟ چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔ شاید وہ یروشلم میں رہتی تھیں۔'' میں نے اخلاقیات کی ___ '' جانتا تھا۔ جو مر گیا سو مر گیا۔ اب اس کا

ذکر بیکار ہے۔" اسحٰق نے جواب دیا۔ سُنا تھا کہ اسرائیلی بہت کٹر ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو کمال تھا محی الدین ابن عربی۔

کچھ دیر بعد اچانک اسحٰق نے یہودی فلسفی ربّی موسیٰ ابن میمون کے متعلق مجھ سے نہایت عالمانہ گفتگو شروع کر دی۔ خود ہی بتایا کہ وہ یوکرین سے بارہ سال کی عمر میں فلسطین آ گیا تھا ___ عبرانی افسانہ نگار اور تل ابیب کے ایک اخبار کا نیوز اڈیٹر تھا۔

کھانا شروع ہُوا، ڈنر ٹیبل کے سرے پر برازیل کا نوجوان شاعر جولیس سیزر مارٹن دہاڑ رہا تھا۔ " ہم بھی امریکن ہیں مگر امریکن محض یو ایس اے کے باشندوں کو کہا جاتا ہے۔ ہم ساؤتھ امریکن "تیسری دنیا" والے ہیں۔ غریب، جذباتی، پسماندہ۔"

" اصل، خالص نمائندہ امریکن تو یہاں بھی WASPS ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ وائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ۔" مَیں نے کہا ___ " یہ میرا ہاتھ دیکھو۔" جولیس سیزر نے مُکّا ہَوا میں لہرایا۔ اس کے نام کا پرتگالی تلفظ "ہولیو" تھا ___ تو ہولیو نے گرج کر جواب دیا۔ " میں جیلوں میں رہا ہوں اور مجھے تھرڈ ڈگری کیا گیا ہے۔ اس وقت مَیں اس شاندار مکان کی اس پُر تکلف دعوت میں شامل ہوں عیش کر رہا ہوں۔ مگر مَیں اپنی قید خانے کی کوٹھڑی نہیں بھولا۔ وطن واپس جا کر شاید پھر جیل کی ہوا کھاؤں۔" ہولیو کے بازوؤں پر زخموں کے گہرے نشان نمایاں تھے۔

" اس پروگرام میں" بار کے پاس کھڑے پال اینگل شکاگو کے ایک مشہور رسالے PEAPLE کے نمائندے سے کہہ رہے تھے۔ " بہت سے ادیب ایسے آتے ہیں جنھوں نے اپنے ملکوں میں بہت مصائب جھیلے ہیں۔ سنسر شپ، جیل، مسلسل جدوجہد اور احتجاج ___ رائٹر خدا کا مخصوص بندہ ہوتا ہے اس لئے تکالیف اُٹھاتا ہے۔"

پال اینگل کی دعوت پر پچھلے سال ۷۸ء کے پروگرام میں ایک ہفتے کے لئے فیض احمد فیض نے بھی شرکت کی تھی جو اس زمانے میں کینیڈا آئے تھے۔ میرے دل میرے مسافر۔ ہُوا پھر سے حکم صادر۔

کھانے کے بعد ڈسکو رقص شروع ہُوا۔ نادیا آتش دان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے ذرا بیزاری سے کہا۔ " سب لوگ لامحالہ سیاسی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ مجھے سیاست سے

نفرت ہے۔''

''ہر شخص کے اپنے اپنے تجربات اور رویئے ہوتے ہیں۔تم کو دلچسپی نہیں نہ سہی۔تم اپنی خالص شاعری کرتی رہو۔ حالانکہ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم مصر اور اسرائیل کی جنگوں کے زمانے میں بے ساختہ نظمیں لکھ چکی ہو۔'' مَیں نے جواب دیا۔

نادیا نے آتشدان پر رکھے آگرے کے مرمریں فن پارے پر نظر ڈالی۔'' یہ بھی سیاست کی دین تھا؟ ___ ''اس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''ایک حد تک یقیناً مَیں نے جواب دیا۔'' اگر مغل ہندوستان نہ آئے ہوتے تو یہ فن پارہ آج یہاں موجود نہ ہوتا۔''

فلسطین کا سنہرے گھنگھریالے بالوں والا نوعمر شاعر جمیل حسین نزدیک کھڑا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ اس کے پاس جورڈن کا پاسپورٹ تھا اور اس کے ملک کا نام دُنیا کے نقشے سے غائب ہو چکا تھا۔ اور وہ عصری تاریخ کی تلخ ترین حقیقت تھا۔ اس سے کون کہہ سکتا ہے کہ میاں خالص شاعری کرو۔ یا آئرلش کیون اور ایوان بولینڈ سے جن کے ورثے میں ''ایسٹر ۱۹۱۶ء'' شامل ہے یا امریکہ اور افریقہ کے کالے ادیبوں سے۔

آنسہ نادیا بثائی کہ ایک خوش مزاج اور دلچسپ خاتون تھی سیاسی رویئے بھی رکھتی تھی ___ بوجہ قبطی قوم پرستی مصر کی ہر اچھی چیز کا سلسلہ نسب فراعنہ سے جوڑتی تھی۔ (جس طرح ہمارے یہاں عہد مہا بھارت یا اسلامی دور سے جوڑا جاتا ہے۔ یہ بھی تیسری دُنیا کی مخصوص نفسیات ہے۔)

ایک روز مَیں نے سموسے تلے۔ نادیا کہنے لگی ___ ''مصر میں بھی انہیں سموسہ ہی کہا جاتا ہے۔''

''عرب اسے ہندوستان لائے ہوں گے۔ ہمارے بیشتر مسلم کھانے سنٹرل ایشیا مڈل ایسٹ ہی سے آکر رائج ہوئے۔'' مَیں نے جواب دیا۔

نادیا سموسہ نوش جاں کرتے ہوئے چند منٹ تک میری بات پر غور کرتی رہیں۔ پھر بولیں ___ ''نہیں۔ یہ عرب پکوان نہیں ہے۔ میرا آبائی گاؤں شمالی مصر میں ہے۔ وہاں سموسہ اسی صورت میں بنایا جاتا ہے۔ میرا گاؤں ایک قدیم قبطی بستی ہے۔ سموسہ یقیناً

دور فراعنہ کی یادگار ہے۔ عرب پکوان نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔'' اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون پہلے سے سموسہ کھاتے چلے آئے تھے یا اسے عربوں نے ایجاد کیا۔ پھر میں نے تصور کیا فرعون مصر آمون رع سونے کے تخت پر بیٹھا ایک عدد سموسہ کھا رہا ہے۔ یا ملکہ نفرتی تی بیٹھی کڑاہی میں چھن چھن سموسے تل رہی ہے۔

''ہم قبطی فراعنہ کی اولاد ہیں۔'' نادیا بولی۔'' آج بھی نفرتی تی ایک عام قبطی نام ہے۔''

لیکن عرب لیگ کے سفیر نے چند سال قبل فخریہ مجھ سے کہا تھا کہ تمام اہلِ مصر آلِ فراعنہ ہیں۔''

نادیا روز شام کو پیانو کی مشق کے لئے یونیورسٹی کے میوزک اسکول جانے لگی۔ ایک شام اس نے واپس آکر کہا مدرسہ موسیقی میں محض طلباء کے لئے درجنوں اعلیٰ ترین پیانو رکھے ہیں۔ دسمبر میں قرونِ وسطیٰ کی کلیسائی موسیقی کا ایک کونسرٹ ہونے والا ہے۔ مجھے اس میں گانے کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے۔ صبح سویرے لیلیٰ اور نادیا سامنے پارک میں چہل قدمی کرتیں جہاں JUGGING کرنے والے گزرتے رہتے۔ سارا امریکہ JUGGING میں بے طرح مصروف تھا۔ نادیا نظمیں لکھ رہی تھیں لیلیٰ نے نیا ناول شروع کر دیا تھا۔ لوگ باگ جب ایک دوسرے سے ملتے تو پوچھتے تم نے کام شروع کر دیا ہے؟ ارجن ٹینا کا روڈلفو مجھ سے پوچھتا ARE YOU WORKING مغربی ادیبوں کے لئے لکھنا ایک سنجیدہ پروفیشنل کام ہے۔

ہفتے میں ہر دوسرے تیسرے دن ایک ادیب یا شاعر کا سیمینار یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی و فلسفہ کی آراستہ و پیراستہ فیکلٹی لاؤنج میں منعقد ہوتا۔ قہوہ کوک یا بیئر پیتے ہوئے سیمینار کے بعد سوالات اور بحث و مباحثے ہوتے۔ چوتھی منزل پر اس پروگرام کے دفاتر تھے جن میں اسٹاف کے لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ پروگرام کے دبیز زرد قالین اور چمڑے کے صوفوں والے لاؤنج کی دیواروں پر ان اداکاروں، ڈراموں، موسیقی کے پروگراموں، فلموں کے پوسٹر لگے ہوتے جو کیمپس پر روزانہ پیش کیے جاتے تھے۔ ایک

دیوار پر پچھلے سال کے پروگرام کے شرکاء کی تصاویر لگی تھیں۔ایک تصویر میں فیض صاحب ایک بلغاری ادیبہ کے ساتھ بیٹھے مشغل مے میں مصروف تھے۔میزوں پر اور الماریوں میں ادبی رسالوں اور کتابوں کے انبار۔

''ہمارے ادیبوں کو سوچنا چاہئے کہ جو کچھ وہ بے حد جدید تصوّر کر کے لکھ رہے ہیں، وہ یہاں کس قدر فرسودہ ہو چکا ہے۔'' ایک روز انڈونیزیا کے فرانتر نے برق سماوار سے قہوہ نکالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ امریکہ میں ذہنی فیشن تیزی سے بدلتے ہیں اور یہ سب پیٹ بھرنے کی باتیں ہیں۔''

دس پندرہ سال قبل ہندوستان کا زبردست FAD چلا تھا۔ روی شنکر۔ستار۔ اگر بتیاں کنڈالنی۔شکتی، ہندو فلسفے، رقص یونیورسٹیوں میں اور انٹلکچوئیل حلقوں میں بے حد ستار بجا____ یہ اشتیاق بیٹلز نے مہارشی مہیش یوگی کے چیلے بن کر مغرب میں عام کیا تھا۔اور کیلی فورنیا کے فلاور چلڈرن نے اسے مزید تقویت پہنچائی تھی۔ اس وقت تک سوامی اور گرداور مہیش یوگی کاٹی ایم اور ہرے کرشنا'' امریکن نظارے کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور اس میں کوئی نو ولٹی نہیں رہی۔

آج کل سُرخ چین کا زور ہے۔اس نئی دلچسپی میں عالمی سیاست کا بہت بڑا دخل ہے۔'' چینی ہفتہ'' بڑے زور وشور سے منایا گیا۔کچھ عرصہ قبل پال اینگل مع ہوالنگ سُرخ چین گئے تھے اور اُن کے اس سفر کے متعلق نیوز ویک نے ایک پورے صفحے کا مضمون شائع کیا تھا۔اس پروگرام میں دو بہت اہم چینی پیکنگ سے آئے تھے۔ایک بہت بڑی چینی ادبی کانفرنس یونیورسٹی میوزیم کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جس میں سارے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے چینی پروفیسر بھی شامل تھے۔

چینی ادیب تائیوان، سنگاپور وغیرہ سے آئے تھے۔الغرض چینی ہی چینی۔ پال اینگل نے جن بتیس چینیوں کے لئے کہا'' دنیا میں چینی آبادی کے تناسب سے یہ بتیس نمائندے تو گویا فقط ایک عدد نمائندہ ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ بے حد چینی اوپیرا، چینی بازی گری وغیرہ وغیرہ اسٹیج پر دکھائی گئی____

ایک روز ہم لوگ دریائے مسی سپی کے کنارے آباد کواڈ سیٹیز گئے تھے۔یعنی ایک

بہت بڑی بستی جو چار شہروں کا مجموعہ ہے۔ دریا پر پچھلی صدی کے نمونے کی پہیئے سے چلنے والی دخانی کشتی جس طرح کی کشتیوں میں مارک ٹوین مسی سپی دریا پر سفر کیا کرتے تھے۔ غسل خانوں کے پردوں پر پچھلی صدی کے اخبارات چھپے ہوئے تھے۔ اسی قسم کے جہازوں پر سفر کرنے والے امریکن مشنری انجیلیں سنبھال کر جاپان اور چین جایا کرتے تھے۔

گراں خواب چینی نے سنبھل کر یکا یک ایک جھانپڑ۔

ہمالہ کے چشمے اُبلنے تو لگے مگر آج تک کچھ بات نہ بنی۔

جہاز کے بالائی عرشے پر ٹہلتے ہوئے مَیں نے پیکنگ کے پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے ڈائریکٹر سے پوچھا__ ''آپ نے ہمالیہ پر حملہ کیوں کیا تھا؟۔

اس نے مسکرا کر آنکھیں چُندھیائیں اور جواب دیا۔ ''لندن میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند میرے دوست تھے اور احمد علی۔''

''اسے کنفوشس کا فلسفہ کہتے ہیں یا تاؤ۔'' مَیں نے پوچھا۔ ''آپ لوگ تو ہمارے بڑے قدیم پکے دوست تھے۔ پھر۔؟''

سب سویٹ یونین کی ریشہ دوانیاں ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لیکن آپ دونوں ملک تو کمیونسٹ ہیں۔'' اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔ مَیں نے فلسطین کے جمیل حسین کو دیکھ کر دل میں اضافہ کیا۔ جمیل حسین ہنگری میں چھ سال پڑھ کر آیا تھا اور ہنگرین شاعرہ ایگنیس سے بزبان ہنگرین گفتگو کرتا ہوا بونے اُڑانے میں مصروف تھا۔ چینی ادیب نے جواب دیا۔ ''تم کو مغربی کلاسیکل موسیقی سے دلچسپی ہے؟__''

''آپ کو پال روبسن کا اوّل مین رور پسند ہے؟۔'' مَیں نے جواب دیا۔

دریائے مسی سپی کے دونوں کناروں پر کواڈسٹی کی سر بفلک عمارتیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

روسی ''والگا بوٹ مین کا گیت اور امریکن ''اوّل مین رور''__ عظیم دریاؤں کی اپنی خفیہ زبان ہے۔ چینی ادیب مغربی کلاسیکل موسیقی کا رسیا تھا۔ موسیقی کی بھی سرحدیں نہیں ہیں۔

لیکن سرحدیں ہیں۔ زیوبن مہتہ عربوں کے لئے اپنا آرکسٹرا شاید کنڈکٹ نہیں کرے گا۔

خوش مزاج یونانی شاعر آری بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چپکے سے بولا'' تم کو ایک مزیدار بات بتاؤں۔ کسی سے نہ کہنا۔ اولگا مائیکل سے شکایت کررہی تھی کہ کل الفریڈو اسے گھر پہ چھوڑ کر صبح سے شہر چلا گیا اور شام پڑے واپس آیا۔ مائیکل نے جواب دیا۔'' مادام اگر مَیں الفریڈو کی جگہ ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔'' یہ خبر دے کر آری عطارد کی سی بَرق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ متبسّم میری پاس سے گذری اور کہا'' آری نے تم کو وہ لطیفہ سنایا؟ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی سے نہ کہنا۔ اب تک تین چار لوگ آ آ کر مجھے یہ لطیفہ سُنا چکے ہیں۔'' ایلز بتھ ٹیلر کی ہمشکل کولمبیا کی شاعرہ اولگا اپنے نیازمند شوہر الفریڈو کے ساتھ عرشے کی ریلنگ کے سہارے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ فوٹوگرافر اس کی تصویریں کھینچ رہے تھے ___ اولگا اور الفریڈو نئے دولہا دلہن تھے دونوں کی دوسری شادی تھی اولگا کی پہلے شوہر سے لڑکی بائیس سال کی تھی۔ اولگا بیلر نیارہ چکی تھی۔ ہر وقت لائم لائٹ میں رہنا چاہتی تھی۔ سب لوگ اس کی ان بےضرر حماقتوں کے عادی ہو چکے تھے نیک دل تھی اور اس کی وجہ سے بہت رونق رہتی تھی۔ روز اس کا کوئی نہ کوئی لطیفہ سب تک پہنچ جاتا تھا۔

نیچے بال روم میں رقص شروع ہونے والا تھا۔ پال اینگل حسبِ معمول ایم سی بنے اودھم مچا رہے تھے۔

''اس بزرگ شاعر میں کس قدر زندہ دلی اور انرجی ہے۔ اس عمر میں سینکڑوں میل کار چلاتا ہے۔ سوئمنگ کرتا ہے۔ دوڑتا ہے۔ ہمارے ہاں اس عمر کے لوگ بوڑھے پھونس ناتواں نڈھال تلخ مزاج کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگتے ہیں۔ انڈونیزین ارشویندو نے کہا۔ مَیں نے اس عمر کے خستہ حال اُردو شاعروں کا تصور کیا۔ جن کے مرنے کے بعد اُن کے بیوی بچوں کے لئے چندہ کی اپیل کی جاتی ہے۔ تفو برتو اے چرخ گرداں تفو۔

اولگا بال روم میں پہنچ چکی تھی۔ اور ارجن ٹائین کے روڈلفو کے ساتھ ایک ہسپانوی گیت سنانے میں مصروف تھی۔

ارشویندو اور اس کا ہمزاد فرانز ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ارشویندو نے اپنی سیاہ قراقلی پر ہاتھ پھیرا۔ اِس وقت وہ دُنیا سے بےحد مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ ''مَیں یہ ٹوپی اس لئے پہنتا ہوں کہ فرانز سے مختلف نظر آؤں۔ یہاں سب مجھ میں اور فرانز میں گڑبڑا جاتے ہیں۔''

اس نے مجھے سمجھایا۔ بالی کا فرانز ماہرِ فن آرٹسٹ بھی تھا۔ میز پر رکھے کاغذی نیپکن پر اس نے اولگا کا اسکیچ بنا کر عربی رسم الخط میں اپنا نام لکھا۔ مَیں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ حسبِ عادت باچھیں کھلائے بولا۔ ''مَیں اکثر فلپائن جاتا رہتا ہوں۔ وہاں مسلمانوں کے خلاف کافی تعصب ہے۔ ان کے موریسکو پرابلم کی وجہ سے۔ اس لئے مَیں نے اپنا نام فرانز FRANZ رکھ لیا۔''

غور کیجئے۔ ہسپانوی نوآبادکاروں نے جزائر شرق الہند پہنچ کر وہاں کے مفتوح مسلمانوں کو بھی مُور کہا۔ ہسپانیہ کے مسلمان مُور کہلاتے تھے کہ اوّلاً مراقش سے وہاں پہنچے تھے۔

فلور پر ایک خوش شکل لوچ دار چینی نے تنہا ڈسکو رقص شروع کیا اور بھرت ناٹیم کے چند چنیتر ے دکھائے۔ وہ ماہر ڈسکو رقاص تھا۔

رات گئے جہاز ڈیون پورٹ کی دریائی بندرگاہ پر واپس پہنچا۔ ہم لوگ اس وقت ریاست اِلی نوائے میں تھے۔ کوچیں آیوواسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایک کوچ میں اگلی سیٹ پر شرق اوسط کی لیلیٰ اربل اور نادیا بشائی نے انگریزی گیت شروع کر دیئے۔ نزدیک بیٹھے ہولینڈ کا مائیکل فوراً ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر بے ساختگی کے ساتھ گویا ان دونوں کو کنڈکٹ کرنے لگا۔ یوروپ اور بحیرۂ روم کی کلچر! کوچ کا موٹا سفید فام امریکن ڈرائیور توصیفاً سر ہلایا کیا۔ وہ آٹھ ڈالر فی گھنٹہ کماتا ہے۔ ڈپو واپس جا کر اپنی کار میں بیٹھے گا اور اسٹیریو پر اپنی پسندیدہ موسیقی سُنے گا۔ مائیکل بھی ہولینڈ اپنے ایک معقول منصفانہ اشتراکی ماحول میں واپس لوٹے گا۔ جہاں کوئی بُھوکا نہیں مرتا۔ لیکن لیلیٰ اور نادیا اپنے کس قسم کے معاشروں میں واپس جائیں گے؟ ـــــ غربت، تشدّد، سیاسی بدامنی، بے اطمینانی۔ ترکی میں بڑھتے ہوئے سیاسی قتل و غارت کے متعلق لیلیٰ اکثر اداس ہوتی ہے۔

لیلیٰ اور نادیا جو اس وقت انگریزی اور امریکن اور فرنچ گیت گارہی ہیں۔ ان کی مغرب سے یہ تہذیبی یگانگت سطحی اور مصنوعی ہے۔ کیوں کہ معاشی برابری کے بجائے شدید معاشی تضاد پر مبنی ہے۔

کہرے میں چھپے جزیرے

یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف آرٹ کے ریٹائرڈ صدر اور آرٹ کے مورّخ پروفیسر سی برلنگ شہر سے دُور ایک جنگل میں ندی کنارے اپنے دومنزلہ پلیٹ گلاس مکان میں رہتے تھے۔ فرنچ کٹ داڑھی، پستہ قد، منکسر المزاج، ندی کے رُخ ان کا وسیع میوزک روم مجسّموں اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی اور یجنل تصاویر سے آراستہ تھا۔ اوپر سامعین کے لئے چوطرفہ گیلری۔ پیانو کے نزدیک مختصر اندرونی باغیچہ۔

اس شام چینیوں نے اُن کے مکان کے سبزے پر اپنے اپنے کمالات دکھائے ایک چینی نے بانسری بجائی۔ ہوالنگ اینگل کی رقاصہ لڑکی نے (جوان کے سابق چینی شوہر کی اولاد اور ایک انگریز کی بیوی تھی) ''تیتلی کا رقص'' پیش کیا۔ ایک چینی لڑکی نے چینی گانا سنایا۔ امریکن اسی اخلاق اور صبر سے سنا کئے۔ جس طرح وہ غیر مغربی موسیقی سنتے ہیں جو اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ چینی جاپانی موسیقی مجھے بھی بے سُری معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ گو سنگیت یونیورسل ہے مگر ہر قوم کی لے اور چند اندرونی سُر جُدا گانہ بھی ہو سکتے ہیں۔

رات کو یونیورسٹی کوارٹریٹ نے پروفیسر سی برلنگ کے میوزک روم میں اپنا اپنا پروگرام پیش کیا۔ امریکن سامعین دفعتاً اپنی مانوس دُنیا میں لوٹ آئے۔ چینی بانسری کے سُر دخل در معقولات تھے۔

عصرانے کے دوران مشہور اخبار ڈی موائین رجسٹر کے ایک سینئر صحافی سے بسلسلۂ ہندوستانی سیاست میری جھڑپ ہو چکی تھی۔ اب مع تمام سامعین بڑے انہماک سے چیمبر

میوزک میں محو تھا۔ اس وقت اچانک میری نظر اس مجسمے پر پڑی۔

کوارٹریٹ کے نزدیک ایک گملے کے نیچے رکھا وہ چھوٹا سا مجسمہ ایک فاقہ زدہ ایشیائی لڑکے کا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی بے چارگی اور احساس محرومی کا حقیقت آمیز تأثر حیرت انگیز تھا۔ وہ ننھا لڑکا احساسِ فراغت اور عشرت اور تہذیبی اور روحانی طمانیت کے اس ماحول میں ایک کونے میں چھپا یہ سب دیکھ دیکھ کر گویا پتھرا چکا تھا۔ کسی نے بھی اس مورتی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ چلتے وقت مَیں نے پروفیسر برلنگ سے پوچھا۔

''یہ مجسمہ میرے ایک شاگرد نے جنوبی ایشیا میں بنایا تھا۔ یاد نہیں آرہا کون سے ملک میں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلحاظِ فقروفاقہ جنوبی ایشیا کے سارے ملک یکساں ہیں۔ پروگرام کی کاریں اور منی بسیں اسٹاف کے لڑکے ایڈون اور بوب اور لڑکیاں چلاتی تھیں۔ یہ گاڑیاں پروفیسر کے مکان سے کچھ دور جنگل کے راستے پر کھڑی تھیں۔ لوگ باگ حسبِ معمول ٹکڑیوں میں بٹ کر اطمینان سے ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ مَیں بوب کی اسٹیشن ویگن ڈھونڈتی اکیلی ذرا آگے نکل گئی۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا اور اونچی اونچی گھاس میں جھینگر بول رہے تھے۔ ایک جگہ بوب کی چھوٹی کوچ نظر آئی۔ اس کا انجن حسبِ معمول چل رہا تھا۔ دروازے پر ایک اجنبی متبسّم چہرہ۔

''ہیلو''__ مَیں نے کہا__ ''یہ انجن کیوں چل رہا ہے؟ متواتر نہ جانے کب سے حد ہے__ امریکن انرجی بچارہے ہیں۔''

اجنبی نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ہو__'' مَیں فلپائن سے آرہا ہوں ابھی ابھی۔ ایڈون مجھے سیڈرریپڈز ایرپورٹ سے سیدھا یہاں لے آیا۔ صرف چند منٹ پہلے۔ اس وجہ سے مَیں پارٹی میں شامل نہ ہوسکا۔ میرا نام ہوزے لکاباہے۔''

''ہلو__ ہوزے۔'' مَیں نے کہا۔ ''تم اتنی دیر میں یہاں کیوں پہنچے۔ پروگرام شروع ہوئے تو تین ہفتے ہوگئے۔''

''مَیں جیل میں تھا۔ جب دعوت نامہ پہنچا۔ پیرول پر چھٹا تو فوراً یہاں کا ٹکٹ کٹایا۔'' اس ضمانت پر کہ یہاں سے سیدھا وطن واپس جاؤں گا۔''

''جیل میں کیوں تھے؟۔''

''عموماً ادیبوں کو جیل کیوں بھیجا جاتا ہے؟ سیاسی احتجاج۔''

''فلپائن کی سیاست کا اب بھی وہی حال ہے جو میں نے وہاں دیکھا تھا؟۔'' مَیں نے سوال کیا۔

پروفیسر جارج سی برلنگ کا پلیٹ گلاس دومنزلہ۔ یونیورسٹی کا اسٹرنگ کوارٹیٹ بڑھیا ڈنر اس میں مصیبت زدہ تیسری دُنیا کے سفیرانِ حرم آتے ہیں۔

''دیکھو سب کاروں کے انجن چل رہے ہیں۔'' ہوزے نے اظہارِ خیال کیا۔

''یہ تھرو اوے سوسائٹی ہے بے تحاشا کھانا جو بچ رہتا ہے، کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔ سال کے سال فرنیچر بدلتے ہیں۔ ذرا جی بھرا تو کاریں جا کر'' کاروں کے قبرستان میں ڈال آتے ہیں۔ ایسی فضول خرچیوں کی عادت کے بعد اب کار ٹران سے کہیں کہ پٹرول بچاؤ تو اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اللّے تللّے کی عادت مشکل سے چھٹتی ہے۔ ان کے مکانوں میں ہر کمرہ روشن رہتا ہے۔ کمرے کی بتی بجھانا جانتے ہی نہیں۔ تم نِک ہوکن کو جانتے ہو میں ان سے ٹوکیو اور اس کے بعد منیلا میں ملی تھی۔''

''نِک ہوکن؟___ وہ اب ہمارے ملک کا نیشنل آرٹسٹ ہے۔ اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو چکا ہے___''

وہی پُرانی کہانی

جب مَیں نِک ہوکن سے مِلی تھی۔ وہ اسی ہوزے کا ہم عمر رہا ہوگا۔ ہوزے آج کے اسٹیبلشمنٹ کا باغی تھا اور قید خانے سے پیرول پر امریکہ آیا تھا۔

ریاست کے صدر مقام ڈی موائن (یہ بھی ایک فرنچ نام ہے اور اس ریاست پر سابقہ فرنچ تسلّط کی یادگار) مَیں امریکن انشورنس کمپنی کی موڈرن آرٹ کے بیش بہا نمونوں سے آراستہ فیوچرسٹک عمارت کی ایک منزل کے پلیٹ گلاس برآمدے میں سے ایک نظارہ۔

نیچے چوک میں مشنریوں کے گروہ جمع تھے۔ کچھ لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ سامنے دو بہت اونچی عمارتوں کے درمیان استادہ ایک نسبتاً پرانی اتنی ہی اونچی عمارت کو بارود سے منہدم کیا جانے والا تھا۔

خالی سڑک پر چند آدمی ایک مشین لے کر آئے۔ ایک بٹن دبایا۔ دھماکہ۔ ٹھیک آٹھ سیکنڈ کے اندر وہ پوری عمارت منہدم ہوگئی۔ اور اس طرح کہ اس سے بالکل سٹی ہوئی عمارتوں کے کھڑکیوں اور شیشوں پر بال بھی نہ پڑا۔ دھوئیں کے سیاہ بادل چاروں طرف پھیل گئے۔ چند منٹ میں دھواں تحلیل ہُوا۔ روشن دھوپ میں اس عمارت کی جگہ ملبے کا ڈھیر پڑا تھا۔ محض آٹھ سیکنڈ۔

اس ساؤنڈ پروف بلوری برآمدے میں سے وہ بے آواز منظر سائنس فکشن کا ایک حِصّہ معلوم ہُوا۔ ایک پوری عمارت پلک جھپکتے میں غائب۔

''پش بٹن تہذیب۔ برائے تعمیر و تخریب۔''

نزدیک کھڑے یونان کے آرکی نے حسبِ عادت چپکے سے اظہارِ خیال کیا۔

شام کے وقت ڈی موائن کے ایک ہرے بھرے پُرفضا محلّے میں رسالہ ''ہوم اینڈ گارڈنز'' کے ناشر کی بیوہ کا مکان۔ اونچی چھت والا، ایوان نشست پکاسو اور پال کلی اور دوسرے جدید اُستادوں کی اوریجنل تصاویر اور برنجی مجسّموں اور آڑے ترچھے اُلجھے ہوئے تار کے گچھوں وغیرہ سے (جو موڈرن اسکلپچر کہلاتے ہیں اور بیوقوف لوگ اُن پر کتابیں لکھتے ہیں۔ اور اُن کو لاکھوں روپے میں خریدتے ہیں۔) سجا ہُوا تھا۔ پچھلے چبوترے پر موڈرن اسکلپچر کا ایک برنجی قد آور مجسمہ استادہ تھا۔ مَیں نے اس بُت کو بہت غور سے دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ چبوترے کے سامنے خاتونِ خانہ کا جنگل مع سوئمنگ پول نظر آرہا تھا۔ خزاں کے سُرخ پتّے گھاس پر اُڑتے پھر رہے تھے۔ پیٹر ناضرۃ چبوترے پر بیٹھا چپ چاپ منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔ برنجی مجسّمے کے سر کے پیچھے اچانک مجھے ایک گول پلیٹ نظر آئی۔ یہ ہالہ ہے۔ مَیں نے سوچا اور پیٹر سے کہا۔ ''پیٹر یہ جینزس کرائسٹ ہے۔''

''نہیں میرے خیال میں یہ کاؤبوائے ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ قطعی جینزس کرائسٹ ہے۔ سر کے گرد ہالہ ہے۔ وہ پلیٹ ملاحظہ کرو۔ علاوہ ازیں کاؤبوائے ایسا چوغہ کہاں پہنتے ہیں؟''

عین ممکن ہے کہ رات کے وقت وہ بطور لباس شب خوابی ایسا چوغہ پہنتے ہوں۔ پچھلی صدی میں۔'' پیٹر نے جواب دیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

''لیکن تم نے یہ غور کیا کہ اس خاتون نے یہ کاؤبوائے یا جینرس کرائسٹ کتنا مہنگا خریدا ہوگا۔'' ہنگری سے آئے نوجوان یہودی ادیب مائیکلوس ہزارتی نے قریب آکر زمین پر اُکڑوں بیٹھتے ہوئے شگفتگی سے مجھے مخاطب کیا۔ چبوترے پر صرف پیٹر، مائیکلوس اور مَیں اس مجسمے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے۔ باقی سب لوگ اندر تھے۔

''یہ سب اس خاتون کے ایجنٹ کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ آرٹ کے ذخیرے ہیروں کا اسٹیٹس سمبل ہیں۔ اس سے انہیں غرض نہیں کہ وہ کیسے ہیں۔'' مائیکلوس نے اضافہ کیا۔

ہم لوگ دیوان خانے میں واپس آئے۔ اب ہنگرین شاعرہ ایگنس چپکے سے بولیں: تم نے میزبان خاتون کا بیڈروم دیکھا؟ اس قدر غیر شخصی۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔''

مَیں فوراً گئی۔ سفید قالین۔ سفید مِنک کے پلنگ پوش۔ غسل خانے میں سفید منک کا غالیچہ۔ پورا سویٹ برف کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ اس کے برابر ایک مورننگ رُوم میں مزید ماڈرن ماسٹرز دیواروں پر آویزاں تھے۔ مَیں نے واپس آکر ایگنس کے نرم مزاج شوہر بالا زیگل سے کہا چلئے وہ کمرہ بھی دیکھ آیئے۔ وہ میرے ساتھ مورننگ روم میں گئے۔ تصاویر دیکھیں، اور واپس آئے۔ اُن کے چہرے پر شدت کی ملائمت اور نرمی تھی۔ بیوی کے چہرے پر اُداسی۔ بڑا پُرسکون اور باوقار جوڑا تھا۔ اُن دونوں کے پاس ان کا نوعمر ہم وطن یہودی مائیکلوس فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ بولا ــــ ''ہم لوگوں نے بچپن سے اس طرح کے مکان ہالی وڈ فلموں میں دیکھے تھے اور یہ ضعیفہ یہاں تنہا رہتی ہیں۔ اولاد اسی شہر میں موجود ہے۔''

''مائیکلوس ــــ'' مَیں نے کہا ــــ ''اس وقت سے ڈرو جب مِنک کا پلنگ پوش ساری جذباتی رشتوں کا نعم البدل رہ جائے۔''

ٹینس امریکن امراء کا محبوب کھیل ہے۔ دیوان خانے کے ایک گوشے میں ایک آرٹ کے مؤرخ جمیل حسین فلسطین کی ایک گرل فرینڈ سے گفتگو کر رہے تھے۔ جمیل حسین جتنا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس نے چھانٹ کر اپنے لئے اتنی ہی بدشکل لڑکی چُن لی تھی جو اَب اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ لڑکی پروفیشنل کوچ تھی۔ لکڑی کاٹنے کے لئے آرٹ کے مؤرخ میز پر بلائے گئے۔ چینی آرٹ پر موصوف کی ایک بے حد ضخیم مصور کتاب حال ہی میں شائع ہوئی تھی۔ پیٹر چبوترے سے واپس آکر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

''چین۔'' مَیں نے پال اینگل سے کہا۔''امریکہ کا نیا FAD ہے۔نہیں۔''

''چین اور جاپان دونوں نے امریکنوں کو ہمیشہ سے مسحور کیا ہے۔ جب سے ہمارے پُرکھے وہاں بطور مشنری اور تاجر جاتے تھے ___ لیلیٰ گانا سناؤ۔'' اچانک پال نے نعرہ لگایا ___ ''انگریزی نہیں ترکی۔''

''یہ گیت انقلاب کے متعلق ہے۔'' لیلیٰ نے ذرا توقف کے بعد شرماتے ہوئے کہا۔اور گیت بزبان ترکی سنایا۔ جسے سب نے اسی اخلاق سے سنا جس طرح انہوں نے چینی گیت سُنے تھے۔کم گو لیلیٰ نے کبھی تذکرہ نہیں کیا لیکن شاید وہ ہلکی سے لفٹ ونگ تھیں۔اُن کی کہانیوں کا سوویت یونین میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔

انقلاب کے لفظ سے اب وحشت ہوتی ہے۔دیکھو ایران میں کیا ہو رہا ہے۔'' ایک ایشیائی نے چپکے سے مجھے مخاطب کیا ___ ''

''میرا نصب العین ہے لِنک کے پلنگ پوش۔''

اگر آپ کتابیں لکھتے یا چھاپتے ہوں تب بھی عیش کیجئے بھٹے اُگاتے ہوں اور سُور پالتے ہوں تو ہمارے ہاں فاقہ زدہ چمار پالتے ہیں۔سُوروں کے اس فارم یعنی دارالخنازیر کے مالک ایک ضعیفہ اور اس کے دو بے حد ہینڈسم بیٹے تھے۔وہ گھوڑے برابر خنازیر پال پوس کر بڑی بڑی کمپنیوں کو فروخت کرتے تھے۔ جہاں اُن کو نہایت نفیس پورک اور بیکن میں تبدیل کیا جاتا تھا اور ....وہ ایرکنڈیشنڈ سُوپر مارکیٹوں کے گلاس کیسوں میں پڑے جھل جھلاتے تھے۔یعنی ایک سُور کا ارتقاء ___ فارم میں مارے تعفن کے کھڑا نہ ہُوا جاتا تھا اور سُور تھے کہ مع اہل وعیال غلاظت میں لوٹ لگا رہے تھے۔

دیکھو خانم لیلیٰ ___ اسی لئے اسلام میں سُور حرام ہے۔'' مَیں نے بحیثیت خاتون مولوی اس لادین ترک خانم کو سمجھایا۔'' یہ جو تم صبح شام بیکن اور ہیم پورک اُڑاتی ہو غور سے دیکھ لو۔''

لگے ہاتھوں مَیں نے نادیہ قبطیہ سے بھی تبلیغ کر ڈالی۔'' دیکھو، سیو بہ سے ہم اہلِ اسلام سُور نہیں کھاتے۔''

ناک پر رومال رکھ کر نادیا اور لیلیٰ وقتی طور پر متاثر نظر آئیں۔

مالکان دارالخنازیر کے مکان کے سامنے اُن کے دفاتر کی بیرونی دیوار پر لکھا تھا۔

HOGS ARE BEAUTIFUL

جان ڈیر پچھلی صدی میں ایک دیہاتی لوہار تھا جو اپنے گاؤں میں ہل پھاؤڑے (کدال) کھرپیاں وغیرہ اپنی چھوٹی سی بھٹی میں ڈھالا کرتا تھا۔ پھر وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ جان ڈیر کمپنی آج ایک ایمپائر ہے۔ جس کے ٹریکٹر ساری دُنیا میں چل رہے ہیں۔ ''امریکن کامیابی'' کی نمائندہ کہانی شہر مولین میں اس کارخانے کے صدر دفاتر کی فولاد کنکریٹ اور شیشے کی عمارت کے سامنے اینڈ اسکیپ باغ میں بیدِ مجنون سے گھرے ہوئے ایک جزیرے پر ہنری مُور کا ایک مجسمہ رکھا ہے جسے بذریعہ ہیلی کوپٹر وہاں اُتارا گیا تھا۔ عمارات کی فرلانگوں لمبی راہداریاں اور ایوانِ دنیا کے موڈرن آرٹ کی بیش قیمت ترین تصاویر سے آراستہ۔ یونان کے شاعر آری کے ردِ عمل بے حد مشرقی تھے۔ ایک طویل گیلری میں سے گذرتے ہوئے وہ چپکے سے بولا۔ ''ساری دُنیا کا بہترین آرٹ دولت کے بَل پر یہاں سمیٹ لائے ہیں۔''

مشرقی یوروپ کے ادیب اس عمارت کے ٹیکنولوجیکل عجائبات کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہاں انسانوں کے بجائے روبوٹ کام کرتے ہوں گے۔'' پولینڈ کے مائیکل نے آہستہ سے کہا۔

نیچے ایک مسقف گلشن تھا۔ آری حیرت زدہ رہ گیا۔ ''تم نے غور کیا۔'' وہ مجھ سے بولا۔ ''کہ یہ سارے پھول پتے اور گھاس مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایک پتہ غیر حقیقی انداز سے چمک رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے مَیں سائنس فکشن کے ماحول میں آ گیا ہوں۔''

''اکیسویں صدی کی ایک جھلک۔'' مَیں نے جواب دیا۔

''مگر اب یہ اس سے اور آگے کہاں جائیں گے؟۔'' آری نے دریافت کیا۔

''بائیس ویں صدی میں۔'' مَیں نے جواب دیا۔ ''تم چھٹی صدی قبل مسیح کے آدمی ہو۔ لیکن مغربی تمدن کے باوا آدم بھی ہو۔ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔ نہ تم لوگوں نے گریک اسپرٹ اہلِ مغرب کو عطا کی ہوتی نہ یہ سب ہوتا۔ لیکن آج خود تم لوگ پھسڈی اور

غریب رہ گئے اور یہاں آ کر محض ریسٹوران چلاتے ہو۔''

ڈی موائن کے باہر جنگل کے ایک لکڑی اسٹور میں ایک نوجوان پچھلی صدی کا لباس پہنے، پچھلی صدی کی مصنوعات فروخت کر رہا تھا۔ ایک چوبی کیبن میں سایہ پہنے ایک عورت دودھ بلو رہی تھی۔ دوسری عورت کنویں میں سے پانی لا رہی تھی۔ ایک لڑکی مکان کے باہر چرخہ کاتنے میں مصروف تھی۔ اکیسویں صدی سے واپس پچھلے زمانوں میں پہنچ کر امریکنوں نے اپنی مختصر سی تاریخ کو جگہ جگہ بڑے پیار سے سجائے رکھا ہے۔ اس لونگ ہسٹری فارم میں پائینرز کے کیبنوں کے علاوہ ایک بڑے گاؤں میں لوہار کی دُکانیں، ڈاکٹر، پنساری، زمیندار کا بڑا مکان۔ ہر چیز بجنسہٖ دوبارہ تعمیر کی گئی تھی اور اس میں اسکول کے بچّوں اور سیاحوں کے لئے اسی زمانے کے پوشاکوں میں ملبوس لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اسکول ہاؤس میں سایہ پہنے ٹیچر بچوں کو پڑھاتی بالکل انیسویں صدی کی امریکن ناول کا ایک کردار معلوم ہوتی تھی۔ حبشی غلاموں کے جھونپڑے مفقود تھے۔ کیوں کہ شمال کی ریاستیں غلامی کے خلاف تھیں۔ جنوب کے مظلوم غلام پناہ لینے کے لئے شمال بھاگ آتے تھے۔ فرار کا راستہ ''انڈر گراؤنڈ ریلوے'' کہلاتا تھا۔ جس کے متعدد اسٹیشن اس جمہوریت پسند ریاست میں موجود تھے۔ لیکن آج یہ ریاست سیاسی اور سماجی لحاظ سے قدامت پسند ہے۔

ریاست آیووا ملک کے متموّل ترین کسانوں کا دیس ہے جو بھٹے اگاتے ہیں اور ذاتی طیارے رکھتے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں خروشیف امریکن زراعت کے مطالعے کے لئے اسی ریاست میں مدعو کئے گئے تھے۔ اس بھٹوں کے کھیت کے درمیان واقع امریکن وڈیرے، مسٹر ولسن بھٹو کے دو منزلہ مکان کا طرزِ آرائش ''پیریڈ امریکن'' تھا۔ باہر جان ڈیر کمپنی کے جغادری ایرکنڈیشنڈ ٹریکٹر کھڑے تھے۔ جنہیں میاں بیوی ولسن اور اُن کے لڑکے چلاتے تھے۔ اس قسم کا مثالی امریکن سادہ لوح دیہاتی خاندان جس کی تصویریں ایک زمانے میں نارمن روک ویل لائف کے سرورق پر بنایا کرتا تھا۔

باہر سیب کے درختوں کے نیچے مسٹر پال اینگل بینچ پر بیٹھے دورۂ چین کا ذکر کر رہے تھے۔ جب مَیں نے اُس سے پوچھا۔ ''یہاں آس پاس کوئی کو یکر گاؤں نہیں ہوں گے؟۔''

''اتفاق سے ایک کویکر کسان یہاں لنچ کے لئے مدعو ہے۔ اِس سے پوچھتا ہوں۔'' فوراً زقند بھر کر مکان کے اندر گئے۔ چند منٹ بعد آ کر کہا'' ایک کویکر بستی یہاں سے پندرہ میل دُور ہے۔ چلو ابھی تم کو دکھالائیں۔''

وہ کویکر قریہ میپل کے درختوں اور سبزہ زاروں سے پُر۔ ایک تصویر کی طرح نظر فریب اور پُرسکون اس کے جماعت خانے میں جا کر ہم لوگ بنچوں پر چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ کویکر کسان نے (جو مسٹر ولسن کے فارم سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔) کہا'' یہ جماعت خانہ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ ہم سب امن پرست اور جنگ کے مخالف ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو فرینڈز کہتے ہیں۔''

(سوسائٹی آف فرینڈز ۱۶۵۰ء میں انگلستان میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی جارج فوکس نے انگریزی خانہ جنگی کے دوران اولیور کرومویل سے کہا تھا کہ مَیں خدا کو گواہ کر کے تجھ سے کہتا ہوں کہ مَیں کسی کے خلاف تلوار نہیں اُٹھاؤں گا۔ کسی سے جنگ نہیں کروں گا کہ خوں ریزی عیسیٰؑ کی روشنی کی مخالف ہے۔ امریکہ میں کویکرز نے سُرخ ہندوستانیوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے اور امریکن انقلاب، سے قبل اپنے کالے غلام آزاد کر دیئے۔)

''ہمارے عبادت خانے میں پادری نہیں ہوتا۔ خدا سے بندے کا ڈائریکٹ رشتہ اصل چیز ہے۔'' کسان نے کہا۔

نادیا میرے برابر بیٹھی بیٹھی۔ بور ہو رہی تھی:

''یہ کس قسم کا چرچ ہے۔ اس میں صلیب تک نہیں۔ بغیر پادری اور صلیب کے بھی بھلا کوئی چرچ ہو سکتا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نادیاز کی بشائی ___ ''مَیں نے کہا'' یہ کویکر ہی سچے عیسائی ہیں۔ یہ میرے پسندیدہ لوگ ہیں۔ سارے مغرب میں سب سے زیادہ متوازن صلح پرست اور امن پسند لوگ جو تم کو ملیں گے۔ تم کو پتہ چلے گا کہ وہ یا خود کویکر ہیں یا کویکر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

''بغیر پادری کا چرچ۔ یہ کس قسم کی عیسائیت ہے۔'' نادیا نے بیزاری سے دہرایا۔

''یہی سچے عیسائی ہیں۔'' مَیں نے بھی دہرایا۔ ''مَیں ایک ایسے امریکن خاندان کو جانتی ہوں جو اب تک ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے انجیلِ مقدس کی زبان اور

THOU اور THEE استعمال کرتے ہیں۔ کیا پیارے لوگ ہیں۔ اور ذرا ستر ہویں صدی انگلستان اور امریکہ کے اصول پرستوں کا خیال کرو۔ وہ بھی کیا ولولہ خیز زمانہ رہا ہوگا۔

باہر ایک چھتنار میپل کے نیچے کوچ کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میرے علاوہ کسی کو اس کویکر گاؤں سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن کوچ میں سوار ہوتے ہوئے پیکنگ کے شاؤشن نے پال اینگل سے کہا۔

"یہ کویکر فلسفہ ہندوستانی فلسفہ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کی روشنی تمہارے اندر موجود ہے۔ وغیرہ۔ یہی اسلامی تصوّف بھی ہے۔ آپ تو مسلمان ہیں نا؟" شاؤسن نے لیلیٰ اربل سے پوچھا۔

"نہیں محسن نام کی۔" اس نے دہرایا اور سگریٹ سلگالیا۔ بیشتر ترک خواتین کی طرح وہ لگاتار سگریٹ نوشی کرتی تھی۔

میپل کے درخت چنار سے مشابہ ہیں۔ کویکر فلسفہ ویدانت اور تصوّف سے مشابہ ہے۔ استانبول کی لیلیٰ اربل اپنی جڑوں سے کٹ چکی ہے۔ وہ کس سے مشابہہ ہے؟ مے فلاور کے سامنے پارک میں ٹہلتے ہوئے اس نے ایک دفعہ خود مجھ سے کہا تھا کہ ہم کو اب یہ احساس بے حد شدید ہو چکا ہے کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر کے اور یورپ سے رشتہ جوڑ کر ہم اپنے تہذیبی ورثے سے بالکل کٹ گئے۔

"بڑی عجیب کشمکش کا دَور ہے۔" مَیں نے کہا تھا۔ "یا اتاترک کی لادینی یا آج کل کی انتہا پسند اسلام پرستی تجدیدیت میں انتہا پسندی کا خطرہ بھی مضمر ہے۔ ہمارے ہاں برِصغیر میں کلام مجید کی تفاسیر مختلف فرقوں کے علماء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے لکھی ہیں۔

سامنے ندی کے کنارے اس شام نادیا فکر شعر میں محو ٹہل رہی تھی۔ اس روز اس نے لکھا تھا۔ "اس کہرے میں ننھے جزیرے پیدا ہوتے ہیں اور تتلیاں مرتبان میں پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔"

خیاباں خیاباں ارم

الارم صبح چار بجے کا لگایا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے ایرپورٹ لموزین کے ڈرائیور نے نیچے سے فون کیا تب آنکھ کھلی ٹھیک سات بجے سیڈرر۔پڈز سے شکاگو جانے والا طیارہ چھٹتا تھا۔ ہڑ بڑا کر نیچے گئی۔ لموزین کا ڈرائیور جو خالص ورکنگ کلاس امریکن تھا۔ خنک اندھیرے جنگلوں کی طرف چلا جہاں روشن راستوں کے کنارے خوبصورت دومنزلہ مکان خوابیدہ تھے۔ چند ایک میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ڈرائیور ایک مسافر کا پتہ بھول گیا تھا۔ اور بار بار چند سڑکوں کا چکر لگا کر وائرلیس پر اپنے دفتر سے کہتا جارہا تھا I AM HAVING PRODIEMS جو امریکنوں کا سب سے بڑا شکایتی جملہ ہے۔ لموزین کے دفتر نے کمپیوٹر کے ذریعے معلوم کرکے ڈرائیور کو چند سیکنڈ میں گمشدہ پتے سے مطلع کیا۔ اس نے کار ایک مکان کے سامنے جا کر روکی۔

ایک خاتون بریف کیس سنبھالے برآمد ہوئیں۔ دوسرے مکان سے ایک اور خاتون مع بریف کیس۔ دونوں از حد ایفی شنٹ۔ اور بریسک۔ ہر امریکن عورت از حد ایفی شنٹ اور بریسک ہوتی ہے۔ اس کی وہ لکڑ سکڑ دادیاں پائنیر عورتیں جنہوں نے سخت کوشی کی زندگی گزار کر نئے ملک کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ پائنیز اسپرٹ ان کو ورثے میں ملی ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ کی انتہائی مقابلہ پرست زندگی نے اُن کے اندر جارحانہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔

آیوواسٹی سے اور سیڈرریپڈز سے کافی لوگ ہفتے میں پانچ دن کام کرنے بذریعہ ہوا شکاگو جاتے آتے ہیں۔ ویک اینڈ میں اپنی بوٹ کار کی چھت پر رکھ کر اسی الفی شنسی سے برائے تفریح کسی جھیل کی طرف نکل گئے۔ دو موٹریں اور ایک کشتی مڈل کلاس کنبے کی نشانی ہے۔ غریب غرباء محض ایک کار سے گذارا کر لیتے ہیں۔

شکاگو سے دوسرا طیارہ بوسٹن کے لئے پکڑا۔ بوسٹن میں پوپ کی آمد کی تیاریاں کی جارہی تھیں اور بارش ہورہی تھی۔ بوسٹن کی کھاڑی پر بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ یہاں دوسو سال قبل انہوں نے چائے سمندر میں پھینکی تھی اور انگلستان سے سیاسی محکومیت کے انقطاع کا اعلان کیا تھا۔ لیکن نیوانگلینڈ آج تک اپنی برطانوی روایات اور باقی امریکہ کے مقابلے میں اپنی برتر تہذیب پر نازاں ہے۔ لطیفہ مشہور ہے کہ بوسٹن کے پرانے خاندان اپنا شجرہ نسب پلگرم فادرز سے ملاتے ہیں۔ یہاں کی مشہور عالم یونیورسٹیاں سترہویں صدی میں قائم ہوئی تھیں اور اس خطّے کی ارسٹوکریسی کو امریکن پریس ''بوسٹن برہمن'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔

بوسٹن سے تیسرا ادمان برائے برلنگٹن جو کینیڈا کی سرحد کے قریب ریاست ورمونٹ کا شہر ہے۔ نیچے مشرقی ساحل کے حسین جنگلات فال کے رنگوں سے جھلملا رہے تھے۔

''کیا تم بھی خزاں کے رنگ دیکھنے جارہی ہو؟'' میرے برابر بیٹھی ایک ضعیفہ نے دریافت کیا۔ وہ دُور دراز سیٹیل سے آرہی تھی۔

''محض حسنِ اتفاق سے یہ فال کا موسم ہے جب اپنے رشتہ داروں سے ملنے جارہی ہوں۔ وہ لوگ وہاں پاکستان سے آئے ہیں۔''

''اوہ پے کیسٹین۔'' ضعیفہ ذرا مبہم نظر آئی۔

ابھی ایران کے یرغمالیوں کا قصہ نہیں ہُوا تھا جس کے بعد سے ''اسلام'' اور اسلامی ممالک کا چرچا امریکن ٹیلی ویژن پر شروع ہُوا۔ چند سیکنڈ غور وخوض کے بعد ضعیفہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''تم عرب ہو؟''

''انڈین''۔

وہ پھر بڑی مشکل میں گرفتار نظر آئی۔ ریڈ انڈین کو امریکہ میں محض انڈین

کہا جاتا ہے۔

''انڈیا''۔مَیں نے اُکتا کر کہا۔

''اوہ''۔اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''ہندو۔ ہیری کرشنا HARRY KRISHNA میری ایک پڑوسن کا لڑکا ہیری کرشنا ہو گیا ہے۔ مگر تم کا سٹ مارک نہیں لگا تیں ماتھے پر؟۔''

''نہیں۔''

اب کون اس بے چاری سے مغز کھپائے۔مَیں نے اس کو مناظرِ قدرت کی طرف متوجہ کیا۔

آہاہا۔وہ دیکھئے کس قدر خوبصورت ہیں؟۔''

''واقعی ــــ ''بڑھیا نے کھڑکی سے جھانکا۔لیکن سوالات سے باز نہ آئی۔

طیّارہ نیچے اُترنے لگا۔ باہر آکر ضعیفہ میرے ساتھ ساتھ رہی۔

''ارے وہ دیکھو۔ایک سفید بالوں والی ہندو لیڈی بیوٹی فل اورنٹیل لباس پہنے۔ یہی تمہاری کزن ہیں؟ اتنی خوبصورت، جوان چہرہ اور سفید بال۔اور اُن کے ساتھ ایک بے حد ہینڈسم نوجوان کھڑا ہے۔فرنچ کٹ داڑھی۔ بالکل اطالوی معلوم ہوتا ہے۔ یہی اُن کا انجینئیر لڑکا ہے۔ جو برلنگٹن میں رہتا ہے۔جس سے ملنے وہ پے کسیتن سے آئی ہیں؟ وہ دیکھو وہ دونوں تمہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے ہیں۔''

جتنی دیر میں قطار میں منتظر رہی ضعیفہ نے جو مجھ سے آگے کھڑی تھی اپنی رننگ کمنٹری جاری رکھی۔

چچازاد بہن آپا حُسن (بیگم تمیرا جری احمد سیّد ملاحظہ ہو'' کارِ جہاں دراز ہے'' جلد دوم) کے فرزند اکبر عمر عزیز سیّد عرف منّن (ملاحظہ ہو کتاب ہذا) آج سے تیس سال قبل بعمر سترہ سال لاہور سے بغرض تعلیم لندن بھیجے گئے تھے جب سے مغرب میں قیام پذیر ہیں۔ اور اب برلنگٹن کی آئی بی ایم فیکٹری میں CHIPS (ڈاک کے ٹکٹ کے برابر کمپیوٹر) کی مشینری ڈیزائن کرنے والے انجینئیر وں کی ٹیم میں شامل برلنگٹن سے چند میل دور ایسکس جنکشن نامی قصبے میں مقیم۔

امریکہ کی ہر ریاست ایک تخلّص بھی رکھتی ہے۔ مثلاً اری زونا۔ ''گرینڈ کنین اسٹیٹ''۔ ارکنسو ''بہترین مواقع کی سرزمین''۔ کیلی فورنیا ''گولڈن اسٹیٹ''۔ ڈیلاویر۔ ''ڈائمنڈ اسٹیٹ''۔ فلوریڈا ''سن شائن اسٹیٹ''۔ جارجیا۔ ''ایمپائر اسٹیٹ آف دی ساؤتھ''۔ کینسس۔ ''گلِ آفتاب۔'' کین ٹکی ''نیلی گھاس۔'' مین۔ ''صنوبر''۔ منی سوٹا۔ ''شمالی ستارہ''۔ مسس سپی۔ ''منگولیا''۔ نیواڈا۔ ''سلور اسٹیٹ''۔ نیو جرزی۔ ''گارڈن اسٹیٹ''۔ نیویارک۔ ''امپائر اسٹیٹ۔'' (ایمپائر۔ یعنی اوّل) ٹیکسس۔ ''تنہا ستارہ''۔ واشنگٹن۔ ''سدابہار۔'' وغیرہ وغیرہ۔

متّن کی کاروں کی تختیوں پر ''گرین اور نٹین اسٹیٹ'' لکھا تھا جو ریاست ورمونٹ کا تخلّص ہے ___ جنت نظیر ورمونٹ اپنے سرسبز پہاڑوں جھیلوں اور بالخصوص موسم خزاں کے رنگ برنگے پتوں والے درختوں کے لئے ساری دُنیا میں مشہور ہے۔

''اللہ میاں نے مغربیوں کو جی بھر کر ہر طرح سے مالا مال کیا۔ ایک سے ایک خوبصورت ملک۔ اور ہمیں اُٹھا کے دے دیئے ریگستان۔'' آپا جمن نے دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

متّن کی امریکن بیوی نینسی مہمان نوازی میں مصروف کمرے میں آئی۔ جب مجھے عمر نے بتایا کہ اس کی والدہ چند ماہ کے لئے پاکستان سے آرہی ہیں۔ مَیں سہم گئی کہ ایک تو ساس پھر پاکستانی۔ مشرقی مسلمان ساس جانے کیسی ہوں گی۔ دیکھا تو ایک نہایت اسمارٹ موڈرن بہترین انگریزی بولنے والی خاتون مسکراتی ہوئی، ہوائی جہاز سے اُتریں۔ عمر نے مجھے بتایا کہ امّاں اور اُن کی بہنوں نے ۱۹۲۰ء میں ایک کانونٹ اسکول میں پڑھا تھا اور ۱۹۳۹ء میں بی اے پاس کیا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہُوا کہ ہندوستان میں مسلمان عورتیں اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ ہو چکی تھیں۔''

اس لکڑی کی چونچ والے نقاب اوڑھے عرب عورتوں نے یہاں آ آ کر مسلمان عورتوں کے متعلق مغرب کے اسٹریوٹائپ تصورات کو مزید تقویت بخشی ہے اور خصوصاً اب وہ ٹیلی ویژن فلم ''ایک شہزادی کی موت'' گویا اس تابوت کی آخری کیل ہے۔

آپا جمن کے سگے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سیّد صلاح الدین حیدر پارے میاں (ملاحظہ

ہو'' کارِ جہاں دراز ہے'' جلد اوّل دوم) صدر شعبہ کمپیوٹر ٹیکنولوجی مک گل یونیورسٹی مونٹریال موجد اُردو فارسی عربی اسکرپٹ جنریٹنگ مشین جو'' حیدر سسٹم'' کہلارہی تھی۔ مونٹریال سے وارد ہوئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک اور بڑا پیچیدہ ہے۔ اسلامی تجدیدیت اور اس کے ساتھ مغرب کی ایجادات کا پورا پورا استعمال۔ اسی سال سے سعودی حکومت نے پارے کا حیدر سسٹم خرید کر اسے جدّہ میں حاجیوں کے انتظام کے لئے استعمال کیا۔

یہودی مسیحی مغربی تہذیب کے سائنسی اور ٹیکنولوجیکل کارناموں سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ان میڈیول معاشروں میں جو ہل چل مچی اس کا نتیجہ ایران میں سامنے آچکا تھا۔ اور عرب ممالک ایک بحران سے کسی لمحے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ شہزادی اور اس کے عاشق کا قتل اسی بحران کا ایک پہلو تھے۔ ہم لوگ جو ڈیڑھ سو سال سے برطانیہ کی نوآبادی رہے اس اچانک بحران کا سامنا کرنے کے بجائے ان تبدیلیوں کے اثرات کو بتدریج جھیل گئے۔ نظریاتی اور تہذیبی تصادم کا سامنا ہوش مندی سے سرسیّد اور اُن کے ساتھیوں نے سو سال قبل کیا تھا۔ خلیجی اور سعودیہ عرب اس ٹکراؤ سے آج دوچار تھے۔ اور خلائی عہد کا قرونِ وسطیٰ کی دنیا سے یہ ٹکراؤ خوفناک اور لرزہ خیز تھا۔

مغربی ٹیکنولوجی ہماری زندگیوں کا ایسا لازمی حصّہ بن گئی ہے کہ ہم اس کے متعلق سوچتے بھی نہیں۔ مرزا غالب کلکتہ میں صاحبانِ فرنگ کے کمالات دیکھ کر ہی انگشتِ بدنداں رہ گئے تھے۔ آج مرزا غالب کے ٹیپ ساری دُنیا میں جہاں جہاں ہندوستانی یا کستانی موجود تھا گھر گھر بج رہے ہیں۔

رات کو آپا حمن نے اپنی بڑی لڑکی نازلی کے گیت بجائے۔ مرزا غالب کی غزلیں نازلی اور اس کے شوہر کے گھر پر دعوتوں میں یہ گانے ٹیپ کئے گئے تھے۔ ایک فوجی افسر نے سہگل الاپا۔ دیا جلاؤ ـــــ سنت سہاگن بن رہی تیرے مندر میں دیکھ اندھیرا۔''

'' خانم خاناں۔ اب آپ۔'' ایک اور افسر کی آواز آئی۔ نازلی کا شوہر آپا نفیسہ کا لڑکا بریگیڈیر مجاہد حسین اس چھاؤنی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ سازوں کے ساتھ نازلی کی سریلی آواز بلند ہوئی۔

'' سارنگا تیری یاد میں نین ہوئے بے چین۔ وہ مہوا کا جھولنا وہ پیپل کی چھاؤں۔''

ورمونٹ کے رنگ برنگے خزاں زدہ درختوں میں گھرے مثن کے دومنزلہ مکان کے خالص امریکن ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پارے کوامبو اور پیپل کا خیال آیا ہوگا تو انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔اپنی نوعمری میں پارے ہماری فیملی میوزک پارٹیوں کے روحِ رواں رہ چکے تھے۔

''پارے انداز کا وہ گانا سناؤ جو تم گاتے تھے۔ میری لاڈلی بنی ہے تاروں کی تورانی__ یادہ __ اٹھائے جاان کے ستم اور جیئے جا__'' میں نے فرمائش کی__'' تم اور ممی یہ گانے ہمیشہ گاتے تھے۔''

''بی بی''۔پارے نے سادگی سے جواب دیا۔''عرصے سے ہم گنگنائے تک نہیں۔ اگر گاتے بجاتے رہتے تو یہ ایجاد نہ کرپاتے۔کسی اہم کام کی تکمیل کے لئے یکسوئی چاہئے۔''

پارے میاں نارتھ امریکن ورک ایتھک کی درخشندہ مثال بن چکے تھے۔ لاس اینجلز سے میرے بھتیجوں جلال عدنان اور منصور نے فون کیا۔'' ورمونٹ میں فیملی ری یونین بڑے زوروں میں جارہا ہے۔''

سان فرانسسکو سے بھانجی زیبا کی آواز آئی۔امریکہ میں ''نیوکلیر فیملی'' محض شوہر بیوی اور بچوں پر مشتمل ہے۔'' یہاں سب کچھ ہے بس ہیومن ریلیشن شپ ختم ہوگئے۔'' میں نے کہا'' گوسوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ ہم لوگ نے مشرق میں اب تک کیا تیر مار لئے۔ بڑے کھاٹ پر پان چبارہے ہیں اور سمدھی کے سالے یا پھوپھی کی نند کی جٹھانی سے گپ ہورہی ہے۔ان لوگوں نے انفرادی آزادی کی وجہ سے ہی یہ CHIP بنالیا۔لیکن سوال یہ ہے کہ یہ چپ اگر نہ بنتا تو کیا حرج تھا۔'' میں نے میز پر پڑے ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کے کمپیوٹر کو دھیان سے دیکھ کر سوال کیا۔

شدید انفرادیت پرستی اور دوسرے شخص کی __ PRIVACY کا احترام اور اپنے کام سے کام رکھنا مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ اور شدید خوداعتمادی۔ بقول شخصے ہر امریکن مجسم منشور آزادی بنا پھرتا ہے۔اسی انفرادیت پرستی کی وجہ سے اس قوم نے اشتراکیت اور اشتمالیت کو ہوّا بنا رکھا ہے۔'' خوشحالی، تحفظ اور آزادی امریکن ''خواب'' کے اجزاء ہیں۔ اور بوڑھوں کی خوداعتمادی کا یہ عالم ہے کہ نینسی کی والدہ پچھتر سالہ بزرگ خاتون ماشاءاللہ

واشنگٹن ڈی سی سے کار خود ڈرائیو کرتی اتنا لمبا فاصلہ تنہا طے کر کے بیٹی اور داماد سے ملنے آتیں۔ اور تیسرے دن واپس۔

پارے کے خسر دوسری جنگِ عظیم سے قبل برطانیہ میں لیٹویا کے سفیر تھے۔ جنگ کے بعد لیٹویا سویٹ یونین میں شامل ہو گیا۔ وہ وطن واپس جانے کے بجائے کینیڈا آ گئے۔ وہ میاں بیوی مونٹریال میں رہتے ہیں۔ جب کبھی بیٹی اور داماد سے ملنے آتے ہیں پارے کی بیوی ڈائنا باضابطہ شام کا لباس پہن کر کوک ٹیلز سرو کرتی ہیں۔ ڈنر کے بعد کچھ دیر پُر تکلف گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے بعد ماں باپ واپس۔ ایک ہمارے ہاں کا نقشہ ہے۔ کہ ہفتوں مہینوں عزیز و اقارب اور دوست ایک دوسرے کے ہاں پلنگوں پر نیم دراز گھنٹوں مسلسل گپ ٹھونک رہے ہیں۔ بلا اطلاع بن بلائے ایک دوسرے کے ہاں پہنچ گئے۔ اور مسلسل گپیں اس قسم کی قبائلی اجتماعی بے تکلف طرزِ زندگی کا مغرب میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ اسی وجہ سے انہوں نے CHIP ایجاد کر لیا اور ہائی ٹیکنولوجی کے دوسرے معجز نما کل پُرزے اور اسی وجہ سے فرد کی تنہائی کا احساس بڑھ گیا۔ پہلے وہ ماہرینِ نفسیات کے پاس جاتے تھے۔ اب مہیش یوگی کے چکر میں مبتلا ہوئے۔

چنانچہ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ہمیں کھاٹ پر نیم دراز ہو کر چچی کی نواسی کی نند کے ساتھ ضرور گپیں ہانکنی چاہئیں۔" مَیں نے کہا۔"

"ہم لوگوں کے مشترکہ خاندان کی روایت کو یہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔" آپا حمن بولیں۔ "نہٹور میں یا جس جگہ بھی پورا خاندان جمع ہوتا کس قدر تفریح رہتی تھی۔ ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ مَیں آٹھ نو سال کی تھی مگر اچھی طرح یاد ہے گویا کل کا واقعہ ہو۔ سب نے پہلا فیملی فینسی ڈریس ہوا مجھے یاد ہے سب میرٹھ میں جمع تھے۔ امّی جان کمہارن بنیں۔ ابا جان کمہار۔ چھوٹی چچی جان بہشتی۔ بڑے ابا بڑی اماں جوگی جوگن۔ جوگن کے لئے ستار کسی ہندو دوست کے ہاں سے منگوایا گیا تھا وہ وقت پر پہنچا نہیں۔ چچا نثار حیدر مرحوم نے فی البدیہہ یہ نظم کہی۔ اب بھلا دیکھو۔ ورمونٹ میں بیٹھ کر مجھے وہ بھولی بسری نظم یاد آئی جو بالکل ایک دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔

بیچنے نکلی کمہارن جب کھلونے رات کو
دل دھڑکتا تھا موڑ پر کمہار آنے کو ہے
اِک طرف جوگی ہے حیراں اک طرف جوگن ملول
سارے ساماں ہوگئے لیکن ستار آنے کو ہے
بھابی صاحب کو پریشانی میں ہوتے یاد ہیں
ڈاکٹر کا روز وعدہ ہے پچمار آنے کو ہے
جانِ من بستر پہ جاؤ اب بخار آنے کو ہے

ڈاکٹر یعنی ''ڈاکٹر چچا وحید۔''

''شدید انفرادیت کا ایک ردِ عمل یہ ہُوا کہ کچھ لوگ کمیون بنا کر دیہات میں رہنے لگے ہیں۔'' منّن نے کہا۔

یہاں شخصی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کسی ذیلی کلچر یا کسی متبادل طرزِ حیات کو بلا روک ٹوک اختیار کر سکتے ہیں۔ آپ کوئی سا مذہب اختیار کر لیجئے۔ کسی طرح کے کپڑے پہنئے۔ جو چاہے کیجئے۔ اگر آپ پبلک نیوسنس نہ بنیں کوئی آپ کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔

ایک رات منّن کی چالیسویں سالگرہ کا ڈنر تھا۔ امریکن دستور کے مطابق ڈنر روزانہ شمعوں کی روشنی میں کھایا جاتا تھا۔ اس رات نینسی نے سالگرہ کی شمعیں روشن کیں اور تحفوں کے پیکٹ کھولے ایک تحفہ منّن کے سیاہ بلّے کی طرف سے برآمد ہُوا۔

''ٹونک میں اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اس رات جب منّن پیدا ہوئے کیا معلوم تھا کہ اس بچے کی چالیسویں سالگرہ ہم امریکہ کے ایک قصبے میں منائیں گے۔'' آپا حمن بولیں۔

''ہر چیز پہلے سے لکھی جا چکی ہے۔'' مَیں نے کہا۔ ''روشن کتاب میں۔''

''کمپیوٹر کیا کیا حل کر سکتا ہے؟۔'' آپا حمن نے پوچھا۔

''کیا پتہ زندگی کا معمہ بھی حل کر لے۔ اگلے دس سال میں۔ آج سے تیس سال پہلے ایک کمپیوٹر کا سائز اس کمرے کے برابر ہوتا تھا۔ اس وقت یہ ڈاک کے ٹکٹ کے برابر ہوگیا ہے۔ محض دس سال میں اتنی زبردست ترقی تو آگے نہ جانے کیا کیا ہوسکتا ہے؟۔'' منّن

نے جواب دیا۔

''یہی تو سوچ کر ڈر لگتا ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''پارے ماموں نے جو مشین ایجاد کی ہے اسے وہ دیا سلائی کی ڈبیا کے سائز کی بنانے والے ہیں۔'' منّن نے مزید اطلاع دی۔

منّن کا امریکن دوست جیری پرشین آرٹ کی کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔

''یہ عمارتیں جو ان حیرت انگیز لوگوں نے بنائیں آٹھ سو سال پہلے۔ یہ لوگ جدید ٹیکنولوجی اور جدید انجینیئرنگ سے واقف نہ تھے۔''

متحیر و مبہوت وہ اوراق پلٹا کیا۔

''اسلامک آرٹ پر کتابیں یہاں کوئی خریدتا نہیں۔ ہم خرید لاتے ہیں۔ یہاں اسلامی تہذیب سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ ہندو فلسفے یوگا پر کتابیں البتہ دھڑا دھڑ بک رہی ہیں۔'' منّن نے کہا۔

''اسلامی تہذیب سے دلچسپی کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ اسلام آج کل محض اس سلسلے میں مشہور ہو رہا ہے کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ اس کا سر قلم کر دیا۔ اسے گولی سے اُڑا دیا۔ اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔'' میں نے جل کر کہا۔

سارا نیو انگلینڈ دنیا کے حسین ترین خطّوں میں سے ہے اور اس کے موسمِ خزاں کے ہزار رنگ دیکھنے کے لئے ساری دُنیا کے سیّاح وہاں آتے ہیں۔ درختوں کے کاسنی، اودے، نارنجی، عنابی، سُرخ سنہرے پتّے ایک عجیب و غریب نظّارہ ہے۔ خوبصورت گاؤں پینٹنگز معلوم ہوتے ہیں۔ اور رَنگ برنگے پتّوں والے شاندار بلند و بالا سایہ دار درخت آبی رنگوں کی سبک تصویریں۔

ایک پہاڑی کے اوپر پڑوسی کنیڈا کے سیّاحوں کی کاریں جمع تھیں۔ نشیب میں حسین دیہاتی مکانات، گرجا گھر، کنٹری اسٹور، سلسلہ کوہ پر اور وادیوں میں نارنجی عنابی اودے کاسنی قرمزی ارغوانی پتّوں والے شاندار درختوں کے جنگل، اتنا قدرتی حسن یکجا ہونا ممکن ہے۔ وادیٔ کشمیر کی طرح۔ وہاں غربت ہے یہاں بے اندازہ دولت، کوئی اللہ کا بندہ پیدل

چلتا نظر نہ آیا۔ بہار ہو کہ خزاں حسن سریع الزوال ہے۔ دس دن کے اندر اندر پت جھڑ کے رنگ کہیں کہیں مرجھا چلے۔

آپا ثمن پاکستان لوٹ رہی تھیں مَیں واپس آیووا سٹی، صبح سویرے ہم لوگ نیویارک روانہ ہونے والے تھے۔ رات کو چاندنی چھٹکی۔ درختوں کے رنگ چاند کے رنگ میں نہائے۔ محبت شعار نینسی اداسی کے ساتھ راستے کے لئے ناشتے کے باسکٹ تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ آپا ثمن نے نازلی کا ٹیپ لگایا۔ اس کی آواز جو بہت دُور ملتان چھاؤنی میں ایسی ہی کسی اُداس چاندنی رات میں ریکارڈ ہوئی ہوگی بلند ہوئی۔

نظر سے چُھپ رہا ہے ماہتاب آہستہ آہستہ
بکھر جائے نہ سارا شہرِ خواب آہستہ آہستہ

صبح منہ اندھیرے متّن نے اسٹیشن ویگن اسٹارٹ کی۔ نینسی نے خدا حافظ کہا۔ آپا ثمن نے آنسو خشک کئے۔ کار پُرفضا ایسیکس جنکشن سے نکل کر پُرفضا شاہراہ پر آ گئی۔

برس جائے گا نظروں کا سحاب آہستہ آہستہ
کُھلے گی پھر سے یادوں کی کتاب آہستہ آہستہ

جیری اور متّن باری باری ڈرائیو کر رہے تھے۔ چھ سومیل کا حسین راستہ، عظیم الشان شاہراہوں پر کاروں کی قطاریں۔ دونوں طرف سرسبز پہاڑ۔ رنگ برنگے جنگل، خوبصورت شہر اور گاؤں ــــــ ایک جگہ وسیع سبزہ زار کے اوپر ایک غبارہ بہت نیچے نیچے جا رہا تھا۔

"دل جلے لوگ" متّن نے کہا۔ "آج کل غباروں میں سفر کر رہے ہیں۔ ایک غبارہ پچاس ہزار ڈالر کا مل جاتا ہے۔ خریدنے والے خرید لیتے ہیں۔"

نیویارک شروع ہونے سے قبل کروڑ پتیوں کے مکانات گھنے باغوں میں پوشیدہ۔ اس کے بعد اچانک سلمز۔ جلی ہوئی دُھواں دھار عمارتیں اب تک امریکہ میں ہر شہر اور قصبہ اس قدر صاف ستھرا دیکھا تھا۔ ایک سڑک پر پڑا ذرا سا کاغذ کا ٹکڑا دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ اب راستوں کے کنارے کوڑے کے ڈھیر بھی نظر آئے۔ دفعتہً یہ محسوس ہُوا کہ نیویارک میں انسان بستے ہیں۔

''آپا جمن ــــــ وہ دیکھئے کوڑے کا ڈھیر ــــــ'' مَیں اکسائیٹ منٹ سے کہتی۔

''ہاں، ہاں اور وہ دیکھو۔ اتنا کوڑا ادھر پڑا ہے۔'' وہ جواباً کہتیں۔

''یہ عمارتیں کیسے جل گئیں؟'' ایک پُل پر سے گذرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

یہودی مسلم لینڈ لارڈ اپنے بلیک کرایہ داروں کو نکالنے کے لئے آگ لگا دیتے ہیں۔'' جیری نے بتایا ــــــ !

اقوامِ متحدہ کی عمارت دُور سے ماچس کی ڈبیا معلوم ہوئی۔ بارش شروع ہوگئی۔ ہڈسن دریا دُھند میں چُھپ گیا۔ ''ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ'' بادلوں میں پوشیدہ تھی۔

شام کو شہر کے ورکنگ کلاس علاقے میں ہم لوگ ایک ہندوستانی دوکان کا پتہ ڈھونڈتے پھرے جو آپا جمن کو کسی نے واشنگ مشین خریدنے کے لئے بتایا تھا۔ ایک جگہ ایک بورڈ پر پردیپ یا جگدیپ اسی نام کا کوئی بورڈ لکھا تھا۔ ایک صاحب دروازے میں کھڑے تھے۔ مَیں ان کو بمبئی کا گجو بھائی سمجھی۔ وہ کٹر پاکستانی مسلمان نکلے۔ خاصے بدمزاج بھی تھے۔ مَیں نے پوچھا۔

''آپ نے دوکان کا یہ نام کیوں رکھا ہے؟''

بولے'' یہ بزنس ہے۔''

یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔ باہر سائیڈ واک پر چند غریب یہودی پھل ترکاری کے ٹھیلوں کا باقیماندہ سامان سمیٹ رہے تھے۔ وہ مثالی غریب نیویارک یہودی تھے۔ گل موچھے۔ سر پر ٹوپیاں۔ آپس میں جھگڑ بھی رہے تھے۔ بڑا اُداس منظر تھا۔

کزن حسین کی سسرال نیویارک کے مثالی امیر یہودی ہیں۔ سنٹرل پارک ویسٹ میں رہتے ہیں۔ جو نیویارک کا بے حد مہنگا محلّہ ہے۔ شہر سے باہر اُن کی کنٹری اسٹیٹ اور ذاتی جھیل ہے۔ ان دنوں حسین اپنی سسرال میں مقیم تھے۔

جس وقت ہم لوگ سنٹرل پارک ویسٹ پہنچے، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ حسین کی عمارت کے پورچ میں وردی پوش دربان استادہ تھا۔ داخلے کا عالی شان مرمریں ہال عظیم الجثہ تازہ پھولوں سے بھرے مرمریں گلدانوں اور سنہرے صوفوں سے آراستہ۔ طویل گیلری،

منقش سنہرے بھاری لفٹ دوسرے وردی پوش چوبدار نے اوپر حسین کو فون کیا۔

اوپر شاندار فلیٹ ۔ ڈرائنگ روم میں گرینڈ پیانو۔ گیلری میں حسین نے اپنے ماموں کی تصویر لگا رکھی تھی کہ محلہ سادات نہٹور میں نیم تلے کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ گڈ اولڈ حسین۔

حسین اور اُن کی بیوی لینڈا نے چند سال قبل خاندان نہٹور کی اپنی شاخ کے پاکستان انخلاء کے بارے میں ایک ناول بعنوان ''ریفیوجی'' لکھا تھا۔ جو نیویارک سے چھپا۔ برِصغیر کے مسلم معاشرے کے متعلق پہلا ناول تھا۔ نہایت عمدہ ریویو ہوئے۔ لینڈا کے والد مسٹر فیلڈمَین نیویارک کے ایک معروف وکیل تھے۔ چند روز قبل انتقال ہُوا تھا۔ مسز فیلڈ مین کمرے میں آئیں۔ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی (امریکن یہودی عموماً خوش شکل ہوتے ہیں۔) ہم لوگوں نے تعزیت کی۔ اچانک لینڈا نے مجھ سے کہا ''میرے والد نہٹور میں دفن ہیں۔''

''نہٹور میں۔؟'' مَیں نے تعجب سے دہرایا۔

''وہ ڈپریشن میں مبتلا تھے۔ چُپ سی لگ گئی تھی۔ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے حسین ان کو دِلی لے گئے۔ شعر کا میں ٹھہرے۔ وہاں پہلی مرتبہ والد نے خوش ہو کر چاروں طرف دیکھا اور مہینوں بعد پہلی مرتبہ بات کی۔ کہنے لگے۔

''یہ ہوٹل مجھے بہت پسند آیا۔ کیا مَیں اسے سِلویا کے لئے خریدلوں؟'' ___ سِلویا میری اماں کا نام ہے۔ پھر چُپ سادھ لی۔ چند روز بعد حسین ان کو نہٹور لے گئے چچا شمیم حسین زیدی کے ہاں ٹھہرے۔ سارا محلہ جمع ہو گیا۔ سارے رشتہ داران کی تیمارداری میں لگ گئے۔''

اب حسین بولا۔ ''مسٹر فیلڈمَین کے لئے اس نوعیت کا اجتماعی خلوص اور مہمان نوازی انوکھی چیز تھی رات کو ان کا پلنگ صحن میں بچھایا گیا۔ تاروں بھرا آسمان بھی اس قسم کا پہلے نہ دیکھا تھا۔ چُپ رہے اتنا بولے کہ ان ستاروں سے فرشتے اُتر رہے ہیں۔ تیسرے دن انتقال کیا۔''

''کفن دفن کے لئے کیا کیا؟۔'' مَیں نے پوچھا۔

لنڈا نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک مولوی صاحب نے قرآن شریف کی حضرت موسیٰ ؑ

کے متعلق چند آیات پڑھ دی تھیں۔ لیکن حسینی اسی وقت آپا حمن سے کہہ رہا تھا'' ربائی وہاں کہاں سے ملتا۔ مَیں نے ایک کیتھولک پادری دارجلنگ سے ہَوائی جہاز پر منگوایا۔''

حسین کی عادت ہمیشہ سے گپ ٹھونکنے کی ہے۔ مَیں نے اس سے یہ نہ کہا کہ نزدیک کے قصبے تاجپور یا توے میل دُور دلّی سے کوئی پادری آ سکتا تھا جو عہد نامۂ قدیم پڑھ دیتا۔ دارجلنگ سے کیوں بلوایا گیا۔ مگر کوئی ایسی گپ چھوڑتے وقت حسین کو ٹوکنے سے اس کے اسٹائل میں فرق آ جاتا ہے۔

''مسٹر فیلڈمَین کی موت کی خبر سُن کر امریکن سفیر دلّی سے تعزیت کے لئے نہٹور آنا چاہتے تھے۔ مگر مَیں اسی روز دلّی واپس آ گیا۔ مسٹر فیلڈمَین کو اپنے دادا جان کے مزار کے پہلو میں سپردِ خاک کیا ہے۔'' حسین نے بات ختم کی۔

ہم سب چپ ہو گئے۔ موت زندگی کی طرح ناقابلِ یقین ہے۔

ہم لوگ نیویارک سے باہر وائٹ پلینز میں ہولی ڈے اِن میں ٹھہرے تھے۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب سنسان ہارلم میں سے گذر رہے تھے۔'' یہ تو بہت خطرناک جگہ ہے۔'' مَیں نے گھبرا کر کہا۔

''وہ دیکھئے وہ سامنے جو پُراسرار آدمی جا رہا ہے وہ ضرور مافیا کا ہے۔'' متّن نے ڈرانا شروع کیا۔

''اور وہ لڑکی دراصل خفیہ ایجنٹ۔'' جیری بولے۔'' وہ ریستوران کے دروازے میں جو لوگ کھڑے ہیں، وہ لگتا ہے ابھی گولیاں چلا دیں گے۔''

نیویارک خطرناک ہے۔ اقتصادی سماجیاتی وجوہ کی بنا پر۔ زیادہ تر جرائم پیشہ یا کالے ہیں یا ہسپانک ہارلم کے کالے سیلمز میں رہنے والے کالے، ادیب، مغنی، موسیقار، مقبول ٹی وی فنکار، نیوز کاسٹرز، افریقہ میں اپنی جڑیں تلاش کرنے والے مغرور کالے دانشور۔ (امریکن حبشی اب اپنے آپ کو بلیک کہلواتے ہیں، کہ لفظ نیگرو میں تحقیر کا رویّہ مضمر ہے) اس گوری دُنیا کے پہلو بہ پہلو مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دُنیا موجود ہے جس کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔

نادیا، لیلیٰ، فاطمہ

جب آپا حمن ۔منن اور جیری لاگاردیا پر ایکسرے والے دروازے کے اِدھر کھڑے رہ گئے اور مَیں براہِ شکاگو اور سیڈرر۔پڈز آیوواسٹی سے فلاور اپارٹمنٹس چوتھی منزل پر اپنے گھر واپس پہنچی۔ باورچی خانے سے ایک سقف شگاف قہقہے کی آواز آئی ۔مَیں دروازہ کھول کر اندر گئی۔ایک اجنبی کالی لڑکی دیونی کی دیونی میز پر بیٹھی بے تحاشا ہنس رہی تھی ا۔ نادیا کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔

''ہلو۔مَیں فاطمہ ڈیکے ہوں۔جنوبی افریقہ سے آئی ہوئی ہوں۔اتنے دنوں بعد پہنچی کیوں کہ پاسپورٹ مشکل سے بنا (قہقہہ) راستے میں نیویارک ٹِک گئی تھی۔''

''فاطمہ کا پلے وہاں ___ DEF BROADWAY پروڈیوس ہونے والا ہے۔'' نادیا نے کہا۔

''اور یہ اپنے ملک سے پہلی بار باہر آئی ہے۔'' فاطمہ نے ایک زبردست قہقہہ لگایا ___ ''اگر تم نے نیویارک کے ٹائمنر اسکوائر میں رات کے دو بجے ایک کالی لڑکی کو نشے میں آؤٹ تنہا چوراہے پر گھومتے ہوئے دیکھا ہوگا تو وہ مَیں ہی تھی۔'' فاطمہ نے کہا۔

''ٹائمنر اسکوائر میں آدھی رات کو تنہا ___ '' مَیں نے حیرت سے دہرایا۔'' تم کو ڈر نہیں لگا؟ ___ ''

''ڈر؟ ___ مَیں جنوبی افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ مجھے کاہے کا ڈر۔ ہم سخت جان

لوگ ہیں۔میرا ایک بھائی جیل میں ہے۔ایک مارا جا چکا ہے۔چھری پیٹی میں رکھ کر نکلتی رہی ہوں۔مَیں سارے نشے کر چکی ہوں ابھی رائل کورٹ لندن میں میرا ایک ڈرامہ پروڈیوس ہونے والا ہے تم د تو متمدّن خواتین زندگی کے حقائق کے متعلق کیا جانو۔اور یوروپ کی نستعلیق لیلیٰ اربل میری پڑوسی ہے وہ مجھے سمجھ ہی نہیں پاتی۔شاید تم بھی مجھے وحشی تصور کرو۔'' ایک اور قہقہہ ـــــ اچانک کھڑے ہوکر ایک مکالمہ شروع کر دیا۔پھر قہقہہ لگایا۔'' یہ میرے ایک ڈرامے کا حصّہ ہے۔مَیں اپنے ڈراموں میں خود ایکٹنگ کرتی ہوں۔'' ایک اور قہقہہ۔جیسے وہ ساری دُنیا کو چیلنج اور ڈیفائی کر رہی ہو۔صبح کو لیلیٰ اربل بولی۔'' میں بہت ہراساں نظر آئی۔

'' فاطمہ عجیب بے تکی لڑکی ہے۔کچن میں طوفان بدتمیزی پھیلا رکھا ہے۔رات کے دو دو بجے شہر سے لوٹ کر آتی ہے۔پھر زور زور سے فون پر باتیں کرتی ہے۔اونچے قہقہے لگاتی ہے۔میرے اعصاب پر اثر ہو رہا ہے۔''

میرے اور نادیا کے باورچی خانے کی طرح لیلیٰ اور فاطمہ کا باورچی خانہ مشترکہ تھا۔لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی بے حد غلط پڑوسنیں تھیں۔نیم یورپین لیلیٰ پُرسکون خاموش ثقہ۔فاطمہ جنوبی افریقہ کی ایک طوفانی مسلم چائیلڈ۔لیلیٰ جتنی حسین تھیں، فاطمہ پیٹ بھر کر اتنی ہی بدصورت، قدآور، فربہ، تقریباً گُھٹا ہُوا سر (امریکن کالی لڑکیاں بھی آج کل اپنا سر منڈوا رہی ہیں) موٹے شیشوں کی عینک، تنگ جینز میں ملبوس پہاڑ کی پہاڑ ـــــ اور بے حد پُرخلوص اور فطری۔چند روز میں لیلیٰ فاطمہ کی ہنگامہ خیز موجودگی کی عادی ہوگئیں۔مذہباً فاطمہ عیسائی تھی۔

''میری ماں نے اپنی ایک مسلمان درزن دوست کے نام پر میرا نام رکھا تھا۔مَیں کبھی کبھی گرجا ہو آتی ہوں۔'' اس شام اس نے ہمارے کچن میں آکر دہاڑنا شروع کیا۔'' تم اور نادیا میرے لئے مصری اور ہندوستانی کھانے تیار کرو۔ورنہ مَیں تم دونوں کو کھیاں بنادوں گی۔'' مَیں افریقہ کی جادوگرنی ہوں۔میرا پردادا عیسائی ہونے سے پہلے اپنے قبیلے کا خوفناک ساحر تھا۔پلاؤ تیار کرو ورنہ مَیں ابھی اپنا دوڈو چلاتی ہوں۔''

''مَیں فراعنہ کی اولاد ہوں۔سحر تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔مَیں پہلے تم کو

مچھر نہیں بنادوں گی۔'' نادیا نے جواب دیا۔

''اور تم بھولتی ہو کہ مَیں اس سے قبل تم دونوں کو کوّے بنا کر خود بذریعہ انڈین یوروپ ٹرک غائب۔'' مَیں نے کہا ___ اسی وقت چودھری محمد نعیم کا شکاگو سے فون آیا ___ ''کل صبح ___ ''انہوں نے کہا ___ ''ایرپورٹ پر جان ہنسن صاحب آپ کو موجود ملیں گے۔''

اندر کچن میں فاطمہ نے میز پر مکّہ مارا۔اور چلاّئی'' انڈین روپ ٹرک غائب۔''

''معاف کیجئے گا ___ '' مَیں نے چودھری صاحب سے کہا ___ ''وہ دراصل مصر اور جنوبی افریقہ کی ادیب خواتین ذرا اس وقت چند اہم ادبی مسائل پر مصروفِ گفتگو ہیں ___ ''

ہاہاہا۔ہوہوہو۔فاطمہ دہاڑا کی۔

☆

ہواؤں کا شہر

چودھری محمد نعیم صدر شعبہ اُردو نے شعبہ جنوبی ایشیائی علوم یونیورسٹی آف شکاگو کی طرف سے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر نادیا بشائی برائے سیر و تفریح ہمراہ چلیں۔ شکاگو اوہئیر کے صدر دروازے سے نکل کر نوعمر جان ہینسن صاحب (موصوف بھی آگ کا دریا پر مضمون لکھ چکے تھے۔) نہایت فصیح و بلیغ شستہ بامحاورہ اُردو صحیح لہجے میں بولتے جھیل مشی گن کے کنارے کنارے ہوٹل ونڈ میر کی طرف چلے۔

شکاگو کہ مستقل تیز ہواؤں کی زد میں رہتا ہے۔ پچھلی صدی میں اسکائی اسکریپر سب سے پہلے یہیں تعمیر ہوئے۔

''محض شکاگو میں چھ یونیورسٹیاں۔ اس ملک ہی میں ہر چیز بے تحاشا ہے —'' نادیا نے اظہارِ خیال کیا۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے کیمپس کے نزدیک پرانی وضع کے ونڈ میر ہوٹل میں میرے دریچے کے سامنے جنگل تھا جس میں صبح سویرے ایک خاتون ایک مختصر سے سفید کتے کی زنجیر سنبھالے ہوا خوری کرتی گذرتی تھی۔ صبح صبح ہوٹل کے اندر چھ سات بوڑھی عورتیں ہیروں سے لدی، میک اَپ کیئے دستانے پہنے برق رفتار لفٹ سے اُتر کر نیچے لوبی میں صوفوں پر بیٹھ جاتیں اور سامنے سے گذرنے والوں کو گڈ مارننگ کہتیں۔ اس اُمید پر کہ کوئی دومنٹ رُک کر ان سے بات کرے گا۔ وہ سب دولتمند بیوائیں تھیں جن کی اولاد حسبِ قاعدہ ان کو اپنے ساتھ

نہیں رکھتی یا لاوارث تھیں۔ ان میں سے ایک ضعیفہ جس کی وہیل چئیر اس کی طویل القامت لیڈی کمپینین دھکیلتی تھی۔ یہ لڑکی شکلاً یہودی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ ضعیفہ لاوارث تھی تو یقیناً اس لڑکی کے نام اپنی دولت چھوڑ جائے گی۔

یہ تنہا اُداس بڑھیاں آج سے نصف صدی قبل جوان لڑکیاں رہی ہوں گی۔ اپنے شوہروں یا دوستوں کے ساتھ لگژری لائنرز پر یورپ کی سیاحت کے لئے جاتی ہوں گی۔ آج کوئی بات کرنے کا روادار نہیں۔ تفریح گاہوں میں اُن کی جگہ اَوروں نے لے لی۔

شکاگو میں اَن گنت تھیٹر ہیں۔ اوپیرا، بیلے، میوزیم۔ امریکہ کا اہم ادبی اور تہذیبی مرکز ہے۔ مشہور زمانہ میوزیم کے سامنے طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ پیرس سے تو لوس لاترک کی نمائش آئی ہوئی تھی۔ یہی فن پرست شہر ڈاکوؤں کا اڈہ بھی ہے۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے مشہور عالم انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل آرٹ کے اندر اشوریہ اور مصرِ قدیم کے ایوانوں میں اُستانیاں طلباء کی ٹولیوں کو لیکچر دیتی پھر رہی تھیں۔ مصر کی ہر اچھی چیز کا رشتہ نادیا عہدِ فراعنہ سے جوڑتی ہے۔ ہمارے ہاں بات بے بات اشوک یا شاہجہاں یا اورنگ زیب یا شِواجی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں کافی نعم البدل ہے۔ کوئی انگریز یا جرمن یا اطالوی اُچھل اُچھل کر شیکسپئیر اور گوئٹے اور مائیکل اینجلو کے گُن نہیں گاتا۔ ہم کالی داس، ٹیگور، غالب کا وظیفہ کرتے کرتے بے حال ہوئے جاتے ہیں۔ بھوکوں مر رہے ہیں، حالات بَد سے بَدتر ہوتے جا رہے ہیں مگر اپنی کلچر کا راگ الاپنے سے باز نہیں آتے۔ ایک امریکن نے حال میں ایک خاصا جلا کٹا مضمون لکھا۔ اس نے تیسری دُنیا کو ZOO NATION کہا تھا جن کی خصوصیات ''تاریخ، تہذیب اور گھریلو صنعتیں ہیں۔ اور جو اقتصادی طور پر اتنی پس ماندہ ہیں کہ مغرب کی سطح تک پہنچنے مںِ ان کو سو سال لگیں گے اور اس وقت تک مغرب مزید ایک سو سال آگے نکل چکا ہوگا۔

اور دُنیا کی بلند ترین عمارت ایک سو چھ منزلہ سیرز ٹاورز میں جٹ لفٹ نے ایک منٹ کے اندر آخری منزل تک پہنچایا جہاں سے جگمگاتا شکاگو ایک فنٹاسٹک اور منفرد نظارہ تھا۔ اور سیلے بوائے کی بلند عمارت کے اوپر سرچ لائٹ گھوم رہی تھی۔ مبادا کوئی طیارہ عمارت سے ٹکرا نہ جائے۔ یوحنان نے اپنے مکاشفے شہر بابل کو بھی دیکھا تھا۔

چودھری محمد نعیم کہ پارتے اور منّن کی طرح عرصہ دراز تک امریکہ میں مقیم رہنے کی وجہ سے صالح مغربی رویئے اختیار کر چکے تھے۔ اور فضولیات، خرافات، تضیعِ اوقات اور بیوقوفوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک شام جب تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوٹل ونڈمیر کے نزدیک ساؤتھ ہائیڈ پارک میں واقع اپنے وسیع اپارٹمنٹ کے کھانے کے کمرے کی میز پر رکابیاں سجاتے ہوئے اُنہوں نے مطلع کیا کہ ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی قسم کا موضوع یہاں یونیورسٹی آف نیویارک کے ایک امریکن ماہرِ عمرانیات نے منتخب کیا ہے۔ وہ شمالی ہند کے مسلمان گھرانوں کے شجروں اور شادیوں کے نٹ ورک پر کام کر رہے ہیں۔

دِلّی کے کائستھوں کے نٹ ورک کی ایک رُکن یعنی میری دوستوں شانت اور اوم بہادر کی کزن کرونا بہادر عرصہ دس سال سے شکاگو میں بطورِ ماہرِ نفسیات ملازمت کر رہی تھی۔ میز پر اپنے مقابل میں بیٹھی نادیا بشائی سے کہہ رہی تھی۔

''یہاں چرچ اور فیملی لائف کا بریک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ ماں باپ اور پادری کی جگہ اب ہندوستانی سوالی لے رہے ہیں۔ یہاں بھی اور سارے مغربی یورپ میں۔ اس کے برعکس یہاں بس جانے والے ہندوستانیوں پاکستانیوں کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ اُن کی لڑکیاں جو یہیں پیدا ہوئیں یا پروان چڑھیں ان کو ہندوستانی یا پاکستانی اخلاقیات پر قائم رہنے کے لئے کس طرح مجبور کریں۔''

''یہ مسئلہ انگلستان کے براؤن مہاجرین کے سامنے بھی ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''PILL کی ایجاد کے ساتھ یہاں ایسی جنسی آزادی آئی ہے جو دس پندرہ سال قبل یہاں بھی موجود نہیں تھی۔ میرے امریکن دوست متعجب رہتے ہیں کہ میں DATING ___ کیوں نہیں کرتی اور جب مَیں ان سے کہتی ہوں کہ یہ ہماری تہذیب اور طرزِ زندگی کے منافی ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''یہ تمہارے پرانے کائستھ تہذیبی NET WORK کا اثر ہے۔ ورنہ DATING تو اب ہندوستان میں بھی رائج ہو چکی ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''ہاں مگر مَیں پچھلی نسل سے تعلق رکھتی ہوں۔'' کماری کرونا نے جواب دیا۔

آنسہ نادیا نے سر ہلایا ''مَیں تمہاری صورتِ حال سمجھتی ہوں کیوں کہ میں بھی مغربی

تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک مصری قدامت پرست روایات وتمدن کی پروردہ ہوں۔''

باہر بارش کے ساتھ تیز ہوا چل رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کرونا بہادر اُٹھ کر گیلری میں گئی دروازہ کھولا۔ چند گورے امریکن بچے نقلی چہرے لگائے کھڑے تھے۔ چودھری نعیم نے ٹافیوں کے ڈھیر دروازے کے قریب پہلے سے رکھ دیئے تھے۔ کرونا نے بچوں کو ٹافیاں دیں اور وہ واپس آ گئے۔ وہ ہیلوا ین تھی۔ ALL SOULS DAY کی مقدس شام۔ ایک قسم کی مسیحی شبِ برات۔ جب تمام عیسائی مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ آدھے کدّو پر بھتنوں کی شکلیں بنا کر کدّو کی شکلیں بنائی جاتی ہیں اور ان شکلوں کے اندر شمع جلائی جاتی ہے اور وہ کدّو دریچوں میں رکھ دیئے جاتے ہیں بچے بھتنوں کے مصنوعی چہرے لگا کر گھر گھر جاتے ہیں اور مٹھائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

''شکر ہے کہ کچھ پُرانی روایات تو ابھی یہاں بھی باقی ہیں۔'' نادیا نے کہا۔

دروازے کی گھنٹی پھر بجی کرونا نے جا کر ٹافی دی اور واپس آئی۔

''چاند اور زہرہ کی طرف جانے والے راکٹوں میں شمعیں جلا کر یہ آدھے کدّو رکھ دیئے جائیں تو کیسا رہے۔'' مَیں نے کہا۔

صبح سویرے نادیا قبطیہ آیوواسٹی واپس گئی اور چودھری نعیم اپنی اودھی مسلمان روح کے ساتھ اور راما نجن اپنی تامل روح کے ساتھ شکاگو میں رہتے ہیں۔ دونوں بزبان انگریزی اپنی نثر و نظم لکھتے ہیں۔ اور چودھری نعیم سے ایک آسٹریلین اُردو پڑھ رہا ہے۔

ایک شام ہم لوگ مع آسٹریلین میڈلن روانہ ہوئے۔ چودھری صاحب شکاگو پیچھے چھوڑ کر فری وے پر آئے۔ شہر کی عمارتیں جورات کو منوّر سنگلاخ پہاڑ معلوم ہوتی تھیں پیچھے رہ گئیں۔

راستے میں ایک ریسٹوران میں مَیں نے اِس بندۂ خدا سے جو اُردو پڑھنے آسٹریلیا سے شکاگو آیا تھا، دریافت کیا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟___''

''میر انیس۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا___ ''سوال یہ ہے کہ اگر ہم لوگ شیکسپئر سمجھ سکتے ہیں تو وہ آسٹریلین میر انیس کیوں نہیں سمجھ سکتا۔

گو شب برات اور ہیلوا ین میں بڑا فرق ہے۔

☆

دُور کی بانسری کے سُر

اور شکاگو سے دو سو میل دُور شمالی ریاست وِس کون سن کے شہر میڈیسن میں ڈاکٹر محمد عمر میمن کے گھر پر رات کے وقت جب ہم لوگ پہنچے تو وہاں ڈیوک یونیورسٹی کے پروفیسر بروس لارنس کو برطانیہ کے مستشرق سائمن ڈگی کے ساتھ کشف المحجوب پر تبادلۂ خیالات کرتے پایا۔ معقول۔ پروفیسر لارنس نے خواجگان چشت پر کتاب بعنوان ___ NOTES FROM A DISTANT FLUTE لکھی تھی جسے "زیرِ سرپرستی ایمپرس فرح پہلوی ایمپیریل ایرانین اکیڈیمی آف فلاسفی ___" (جس کے ڈائریکٹر سیّد حسین نظر تھے) نے ۱۹۷۸ء میں طہران سے شائع کیا تھا۔ ایک سال بعد ۲؍نومبر ۱۹۷۹ء کی اس رات وہ ایمپریس بحیثیت ایک جلاوطن بیوی اپنے بے تخت و تاج شوہر کے علاج کے لئے نیویارک کے ایک ہسپتال میں مقیم تھیں۔ اور صرف دو دن بعد طہران میں امریکن یرغمالیوں کا دھماکہ ہونے والا تھا۔

تو کیا خواجگان چشت بے ثباتی ثروت و جاہ کے ان معاملات کو بہت پہلے پہچان چکے تھے۔

دوسری کتاب پروفیسر لارنس کی صوفیائے بیجاپور تھی۔ اور اُن کے بے حد ذہین اور شگفتہ فراخ میزبان محمد عمر میمن کی ضخیم کتاب ابنِ قیمہ پر ہالینڈ سے چھپ کر آ گئی تھی۔ اور ابن قیمہ صوفیا کے شدید مخالف تھے۔

بانسری کے مختلف سُر

یونیورسٹی آف وِس کون سَن میں ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی آٹھویں سالانہ کانفرنس منعقد ہورہی تھی جس کے لئے کئی سو مستشرق انڈولوجسٹ ماہر اسلامیات و عمرانیات و لسانیات وغیرہ وغیرہ سارے شمالی امریکہ اور برطانیہ سے آیا تھا اور آئی تھی۔ بوڑھے پھونس پروفیسر پرسیول اسپیرز اور مس میری تھیچر انگلستان سے تشریف لائی تھیں۔ مس تھیچر نے راج کے زمانے میں انگریز سویلین اور فوجی افسروں وغیرہ کی کھینچی ہوئی بہت پرانی ہوم مُوویز کو جوڑ کر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی تھی۔ راج کی برٹش کولونیل معاشرتی زندگی کی جھلکیاں جو خالص راقم الحروف کا موضوع تھا۔ ''برٹش فِکشن میں انڈین اسٹریوٹائپ۔'' اور انڈین فِکشن میں برٹش اسٹریوٹائپ۔ اور'' انڈین فکشن میں برٹش اسٹریوٹائپ'' کے سیمینار میں یونیورسٹی آف مسوری کی میری لاگو نے ای ایم فورسٹر، کولمبیا کے ڈاکٹر ووبن لوئیس نے

LEARNING HOW TO RULE AN EMPIRE,

STEREOTYPES IN VICTORIAN BOYS,

LITERATURE ____

یہ مقالے پیش کئے اور ناچیز نے'' آخرِ شب کے ہمسفر'' میں سے'' چارلس بارلو بنگال سویلین'' والا باب تلخیص و ترجمہ کر کے پڑھا۔

اسلامی سوانح عمریوں اور ملفوظات کے سیمینار میں بروس لارنس نے فوائد الفواد سیر الاولیاء وغیرہ، یونیورسٹی آف ورجینیا کے پروفیسر رچرڈ بارنٹ نے نواب شجاع الدولہ کی اٹھارہویں صدی کی سوانح عمریوں اور ڈیوک یونیورسٹی کے ڈاکٹر معظم صدیقی نے چہار عنصر اور دوسری کتابوں میں مرزا بیدل کی سوانح حیات پر مقالے پڑھے۔ سامعین و شرکاء لاؤنج میں صبح کو جمع ہو کر اَن گنت سیمناروں میں سے اپنی پسند کا موضوع چُن لیتے۔

تاریخ دہلی کے سیمینار میں نئی دہلی کی تعمیر پر جو صاحب بولے وہ ڈاکٹر سبھاس چکرورتی نکلے۔ جن کی کتاب FROM OX US TO KHYBER پر مَیں نے دو سال قبل ٹائمز آف انڈیا میں ریویو آرٹیکل لکھا تھا۔ اوکسفرڈ کے پروفیسر یمن ڈگبی (لمبی داڑھی۔ خود بھی صوفی منش) خواجگان چشت کے شجرات خلفاء پر اپنا مقالہ لے کر ایک شام محمد

عمر میمن کے گھر آئے۔ کارِ جہاں دراز جلد اوّل پیانو پر رکھی تھی۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک فٹ نوٹ پر ٹھٹھک کر نوعمر ڈاکٹر رچرڈ بارنٹ نے مجھ سے کہا" کمال الدین حیدر رامپور کے نقطۂ نظر سے لکھتا تھا۔" اور پھر صفحات پلٹنے لگا۔

ڈنر کے دوران میری ٹیچر کی ڈوکومنٹری فلم کا ذکر نکلا۔ وہ فلم خود میرے لئے بہت نوسٹلیجک تھی۔ کیمپ لائف سول لائنز کلب۔ سرکٹ ہاؤس، پہاڑ پر جانا، ہاتھیوں پر سواری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب میرے اپنے بچپن کے مناظر تھے۔ اور کیا پتہ یہ دُھندلی ہوم مویز جو اُن" بڑے صاحب لوگوں" نے کھینچیں ان میں سے چند بچپن کی وہی مانوس ہستیاں رہی ہوں۔ میجر گیریڈ، مسٹر یندر سول، مسٹر ڈی پی ہارڈی، میری ٹیچر، بتا رہی تھیں کہ اس فلم کی تیاری کے لئے اُنہوں نے بہت پاپڑ بیلے۔ انڈین سول سروس والے بڈھے مرکھپ گئے۔ ان کے ورثاء کو ڈھونڈا۔ ان لوگوں نے اپنے مکانوں کی پرچھتیوں میں جمع کاٹھ کباڑ میں سے یہ دھندلی ہوم مووِیز نکال کر دیں۔"

مَیں نے کہا" شاید اسی وجہ سے آپ کا چارلس بارلو بنگال سویلین اس فلم کا ایک حصہ معلوم ہوا" کسی نے اظہارِ خیال کیا۔ آج کل انگلستان میں راج کا نوسٹلجیا زوروں میں جا رہا ہے اور غدر کے متعلق اس زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں کی بڑی مانگ ہے۔"

پروفیسر سائمن ڈگبی زُلفیں جھٹکار کر بولے" موصوف یقیناً کہیں سجادہ نشینی کر سکتے ہیں ـــــ"

" ہمارے ہاں ایک اُدھ جلی کتاب تھی۔ مریم دی اسٹوری آف دی میوٹنی۔ جو شاید غدر کے دو تین سال بعد چھپی تھی۔ یہ کتاب میرے پردادا امیر احمد علی کے بچے کھچے ذخیرۂ کتب میں پڑی ملی تھی۔ ناول تھا۔ مریم۔ انگریز یا ہندوستانی ہیروئن کا نام رکھا ہوگا۔ نیلے رنگ کی جلد تھی۔ ناول کے آخر میں شاہ نعمت اللہ ولی کی طویل نظم کا انگریزی ترجمہ شامل تھا۔ اس میں لکھا تھا یوں مغل سلطنت قائم ہوگی وغیرہ اور یہ کہ فلاں زمانے میں پنجاب میں خون کا چھٹا دریا بہے گا۔ ۷۴ء کے ہنگامے میں وہ آدھ جلی کتاب شاید پوری جل گئی۔ مَیں نے اس کا نام کسی کیٹلاگ میں بھی نہیں دیکھا۔"

فوئیرز کے ہاں تلاش کیجئے گا۔" مَیں نے مولانا سائمن ڈگبی سے کہا۔

''اس قسم کی نظمیں الحاق ہوتی ہیں۔'' محمد عمر میمن نے کہا۔ سکھوں کی جنم ساکھیوں کی طرح جس میں زار روس وغیرہ کے متعلق پیش گوئی موجود ہے۔''

''درست''___ مَیں نے جواب دیا۔

''۱۷ء میں بنارس سرکٹ ہاؤس کے مسلمان خانساماں نے مجھ سے کہا تھا بیٹا آج کل یہاں مسلمان محلّوں میں شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئی کا بڑا چرچا ہے۔ وہ بتا گئے تھے کہ مشرقی پاکستان میں یہ سب ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کسی بھی کرائسس کے موقع پر عوام کے ہاں شاہ نعمت اللہ ولی اچانک کیوں نمودار ہو جاتے ہیں۔ بڑی ڈراؤنی بات ہے۔''

ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہوئیں۔ طہران کے امریکن سفارت خانے میں ترپن امریکنوں کو بطور یرغمال محبوس کر دیا گیا۔

ہر چینل پر تہلکہ مچا ہوا تھا۔ وہ ۴ر نومبر کی رات تھی۔ ''بڑی ڈراؤنی بات ہے۔'' مَیں نے دہرایا۔

''کاش وہ ادھ جلی نیلی کتاب پوری نہ جلتی۔

محمد عمر میمن کی خاموش طبع پرسکون جاپانی بیوی نے اپنے بچوں کو کھانے کے لئے بلایا ___

''کیا آپ واقعی ان سب نا قابلِ اعتبار ہوائی باتوں میں یقین رکھتی ہیں؟___'' ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

''ایک طرف محمد عمر میمن کے عقلیت پرست ابنِ قیمّہ ہیں اور دوسری طرف افسانوی شاہ نعمت اللہ ولی اور اُن کا سارا قبیلہ۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مَیں ہمیشہ شاہ نعمت اللہ ہی کو ترجیح دوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

موسمِ سرما شروع ہو رہا تھا۔ آیوواسٹی میں بھی درخت اپنے سُرخ اور زرد اور عُنابی پتے تیزی سے گرا رہے تھے۔ انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام کے لئے مشہور امریکن ادیبوں کی آمدورفت جاری تھی۔ جوزف ہلر ا اسنوڈ گراس ، لوئیس سمپسن ، ہورٹینس کیلی شر، کرٹس بارنیک، کالا ناولسٹ ، اشاعیل ریڈ، امریکہ یہودی اور کالے ادیب بہت زیادہ قابلِ ذکر

چیزیں لکھ رہے تھے۔ کیلی شر اور جوزف ہلر دونوں یہودی تھے۔ ایک روسی ناولسٹ سوویت یونین سے آئے تھے۔ جن دنوں مَیں ورمونٹ گئی ہوئی تھی وہ ے فلاور میں مع ترجمان ہفتہ بھر ٹھہرے۔ یونیورسٹی میں ان لوگوں کے لئے لیکچر ہوئے اور پروفیسروں کے ہاں دعوتیں اور ادبی محفلیں۔

آیوواسٹی ''ادیبوں کا چوراہا'' کہلاتی ہے۔ مقامی ادبی محفلیں کیمپس پر عموماً جمز بک اسٹور اور ویٹ بار میں منعقد ہوئی تھیں جہاں لوگ باگ اپنے افسانے پڑھتے یا کلام سناتے اور اس پر بحثا بحثی ہوتی لیکن نہایت تہذیب کے ساتھ گھٹیا ریمارک ذاتی حملے فقرے چھینٹے جلی کٹی گفتگو ان لوگوں کا شیوہ نہیں۔ کیوں کہ ان کو وہ ذاتی فرسٹریشن نہیں جو تیسری دُنیا کے محروم و مفلس ادیبوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ مغربی ادیب ایک SUPER AEELUENT ٹیکنولوجیکل معاشرے کے پیدا کردہ مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ تیسری دنیا کا ایک لیکھک جب اس معاشرے میں شامل ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔؟

یاسمین مغل کے مڈل کلاس کونی مسلمان والدین رتنا گیری کے باشندے ہیں۔ وہ خود آج سے گیارہ بارہ سال قبل ایک اسکالرشپ حاصل کر کے بمبئی سے امریکہ گئی۔ وہاں ایک کالے سے شادی کر لی۔ شادی ناکام رہی۔ دوسری شادی ایک انڈین مسلم انجینئر سے کی کیلی فورنیا میں رہتا ہے۔ سال بھر سے وہ رائٹرز ورکشاپ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کرنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کی دعوتوں میں یاسمین ایک بونے انگریز شاعر کرس کے ساتھ اکثر آتی رہتی تھی۔ ایک شام پیٹر اور میری ناضرۃ کے گھر پر اس نے مجھ سے کہا'' مَیں تم کو اپنا ناول دکھانا چاہتی ہوں جو مَیں لکھ رہی ہوں، اور تمہاری رائے چاہتی ہوں۔''

''رائٹرز ورکشاپ میں تم لوگ کیا کرتے ہو؟۔'' مَیں نے پوچھا۔'' لکھنا سکھایا نہیں جا سکتا یہ خداداد صلاحیت ہے۔ امریکن یونیورسٹیوں کے یہ رائٹنگ اور شاعری سکھانے کے ورکشاپ میری سمجھ میں آج تک نہ آئے۔''

''اس خداداد صلاحیت کو سنوارا بھی جا سکتا ہے۔ سُریلی آواز والے لوگ استادوں سے کیوں گانا سیکھتے ہیں؟۔'' یاسمین نے پوچھا۔

''پرفورمنگ آرٹس اور تخلیقی لکھائی میں بہت فرق ہے۔'' مَیں نے جواب دیا۔ ہم

لوگ اپنے افسانے ناولوں کے باب نظمیں لکھ کر ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں، اور ہمارے پروفیسر لکھنا سکھاتے ہیں ____ ٹینسی ولیمز شیورز اور فلپ روتھ سب اسی آیووا رائٹرز ورکشاپ کے تربیت یافتہ ہیں اور ٹینسی ولیمز کا ڈرامہ ____ THE GLASS MENAGERIE یہاں کی کلاس میں مسترد کر دیا گیا تھا۔

مَیں ایک ناول لکھ رہی ہوں۔ ایک مڈل کلاس ہندوستانی مسلمان لڑکی کا مغرب سے ٹکراؤ۔ اس کے جذباتی اور روحانی کرائسس، آٹو بایا گرافیکل ناول ہے۔ تم کم از کم اس کے چند حصے پڑھ کر مجھے مشورے دو۔ اگلے ہفتے میں ویٹ بار میں اس کے چند باب پڑھوں گی۔ کرس اپنی نظمیں سنائے گا۔ مَیں نے انٹرنیشنل رائٹرز پروگرام کے سارے ادیبوں کو مدعو کیا ہے۔

یاسمین کی نصف حبشی چار سالہ بچی نفیسہ آیووا ریویو کے کالے اڈیٹر کی گود میں بیٹھی چہک رہی تھی۔ اِس محل میں زیادہ تر لوگ گورے تھے۔ نادیا مصری، مَیں، پیٹر اور میری ایشیائی لیکن نفیسہ بالکل جبلّی طور پر اس کالے اڈیٹر کی گود میں جا بیٹھی۔

ڈسکو رقص شروع ہُوا۔ وہ بے تکان ناچی۔ یہ بھی اس کے افریقی خون کا اثر تھا۔

پارٹی کے اختتام پر، کرس نے اپنی وہیل چیئر کا رُخ دروازے کی طرف کیا۔ کرسٹفر ایک بونا انگریز شاعر رائٹرز ورکشاپ میں یاسمین کا ہم جماعت تھا۔ برکلے میں پڑھ چکا تھا۔ بلحاظ قد و قامت چار سال کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ پیٹھ پر بڑا سا کوبڑ۔ چلنے پھرنے سے قطعی معذور۔ مُنّے مُنّے ہاتھ اور بے حد مختصر ٹانگیں لیکن حسین چہرہ، سنہری داڑھی اچھا خاصا جیزس کرائسٹ معلوم ہوتا تھا۔ قطعی سیلف کونشس نہیں تھا۔ معذور اپاہج لوگوں کے لئے جو خاص بسیں چلتی تھیں اپنی وہیل چیئر سمیت کسی ایسی بس پر سوار ہو کر خود ہر پارٹی میں پہنچ جاتا تھا۔ قہقہے لگاتا تھا۔ بحثیں کرتا تھا۔ سارے یورپ اور امریکہ کی تنہا سیر کر چکا تھا۔

آیووا سٹی کے اَن گنت ریستوراں طرح طرح سے سجے ہوئے تھے۔ ایک طعام خانہ بادبانی بحری جہاز کے نمونے کا تھا۔ ہم جنس لوگ اور شاعر ادیب ویٹ بار کی سرپرستی کرتے تھے (بیحد آواں گارڈ قسم کے لوگ اکثر ہم جنس تھے۔) ایک کہر آلود شام ویٹ بار کا ایک ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب کرسٹفر نے اپنی نظمیں سنائیں۔ پھر بولا۔

''مَیں نے فارسی غزل کے فارم میں چند غزلیں لکھی ہیں وہ بھی سنو۔'' اور غزل کی تشریح کی۔

یاسمین مغل نے اپنے ناول کے چند ابواب جستہ جستہ پڑھے۔ وہ ایک باصلاحیت اور حسّاس رائٹر تھی جیسا کہ وہ مجھے بتا چکی تھی۔ وہ ناول شفاف بے حد تھی خود نوشت سوانح تھا۔ امریکہ آنے سے قبل ایک متوسط الحال مسلمان لڑکی کا طرزِ حیات باپ بائیکلہ پولیس اسٹیشن کا انچارج۔ وہ خود برقعہ پوش ماں کے ساتھ حاجی علی کی درگاہ پر جایا کرتی ہے۔ مَیں نے ایک لمحے کے لئے اس ماحول کا تصور کیا (جس سے وہ مغربی سامعین بالکل ناواقف تھے اور اُن کے لئے وہ ایک EXOTIC الیکٹرونک ماحول) اور پھر اس اوا گارڈ طعام خانے کے ایک نیم تاریک کمرے کے اسٹیج پر بیٹھی ہوئی بے حد خود اعتمادی اور بے باکی کے ساتھ اپنا ناول سناتی اس نیم امریکن لڑکی پر نظر ڈالی جس نے امریکہ میں جنسی تجربات کا تذکرہ بے حد صفائی سے قلمبند کیا تھا۔ اگر وہ ناول امریکہ میں چھپا ہندوستانی پس منظر کی وجہ سے بالخصوص پسند کیا جائے گا (جنسی بے باکی اب کوئی قابلِ ذکر بات نہیں رہی۔ پچھلے چند سال میں ہر ان کہا رویہ مقفل الماریوں سے نکال کر جھاڑا پونچھا جا چکا ہے۔ وہ لوگ اب اپنی مکمل جنسی آزادی سے بھی اُکتا چکے ہیں۔ مرد اور عورت کا بغیر شادی کے اکٹھے رہنا قبول کیا جا چکا ہے۔ کیمپس پر ہم لوگ دو تین ایسے جوڑوں کے گھروں پر ڈنر کے بلئے جا چکے تھے۔ اس نئے طرزِ زندگی کا اب ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں یاسمین کا ناول بہت مقبول ہوگا۔) چند روز بعد یاسمین نے رائٹرز ورکشاپ کے ڈائریکٹر کے ہاں اپنی سالگرہ کی دعوت کی۔ موصوف کو ان کے شاگرد بھی محض جیک کہہ کر پکار رہے تھے۔ مرغن ہندوستانی کھانا پکایا۔ ڈنر کے بعد رائٹرز ورکشاپ کے لبنانی نژاد پروفیسر وانس بورژیلی (جو ایک معروف مصنّف تھے) وتڈلین بجایا کئے۔ دو پروفیشنل موسیقار رات کے گیارہ بجے اپنے گٹار سنبھالے آن پہنچے۔ ان میں سے بے حد موٹا لڑکا بالکل گلیکسو بے بی معلوم ہوتا تھا۔ جیک کے میوزک رُوم میں ڈسکو شروع ہوا۔ کرس اپنی وہیل چیئر فلور پر لے آیا۔ جوش وخروش سے گاتا رہا۔ اتنے منّے سے پھیپھڑوں سے اسکائی لاک کی طرح اس کی اتنی طاقت ور آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ ناچنا تو کجا کھڑے ہونے سے بھی معذور تھا۔ مگر نہایت جوش اور ولولے سے اپنی وہیل چیئر فلور پر گھما گھما کر گویا رقص میں شامل رہا۔ ''مغربی انسان کی ہمّت اور جوانمردی کی روشن مثال۔'' نادیا نے آہستہ سے

اظہارِ خیال کیا۔ یاسمین اس کی وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ ناچتی رہی۔ وہ گلا پھاڑ کر گایا کیا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے ایک امریکن لڑکی نے پیانو کے پاس جا کر ایک دلدوز گیت اُداسی کے ساتھ گانا شروع کیا۔ کرس اچانک خاموش ہوگیا اور اداسی سے اس کا گیت سُننے لگا۔ کلیگ۔ و بے بی گٹار بجاتا رہا۔ باہر باغ اور خیابان خزاں کے زرد اور عُنابی پتوں سے پٹ چکے تھے۔ دورویہ خوبصورت دو منزلہ مکانوں میں روشنیاں بجھتی جارہی تھیں۔ یاسمین کی بچی نفیسہ بجلی کی طرح ناچنے کے بعد تھک کر سوچکی تھی۔ دیوار کے سہارے بیٹھے پیٹر ناضرۃ نے ماؤتھ آرگن جیب میں ڈالا۔ وہ ماؤتھ آرگن کا ماہر تھا پروفیسر وانس نے اپنا مینڈلین کیس میں بند کیا۔ لڑکی نے گیت ختم کیا۔ ایک لمحے محض ایک لمحے کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ کرس نے اپنی متحرک کرسی دروازے کی جانب موڑی۔ باہر خیاباں کے زرد برقی چراغوں کی روشنی میں پت جھڑ کے کھڑ کھڑاتے سرسراتے فرش رات کی بھٹکتی روحوں کے منتظر تھے۔ دوستوں کے جشن گرتے ہوئے پتے ہیں۔

اسرائیلی رائٹرز اسحٰق اوپاز اور ہالینڈ کی تھیا نے ایک روز انکشاف کیا کہ وہ دونوں ایک دن ایک مہینے اور ایک سن کی پیدائش ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اسحٰق نے یوکرین ____ (سوویٹ روس) اور تھیا نے ہالینڈ میں ایک ہی روز جنم لیا تھا۔ ہم توامن بہن بھائی اپنی سالگرہ اکٹھی منائیں گے۔ تھیا نے اعلان کیا۔ تھیا اور برٹ نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی۔ برٹ ہالینڈ کا نامور مصنف بھی تھا۔ دونوں میاں بیوی بہت بھلے اور خوش طبع لوگ تھے۔ دعوت کی شام ان کے اپارٹمنٹ میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ دونوں کمروں اور باورچی خانے میں بھانت بھانت کی گفتگو ہورہی تھی۔ ہولیوسیز۔ بولو ''مَیں لیبوٹری کا رائٹر نہیں۔''

اسحٰق اوپاز نے گرج کر جواب دیا ''کہرے کے دریا اور آگ کے دریا۔ بیچ میں جو درمیانی راستہ ہے۔ اس پر سے گذرو۔''

جوزف ہلر اچانک دروازے میں نمودار ہوئے CATCH 22 لکھ کر راتوں رات وہ مائرن کی طرح عالمگیر شہرت کے مالک ہوگئے تھے۔ قد آور سر پر سلور گرے جھوا بال۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک، انٹلکچوئیل یہودی شکل۔ انتہائی کامیاب ادیب کی روشن مثال۔

اس وقت مشرقی جرمنی کا کول پاس پیٹر ناضرۃ سے کہہ رہا تھا "مَیں ایک سوشلسٹ ملک سے آیا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ انسانیت کی ترقی کیسی ہونی چاہئے۔ مگر مَیں یہ نہیں کہتا کہ اچھا ادیب ہونے کے لئے لفٹ ہونا ضروری ہے۔ مَیں بائیں بازو کا بھی ہوں اور رائٹر بھی۔ لکھتے ہوئے انسان خود بخود لفٹ ونگ ہو جاتا ہے۔ دنیا کے حالات ہی ایسے ہیں۔"

برازیل کے سیزر نے جواب دیا۔ "ہاں ہمارا دل بھی تو بائیں طرف دھڑکتا ہے۔ اگر تم ایک اچھے ادیب ہو تو تم کو ضرور احساس ہوگا کہ دنیا میں کتنی گڑبڑ ہے اور حالات کو بدلنا چاہئے۔ ادیب اصلی مورخ ہے۔ حکومتیں تاریخ نہیں بناتیں وہ تاریخ کو منجمد کر دیتی ہیں۔" اٰسحٰق اوپاز نے جواب دیا۔

جمیل حسین فلسطینی اس پارٹی میں مدعو نہیں تھا ورنہ وہ اسحٰق کی بات کا جواب دیتا۔ انگریز یہودی رچرڈ (جو یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتا تھا۔) نے اسحٰق کو گھیر لیا۔ "ایک بات بتاؤ اسحٰق۔ تم اسرائیلی اتنی بلندی سے بات کیوں کرتے ہو۔ مَیں ابھی ابھی یونیورسٹی میں تمہارے توپ ادیب ابراہیم یوشوع کا لیکچر سُن کر آرہا ہوں ___ اس قدر بد دماغی۔" اطالیہ کے یہودی آلڈو دونوں سیکولر اعتدال پسند موسوی پنجے جھاڑ کر اسحٰق کے پیچھے پڑ گئے۔ اسحٰق خاصا گھبرایا ہوا چُپکا بیٹھا رہا۔ پولینڈ کا طویل القامت مائیکل پاس سے گذرا۔ ٹھٹھک کر بحث سننے لگا۔ وہ ایک کمیونسٹ ملک اور یوروپ کے عیسائی ورثے کا نمائندہ، یوروپ کے ان تین یہودی دانشوروں کو صیہونیت کے نظریات کے متعلق جھگڑتا سن کر خاموش رہا۔ آگے بڑھ گیا۔ اب یوگوسلاویہ کا ہنس مکھ میتو دی جودانوسکی قریب آیا۔ وہ بھی بحث میں شامل نہیں ہُوا۔ کونے میں فرش پر بیٹھے پیٹر ناضرت نے ماؤتھ آرگن بجانا شروع کر دیا۔ پھر مَیری ناضرت اچانک ایک سواحلی گانا گانے لگی:

"ملانکہ ملانکہ ___"

"وِژن ___ وِژن اصل چیز ہے۔" اسحٰق نے ذرا جوش سے دہرایا۔

جولیس سیزر مارٹن آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اب تک اسحٰق سے صیہونیت کے متعلق جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "ہر رائٹر کے اندر کہیں نہ کہیں ایک یوٹوپیا چھپا ہوتا ہے۔ مستقبل کے متعلق۔"

''اور وہ رائٹر جو ماضی کی طرف دیکھتے ہیں؟''میتو دی نے دریافت کیا۔

''مستقبل ماضی کا خیال دلاتا ہے اور ماضی مستقبل کا۔ ماضی کا حوالہ دیئے بغیر محض حال کے متعلق لکھ کر تم وجودی ادیب نہیں بن سکتے۔''اسحٰق نے جواب دیا۔

تھیا نے ریکارڈ پلیر پر میوزک چلا دی۔ رقص شروع ہو گیا۔ کچن میں جمع لوگ گا رہے تھے۔ برٹ قہقہے لگا رہا تھا۔ اسحٰق نے کچن میں واپس جا کر اسرائیل کا ایک مقبول عبرانی گیت چھیڑا۔ سب کورس میں شامل ہو گئے (غالباً برٹ اور تھیا بھی یہودی تھے) گیت میں حیا۔حیا۔ برابر دہرایا جا رہا تھا۔ یعنی زندگی۔زندگی۔زندگی۔ دوسرے بیڈ روم کی دیوار پر نصب فون کی گھنٹی بجی۔ برٹ اس طرف لپکا۔ کچن میں گانا جاری رہا۔ سارا اپارٹمنٹ موسیقی اور حیا۔حیا۔کی تکرار سے گونج رہا تھا۔ اچانک لیلیٰ اربل باورچی خانے میں آئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔''تھیا ایمسٹرڈیم سے فون آیا ہے۔ برٹ کے والد کا انتقال ہو گیا۔''

سناٹا ___ برٹ فون پر مصروف تھا۔ لیلیٰ بولی برٹ کی بہن ایمسٹرڈیم سے بات کر رہی ہے۔''

تھیا نے متفکر ہو کر مجھ سے کہا''یہاں کے شور اور گانے بجانے کی آواز میری نند کے کانوں میں پہنچ گئی ہوگی۔ وہ کیا سوچے گی۔ میرے سسر وہاں اتنے بیمار پڑے تھے اور مَیں یہاں رنگ رلیاں منا رہی ہوں۔''

نند بھاوج کا مسئلہ عالمی ہے۔

برٹ بات ختم کر کے کچن میں آیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ برٹ میز پر ٹک گیا۔ چند لمحوں بعد بولا''والد نوے سال کے تھے۔ بھرپور زندگی گزاری۔ وہ استاد تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد سارے ہالینڈ میں موجود ہیں ___ انہوں نے ساری عمر اپنا علم دوسروں تک پہنچایا۔ میری بہن کہہ رہی تھی کہ وہ آخر وقت تک ہوش و حواس میں تھے۔ میرے یہاں آنے سے ذرا پہلے بیمار پڑے تھے۔ مجھ سے کہا تم ضرور امریکہ جاؤ۔ اپنے علم اور تجربے میں اضافہ کرنے کا کوئی موقعہ کبھی نہ کھوؤ۔ میری وجہ سے مت رکو۔ میرا کیا ہے مَیں تو اپنی زندگی گزار چکا۔ کل صبح مَیں ان کی تجہیز و تکفین کے لئے ہالینڈ جاؤں گا۔ ہفتہ بھر کے لئے کل شام جیمز بک اسٹور میں مجھے اپنا افسانہ پڑھنا تھا وہ میرے بجائے تھیا پڑھ دے گی۔ "THE SHOW"

MUST GO ON۔

''اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ برٹ۔'' اسحٰق نے کہا۔

''ہرگز نہیں۔ پارٹی جاری رکھو۔ مَیں ذرا لیٹ جاؤں۔'' وہ کچن سے ملحق بیڈروم میں جا کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھیا نے درمیانی دروازہ بند کرنا چاہا۔ برٹ نے کہا ''نہیں۔ دروازہ کھُلا رکھو۔ مَیں تم سب کو تفریح کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

پارٹی رات کے دو بجے تک جاری رہی۔

☆

سوپ اوپیرا

جیمز بک اسٹور میں حسبِ معمول سب لوگ فرش پر بیٹھے کوک، سیون اَپ اور بیئر سے شغل کرر ہے تھے۔ تھیا برٹ کا افسانہ پڑھ رہی تھی۔ انڈونیزیا کے شویندو اور فرانز باچھیں کھلائے ہمہ تن گوش تھے۔ ان دونوں کا برٹ اور تھیا سے سابق آقا اور موجودہ آزاد قوم والا وہی نوسیسٹلجک دوستانہ رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جو ایک عجیب قومی کیمسٹری کے ذریعے انگریزوں اور ہندوستانیوں پاکستانیوں کے درمیان استوار ہے۔ یونان کے آری نے اپنی تازہ نظمیں سنائی۔

ایک بار آری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ ایک غریب موچی تھا۔ وہ اب بھی اپنے ہاتھ سے جوتے بناتا ہے۔ افلاس کی وجہ سے مَیں بارہ سال کی عمر تک اسکول نہیں جا سکا۔" امریکہ کے بارے میں اس کے ری ایکشن ہمیشہ بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ برٹ کے ہالینڈ سے واپس آنے کے بعد ایک روشن اتوار کو ہم لوگ بہت دُور دریا کنارے پکنک کے لئے گئے۔ پولین اور باربیکو چولہے وہاں پہلے سے موجود تھے اور جنگل بیابان میں جا بجا نفیس و نرم پلاسٹک کے استر والے کوڑے کے بند ڈھول۔ پولین کی صفائی دیکھ کر آری نے مجھ سے کہا۔" یہ امریکن یقیناً صبح و شام اسے بھی ویکیوم کلین کرتے ہوں گے۔"

آری یونان کے نیشنل ریڈیو میں کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کافی لوگوں کا تعلق ذرائع ابلاغ سے تھا۔ ناولسٹ اشویندو جکارتہ کے سب سے بڑے اخبار سے منسلک تھا۔

شوانگ پیکنگ فارن لنگوئج پریس کے شعبہ انگریزی تراجم کے نگران اور چینی مصنفین کے ایسوسی ایشن کے غیر ملکی تعلقات کی کمیٹی کے چیف تھے۔ (گویا پیکنگ میں اُن کی وہی حیثیت تھی جو ماسکو میں مریم سالگا نک کی ہے) آئرلینڈ کا ڈرامہ نگار آئرن کیون کیسی آئرش ٹائمز کے لئے لکھتا تھا۔ اسپین کا ناولسٹ سانچیز ایسیر لیسو ٹیلی ویژن اور فلم ڈائریکٹر تھا۔ ہنگرین شاعر مائیکلوس ہرازتی (جس کی ایک کتاب کا دیباچہ ہنرخ بول نے تحریر کیا تھا) اخباروں کے لئے بھی لکھتا تھا۔ مشرقی جرمنی کا افسانہ نگار وولف گانگ کول ہاس فلم اسکرپٹ رائٹر بھی تھا۔ فلپائن کا ہوزے لکایا ماہنامہ ''دی ریویو'' کا ایڈیٹر تھا۔ برازیل کا جولیس سیزر مارٹن شاعر اور ناولسٹ برازیلین ٹیلی ویژن کے ڈرامے لکھتا تھا۔ اسرائیلی ناولسٹ اسحٰق اوپاز جرنلسٹ تھا۔ پولینڈ کے جرزی پرزید کی کا تعلق اسٹیج اور یونیسکو سے تھا۔ مائیکل رونی کریولش اسٹیج اور فلم ڈائریکٹر تھا اور اطالوی ناولسٹ آلدوروزیلی روم کے سب سے اہم ادبی رسالے۔ THE LIVING CHINA کا ایڈیٹر تھا۔ برٹ کا تعلق ہالینڈ میں تھیٹر سے تھا۔ سرخ چین کے شاؤ شن وہاں کے لئے بے حد اہم صحافی تھے۔ بحیثیت اخباری نمائندے دوسری جنگِ عظیم کے دوران لندن میں رہ چکے تھے اور ایڈگر اسنو کے ساتھ مل کر انہوں نے ____ THE LIVING CHINA لکھی تھی۔ جب ساری دنیا کے اتنے سارے ادیب جرنلسٹ اکٹھے ہوں تو ان سے مل کر کسی بھی اخبار والے کو بہترین کاپی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس روز آیوواسٹی کے ایک اخبار کے دو نمائندے اس جنگل میں آن پہنچے۔ کافی خوشگوار جھائیں جھائیں ہوئی۔ جولیو سیزر مارٹن حسبِ معمول دھاڑا۔ ''جرنلسٹ اور رائٹر روزمرہ کے حقیقت سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق مصالحت کا ہے۔ ایک جرنلسٹ اور ایک رائٹر دونوں مثلاً جنگ کے متعلق لکھتے ہیں۔ رائٹر ایک قسم کا سوشل فلٹر ہوتا ہے۔ کل کے اخبار کے لئے لکھنے میں اور تاریخ کو مخاطب کر کے لکھنے میں بہت فرق ہے۔''

اسحٰق او پاز بولا ''جرنلسٹ کے لئے بھی اخلاقی کمٹ منٹ ہوتا ہے۔''

کول ہاس نے کہا۔ ''ساری ادبی تخلیق تجربے اور تخیل پر منحصر ہے۔'' ''ادب بذاتِ خود حقیقت نہ ہو مگر حقیقت رکھتا ہے۔''

پیٹر اور باقی لوگ ندی کنارے جا کر پلاسٹک کا ایک گول چکر ایک دوسرے کی

طرف پھینکنے کے مقبول کھیل میں مصروف ہو گئے ۔ (سائنس کی طرح مَیں اسپورٹس کے معاملے میں بھی بلینک ہوں) آری یونانی تھا اور یونانی بہت عمدہ باورچی ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اس نے بہترین مرغیاں باربیکو کیں ۔

شام کو جب ہم لوگ آیوواسٹی واپس جانے کے لئے گاڑیوں میں بیٹھنے لگے ۔ اولگا ___ حسب معمول دیر لگا رہی تھی ۔

روڈلفو جسے مَیں ہالی وڈ فلموں کا ساؤتھ امریکن فلموں کا ویلن کہہ کر مخاطب کرتی تھی ۔ شروع میں ایک خاتون کے ساتھ وارد ہوا تھا ۔ جسے وہ اپنی بیوی کہتا تھا ۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون غائب ہو گئی اور اس کے چند روز بعد اس کی بے حد حسین اور باوقار بیوی جو انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتی تھی ارجنٹینا سے آن پہنچی ۔ روڈلفو اسی طرح شرارت سے کندھے اُچکا کر مسکراتا رہا ۔ اس وقت وہ نہایت خلوص اور سنجیدگی سے بیوی کو فرکوٹ پہنا کر گاڑیوں کی طرف لا رہا تھا ۔ سورج ندی میں ڈوبنے والا تھا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی ۔

’’ہم لوگ روانہ کیوں نہیں ہوتے؟‘‘ مَیں نے پوچھا ۔

اچانک کیا دیکھا کہ پویلین کے سامنے بہت سارے ساتھی سر جھکائے گھاس پر گھٹنوں کے بَل چلنے میں مصروف ہیں ۔

آری ہنستا ہوا بھاگا آیا ’’اولگا کا بُندہ گھاس میں گُم ہو گیا ۔‘‘

’’خدایا وہ بوند سا بندہ اندھیرا پڑے اتنی گھاس میں کیا ملے گا ۔ بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ۔‘‘ نادیا بولی ۔

لیکن بی بی اولگا میٹی نے مشرق و مغرب کے بتّیس ملکوں کے ادباء و شعرائے کرام و ناقدین کو گھاس میں اپنا بُندہ ڈھونڈنے کی مہم پر لگا دیا تھا ۔ وہ سب مارے اخلاق کے اس ناممکن تلاش میں جُٹے ہوئے تھے ۔ بے چارے بزرگ ہنگرین نقاد بالا زنیگل چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے بندہ ڈھونڈتے بہت قابلِ رحم معلوم ہوئے ۔

’’مِل گیا ۔‘‘ اولگا دفعتہً چلّائی ۔ اولگا اور الفریڈو کی مادری زبان کولمبیا کی ہسپانوی تھی مگر صاف انگریزی بولتے تھے ۔ الفریڈو (کھچڑی داڑھی ، خوبصورت اور مرنجاں مرنج) سوشیولوجی میں ڈاکٹریٹ لے چکا تھا اور اپنے جنوبی امریکن ملک کولمبیا کا مشہور شاعر تھا ۔

بندہ وولف گانگ کول ہاس نے اپنی جرمن تیز نگاہی سے ڈھونڈ نکالا تھا۔

''کمال ہے۔'' نادیا نے سر ہلا کر کہا۔

''اور لگا نا قابلِ یقین ہے۔'' فرانز بولا۔

عموماً عورتیں نا قابلِ یقین ہوتی ہیں۔'' آری نے جواب دیا۔

''یہ میل شوزنزم کا رویّہ ہے۔'' امریکن جرنلسٹ لڑکی نے کہا۔

''مادام۔مَیں پرانی دنیا کا ایک کٹر میل شوونسٹ ہوں۔'' آری نے اپنے سر سے ٹوپی اُتار کر بڑے اخلاق سے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

''ترکوں اور یونانیوں کے رویّوں میں زیادہ فرق نہیں۔'' مَیں نے کہا۔

''ہو نہیں سکتا۔جغرافیہ اور تاریخ کا تقاضہ یہی ہے۔'' آری لیلیٰ سے مخاطب ہوا۔''اس پر یاد آیا۔لیلیٰ تم دعوت کب کر رہی ہو؟ گولاش اور پلاؤ۔''

ایر کنڈیشنڈ سُو پر مارکیٹوں میں اشیائے خورد و نوش کا بے تحاشا تنوع اور فراوانی اور ارزانی مشرقی یوروپ والوں کے لئے تحیّر خیز تھی۔ایک شام ہفتہ وار خریداری کے بعد مَیں ہنگری کی ایگنس اور ان کے شوہر بالا زینگل کے ساتھ سُو پر مارکیٹ کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھی باقی لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔جو اپنی اپنی ٹرالیاں بے تحاشا سامان سے لاد کر کاروں کی طرف لا رہے تھے۔اس وقت شیشے کی دیوار کے پیچھے چُنے ہوئے کیٹ اینڈ ڈوگز فوڈ'' کے عظیم الجثہ بنڈلوں پر میری نظر پڑی۔آدھی سے زیادہ دُنیا کے انسانوں کو پیٹ بھر کھانا میسّر نہیں یہاں پالتو جانوروں کے لئے نعمتوں کے انبار۔'' مَیں نے کہا۔

''ہمارے ہاں ہنگری میں تو میز پر جو ہڈی بچتی ہے وہی اپنے کتوں بلّیوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔'' بالا زینگل نے ملائمت سے کہا۔

''جو شرفاء کا قاعدہ ہے۔'' مَیں نے جواب دیا۔

ٹیلی ویژن پر اپنے فوڈ کے اشتہارات میں کتے بلیاں اداکاری بھی کرتے تھے۔
کولمبیا نیشنل اور امریکن براڈکاسٹنگ کے ہر NET WORK کے تحت چھ سو اسٹیشن کل ملا کر

دو ہزار اور مقامی اور سٹلائٹ اسٹیشن ان کے علاوہ رات گئے تک اور صبح منہ اندھیرے سے مختلف لہروں پر کلیسائی پروگرام بعض مرتبہ اس انداز کے گویا جیزس کرائسٹ بھی ایک ایڈورٹائزنگ CAMPAING ہیں۔امریکن مذہبی آزادی کے مظاہر یہ بھانت بھانت کے بے شمار خرچ ساٹھ کروڑ ڈالر سالانہ کر کے اپنے پروگرام نشر کرتے ہیں۔اُن کے واعظ پچھلی صدی کے __ BIBLE - THUMPING دورہ کرنے والے پادری کے عصری اوتار ہیں جو میڈلسن ایونیو نیویارک کے ایڈورٹائزنگ اور پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ جیسی مہارت بھی رکھتے ہیں۔یہ واعظ باقاعدہ پادری کے بجائے LAYMEN ہیں ان میں سے ایک مقبول واعظ کو نوے لاکھ ڈالر سالانہ مع PERKS تنخواہ ملتی ہے(ہندوستان سے جانے والے ہندو سوامی اور یوگی بھی اپنا اپنا پرچار انتہائی مہنگے ماہرین تعلقاتِ عامہ کے ذریعے کرر ہے ہیں۔ان کے آشرموں کا بجٹ لاکھوں ڈالر سالانہ کا ہے۔یہ سارا پیسہ ان کو ان کے دولت مند امریکن چیلے دیتے ہیں۔) سارا ٹیلی ویژن تجارتی ہے اور اشتہاروں کے درمیان سوپ اوپیرا۔ (سنٹی مثقل رومینٹک سیریل جو گھریلو عورتوں میں مقبول ہیں) کامیڈی، مباحثے۔''ٹاک شو'' رقص و موسیقی ، پرانے اور نئے فلم، ڈرامے، تعلیمی اور بچوں کے پروگراموں کے تنوع کا کوئی حدوحساب نہیں۔غیر تجارتی پبلک براڈکاسٹنگ سروس (پی بی ایس) کے انتہائی اعلیٰ درجے کے عالمانہ اور انٹلکچویل پروگرام،ڈرامے،فلم،مباحثے،انٹرویو، ہر امریکن نیٹ ورک صبح سے لے کر آدھی رات تک متعدد بار اور بے حد ڈرامائی طریقے سے اپنے خبرنامے پیش کرتا ہے۔مذہبی اور دوسری مفید سروسوں میں بہروں کے لئے بیک وقت متوازی پروگرام ٹیلی کاسٹ کئے جاتے ہیں۔ساری دُنیا میں بکھرے نمائندے (مرد اور عورتیں) سٹلائٹ کے ذریعے روم، پیرس لندن ماسکو وغیرہ سے اپنی خبریں سناتے ہیں۔ امریکہ میں موجود خبریں پڑھنے والے خواتین وحضرات بلحاظ ملک گیر مقبولیت''ٹاک شوز'' کی ہردلعزیز شخصیتوں جونی کارسن، یاڈک ایویٹ وغیرہ کی طرح اہم ہیں۔اکثر اہم اور فوری پروگراموں میں انٹرویو کرنے والے لاس اینجلز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔اور واشنگٹن اور نیویارک میں موجود شخصیتوں سے بالمشافہ گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلام کو حسبِ معمول پہلے عرب اسرائیلی مسئلے کی وجہ سے اور اب ایرانی کرائسس

کی وجہ سے انتہائی منفی پبلسٹی مل رہی ہے۔مشرق کا اسٹریوٹائپ ہمیشہ سے منفی رہا ہے۔کوئنگ اسٹرپس میں بھی ویلن عموماً ایک خشمناک عرب یا ترچھی آنکھوں والا اورینٹل ہوتا ہے (اہلِ مشرق کے لئے سفید فام مغرب کا یہ تعصب صدیوں پرانا ہے۔اوران کے لاشعور میں رچ بس چکا ہے) آج بھی پگڑی باندھے۔سیاہ فام "ہندو" یا "چینی" اس امریکن فوک اور کاویلن ہے یا ایک "پُراسرار" ذیلی کردار ــــ رڈیارڈ کپلنگ کے LESSER BREEDS WIHOUTHYE کی مصنوعی اولاد۔ایرانی کرائسس کے متعلق ذرائع ابلاغ نے جنگ پسندی ہسٹیر یا کوجنم دیا ہے۔اسلام اور .IAW مڈل ایسٹ گویا خون آشام ہلاکت پسماندگی اورجنون کا دوسرا نام ہے۔ہندوستان کا تذکرہ بھی محض کوڑھیوں، بھکاریوں اور افلاس کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ایک مزاحیہ خبرنامے میں لڑکی نے پڑھا۔کلکتہ میں ایک عورت نے پانچ بچوں کوجنم دیا۔ماں اور بچے خوش اسلوبی سے بھوکے مررہے ہیں۔" امریکنوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا طرزِ زندگی ساری دنیا کو متاثر کر چکا ہے۔سوویٹ یونین میں پوپ میوزک (خواہ وہ اس کا سوویٹ یونین ورژن ہی سہی اور جینز مقبول ہوچکی ہے۔سارا یورپ اور ساری "تیسری دُنیا" امریکن رنگ میں رنگی جارہی ہے۔

قدیم یونان اور روما نے یوروپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ، امپیریل گپتا عہد نے مشرقی ایشیا اور میڈیول عربوں نے آدھی دنیا، امپیریل مغلوں نے ہندوستان، ایران نے نصف ایشیا اور امپیریل برطانیہ نے ہندوستان اور آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنے اپنے تمدن سے متاثر کیا تھا۔۱۹۴۵ء کے بعد سے امریکہ کا بول بالا ہے۔

لیکن مشرق کے متعلق مارکوپولو اور اُن کے بعد سولہویں صدی سترہویں میں دوسرے یوروپین سیاحوں نے واپس جاکر جوائنٹ سَنٹ باتیں اپنے لوگوں کو بتلائی تھیں۔ ایک عام مغربی آج بھی ہمارے متعلق تقریباً اتنا ہی جانتا ہے۔ترقی یافتہ طاقتور مغربی اقوام کا سنڈروم۔تیسری دنیا والے ہم سے سیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو ہماری ضرورت ہے ہمیں ان کی نہیں (یہاں دانش گاہوں یا مستشرقین یا اہلِ علم وفضل کا نہیں ایک عام قومی رویئے کا ذکر ہے) لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے آج بھی مارکوپولو اور برنیر کے عہد سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔آج راجستھان میں ایک عورت ستی بھی ہوتی ہے اور عوام

اسے دیوی بنا کر پوجتے بھی ہیں۔ مسلمان عورتیں آج بھی چلتے پھرتے سیاہ خیمے ہیں۔ ہندو لڑکیاں زیادہ جہیز نہ لانے کے جرم میں دھڑا دھڑ زندہ جلائی جارہی ہیں۔ اچھوتوں کا مسئلہ پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت اختیار کر چکا ہے اور ایران میں عورتیں بھی ''اسلامی انصاف'' کے نام پر گولی سے اُڑائی جارہی ہیں۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ دو بالکل مختلف قسم کے معاشرے ہمیشہ ایک دوسرے کو عجیب اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں۔ انگریز حاکموں کا رہن سہن۔ ان کی عورتوں کی آزادی اور مرد اور عورتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رقص کرنا ہمارے اجداد کو شیطانی افعال معلوم ہوئے تھے۔ اسی طرح ہماری روایات، پردہ وغیرہ اہلِ مغرب کی سمجھ میں نہیں آتا۔ (مغرب تو دُور کی بات ہے خود ایک ملک میں رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے معاشروں کے متعلق لاتعداد غلط فہمیوں اور تعصبات میں مبتلا ہیں۔) اور اب ایران نے اسلام کو جس رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے ردِ عمل پر متعجب نہ ہونا چاہئے۔

ہماری نفسیات یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مسائل یا روایات کا معروضی تجزیہ کرنے کے بجائے نہایت جذباتی ہو کر معذرت آمیز دفاع میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ (مثال کے طور پر ہم مغرب کی برائی بھی کرتے جاتے ہیں لیکن ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے بچے بڑھیا انگریزی مدرسوں یا کانونٹ اسکول میں داخل ہو جائیں۔ اور اپنے قومی کردار کے اس تضاد پر ہم کبھی غور نہیں کرتے۔!)

امریکن اپنے قومی مسائل پر بلا کم و کاست بحث کرتا ہے۔ ٹی وی پر اور اخباروں میں سی آئی اے کی ریشہ دوانیاں، سیاسی معاملات۔ معاشرے کی تمام خرابیاں، جرائم، تشدد، نسلی منافرت، منشیات کا استعمال، بن بیاہی نوعمر ماؤں کی تعداد میں اضافہ۔ حقوقِ نسواں، بوڑھوں کی تنہائی۔ لیکن ان مسائل کو حل کرنے کے لئے منظم اور مؤثر طریقے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح محض منسٹروں کے بیانات اور پند و نصائح اور زبانی جمع خرچ نہیں۔ بوڑھوں کی تنہائی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اُن کے پورے کے پورے شہر آباد کر دیئے گئے ہیں۔ جن کا سارا انتظام وہ خود کرتے ہیں۔ اپنے ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن اور سمفنی آرکسٹرا اور کمیونٹی سنٹر چلاتے ہیں۔

سیاسی مذاکروں میں اب فلسطینی مجاہدوں کا نقطۂ نظر بھی تفصیل سے پیش کیا جارہا ہے۔ جو چند سال قبل ممکن نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکن ذرائع ابلاغ پر یہودی غالب ہیں۔ ماہرین علوم وفنون، موسیقار سائنس دان، یونیورسٹی پروفیسر، مصنفین، فنکار، اہم نظریہ ساز، سیاست دان، بڑے سرمایہ دار ''شوبزنس'' والے اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں قومِ یہود سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی زندگی میں اُن کی شدید اہمیت اور افادیت اور ان کے متواتر اور مؤثر پروپیگنڈے کی وجہ سے بھاری امریکن اکثریت اسرائیل نواز ہے۔ مَیں نے ابھی اینٹی اسلام، ٹیلی ویژن خبرناموں وغیرہ کا ذکر کیا تھا لیکن ایک اہم نکتہ نظر انداز نہ کیجئے۔ اشکنازی یہودی مغرب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب JUOAEO - CHRISTIAN یہودی مسیحی تہذیب ہے۔ انجیل مقدس کا عہد نامہ قدیم مسیحی اجتماعی لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ (خود حضرت عیسیٰؑ یہودی تھے۔) مسیحی یوروپ نے صدیوں تک یوروپین یہودیوں کو اس وجہ سے پرسیکیوٹ کیا، کہ ان کے فلسطینی اجداد نے یسوع مسیحؑ کا مصلوب کروایا تھا۔ مگر وہی یوروپین یہودی مغربی تہذیب کے معماروں میں شامل ہیں۔ اسپنوزا، ہیڈیگر، ہائینے، مینڈل سون، ہنری برگساں، کارل مارکس، فرائیڈ، آئین اسٹائین اس طویل فہرست کے چند نام ہیں۔ اُن کے مقابلے میں قرونِ وسطیٰ کے بعد کے کسی عالمی سطح کے عرب دانشور کا نام پیش کیجئے! جب نشاۃ ثانیہ کی یوروپین اقوام کا سابقہ انحطاط پذیر عربوں سے پڑا۔ وہ اپنے ابنِ رشید ابنِ خلدون وغیرہ کو بھی بھول چکے تھے۔ آج اگر آپ اہلِ مغرب اور خود ہندوستان کے غیر مسلموں کو بتلایئے کہ میڈیول عربوں نے تاریک یوروپ کو روشن کیا تھا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ آج کے عرب تو وہ شیوخ ہیں جن کی عیاشی اور احمقانہ فضول خرچی ضرب المثل بن چکی ہے۔ حال میں لندن اسٹیج پر ایک واقعہ بطور لطیفہ پیش کیا گیا کہ ایک عرب نے سارا شہر لندن خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ لہٰذا۔ اپنے مانوس سفید فام مغربی یہودیوں کے مقابلے میں ایک اجنبی مذہب اسلام (جو صلیبی جنگوں کے زمانے ہی سے بدترین مغربی تعصب کا شکار رہا ہے) اور ایک ''پسماندہ'' اجنبی مشرقی قوم عرب یا ایرانی جہاں تک پبلک کے ردِ عمل کا تعلق ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ خود اپنے امریکی یہودی دانشوروں کے کارناموں کے مقابلے میں امریکن عوام جب ان ''شیوخ'' کے

'' کارنامے'' دیکھیں گے جو ہالی وڈ میں ایسے محل تعمیر کرتے ہیں جن کی چھتوں پر برہنہ عورتوں کی طلائی مورتیاں بجی ہوں یا جن کی وجہ سے طوائفوں نے اپنے نرخ میں اضافہ کر دیا ہے۔ تو امریکن خواص و عوام کے ذہنوں میں کس قسم کا '' عرب امیج'' بنے گا؟ علاوہ ازیں مسیحی مغرب خصوصاً ہٹلر نے یہودیوں پر جو ظلم کئے، اِس کے لئے مسیحی یورپ اور امریکہ اجتماعی احساسِ جرم میں بھی مبتلا ہے اور فلسطینی حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اسرائیل کی حمایت کرتا ہے جن دنوں ٹیلی ویژن پر یکے بعد دیگرے فلسطینیوں کے حقوق کے متعلق اُن کے حامی کالے لیڈروں اور یہودی لیڈروں کے مابین مباحثے پیش کئے گئے۔ اس کے چند روز بعد ہی نازی جرمنی کے گیس چیمبرز میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کی ہلاکت کے متعلق ایک رونگٹے کھڑے کرنے والی انتہائی مؤثر فلم۔ THE HOLOCAUST دکھلا دی گئی۔ چنانچہ فلسطینیوں کے موقف کا تھوڑا بہت جو اثر ہُوا ہو گا وہ اس سے زائل ہو گیا۔ یعنی یہ کہ یوروپین یہودیوں پر اتنی بڑی قیامت گزر گئی۔ ان کے پسماندگان کے ملک اسرائیل کی ہر حالت میں حمایت کرنی چاہئے۔ اور بین السطور میں یہ کہ اسرائیلیوں کے ساتھ فلسطینی '' دہشت پسند'' وہی سلوک کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں جو نازیوں نے کیا تھا۔ سیاست اور میڈیا کی بے انصافی کی یہ بڑی ہولناک صورتِ حال ہے اور سوچ کر دل ٹوٹتا ہے۔ بسلسلہ مسیحی احساسِ جرم ایک اور بات یاد آئی۔ حال ہی میں پوپ نے اپنے ایک فتوے کے ذریعے قومِ یہود کو '' خدا کے قتل'' ___ (نعوذ باللہ!) یعنی حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کروانے کے جرم میں بری الذمہ قرار دیا ہے!

امریکہ میں شیکسپیئر کا ڈرامہ مرچنٹ آف وینس اپنے مشہور یہودی منفی کردار شائی لاک کی وجہ سے اب اسٹیج نہیں کیا جاتا! چنانچہ ٹیلی ویژن پر عرب شخصیات انٹرویو کرنے والوں کا رویّہ بھی جارحانہ اور مخاصمانہ ہوتا ہے کبھی نادیا میرا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ '' فوراً چینل لگاؤ۔ باربرا والٹرز شاہ حسین سے بات کر رہی ہے۔'' یا میں اکسائمنٹ سے چلّاتی۔ '' نادیا یاسر عرفات بول رہے ہیں۔''

لیکن اس سے قطع نظر بالخصوص پبلک براڈکاسٹنگ سروس کے نفیس پروگرام ہوتے ہیں۔ پی بی ایس پر ایک بے حد خیال انگیز اور ظرافت آمیز سلسلہ MEETING OF THE MINOS چل رہا تھا جس میں کارل مارکس، امریکن شاعرہ ایمیلی ڈکنسن، تھوریو، روسو،

ڈارون، ملکہ مَیری، انٹوانیٹ ایٹلا دی ہن وغیرہ وغیرہ ایک گول میز کے گرد بیٹھ کر ایک دوسرے سے اور آج کے اہلِ علم سے بے حد پُر لطف تکرار اور بحث و مباحثہ کرتے۔

''ان پروگراموں کو دیکھنے کے بعد اپنے مصری ٹیلی ویژن کا خیال آتا ہے۔'' نادیا سرد آہ بھر کر کہتی اور مَیں اس وقت انڈین ٹی وی کے بارے میں خاموش رہنا مناسب سمجھتی۔ اور سوچتی آخر ہم لوگ اتنے نااہل کیوں ہیں؟ اتنے ذہین اور اتنے نااہل! کہ اسی نااہلی، خود غرضی، گھٹیا پن اور بے ایمانی نے ساری قومی زندگی اور قومی سیاست کو ایک لامتناہی اوپیرا بنا کر رکھ دیا جس کے چند اہم کردار وہی کلیشے دہرائے جاتے ہیں۔ اور پوری قوم یوجیں آئینسکو کے ڈرامے '' گینڈے'' کے کرداروں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔

گینڈا دلدلی جنگلوں میں رہتا ہے اور فطرت کے اوّلین تجربوں کی یادگار ہے۔ اس کی زرہ بکتر جیسی موٹی کھال میں بندوق کی معمولی گولی سوراخ نہیں کرسکتی۔ وہ دنیا کی سب سے کریہہ المنظر مخلوق ہے۔ وہ محبت کی جبلّت سے یکسر عاری، انتہائی احمق اور طاقتور اور جنونی اور مکروہ جانور۔ اسے سجھائی بھی کم دیتا ہے۔ وہ یا تو اندھے پاگل پن کی کیفیت میں حملہ آور ہوتا ہے یا بس اونگھتا رہتا ہے۔

پی بی ایس کے ماسٹر پیس تھیٹر میں ایک شام آئینسکو کا ہولناک شاہکار '' گینڈے'' دکھلایا گیا تھا جس میں یکے بعد دیگرے سارے کردار گینڈے کی طرح چنگھاڑتے ہوئے گھر سے نکل بھاگتے ہیں۔ اور DFF. STAGE ______ دریچے کے ______ باہر گینڈوں کے غول کے غول اپنی بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ ایک فلیٹ میں جمع لوگ ایک کے بعد ایک جنونی کیفیت میں چیختے ہوئے دریچے سے کود کر اس حیوانی بھیڑ میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ ساری انسانی آبادی گینڈوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ فقط ایک آخری آدمی رہ جاتا ہے۔

مَیں نے ابھی کالے لیڈروں کا ذکر کیا تھا جو قومی زندگی میں نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ اسلام بھی اپنی مساوات کی وجہ سے ایک حد تک کالوں ہی میں کامیاب ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں میں تھوڑا بہت NEW LEFT بھی پیدا ہوچکا ہے۔ خصوصاً وسیع مشرب کیلی

فورنیا میں۔

۱۴رنومبر کو میں مغربی ساحل اور جنوبی ریاستوں کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔ اس سے قبل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے ڈپارٹمنٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر بروس پرے نے وہاں کا پروگرام طے کرنے کے لئے فون کیا۔ کہنے لگے" اس درس گاہ میں چالیس ہزار طلباء پڑھتے ہیں۔ مگر کیا عجیب اتفاق ہے کہ کل شام کیمپس پر ایک پارٹی میں ملاقات آپ کی بھانجی زیبا حیدر سے ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ آپ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں ٹھہرنے کی بجائے ان کے ساتھ قیام کرنا پسند کریں گی۔"

"آپ کو اُردو آتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں یہاں اُردو ہی پڑھاتا ہوں۔ تین دن کے لئے نیویارک سے جتندر کمار جین بھی آنے والے ہیں۔"

میں نے بات کاٹی" کمال ہے کہ زیبا سے آپ کی ملاقات ہوگئی جب کہ وہ برکلے میں پڑھتی بھی نہیں۔ کیا دُنیا اتفاقات کا ایک عجیب و غریب سلسلہ نہیں؟"

سن شائن اسٹیٹ

ایک بار پھر شکا گو، دوسرا طیارہ برائے ڈینوز جو ریاست کولوریڈو کا بہت بڑا شہر ہے۔ اب سرخ چٹیل کوہستانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈینوز سے مغرب بعید کی سمت جاتے ہوئے محض سرخ پہاڑ اور وسیع، پتھریلی وادیاں۔ اچانک سرسبز کیلی فورنیا مِڈ ویسٹ میں سردی پڑنے لگی تھی کیلی فورنیا دھوپ سے معمور تھا۔

پچھلی صدی میں گولڈرش کے دوران سیرا ینوادا میں سونے کی کانیں دریافت کرنے والوں نے سان فرانسسکو بسایا تھا وہ لوگ فورٹی مائنیر کہلاتے تھے جنہوں نے ۱۸۴۹ء میں گولڈرش شروع کیا۔ کالج میں ہم لوگ ایک پرانا امریکن گیت گاتے تھے

DWELL A MINER, FORTY NINER, GAO A

DAUGHTER CLEMENTINE

یہ بھی رومانس اور لیجنڈ کا شہر ہے۔ سارے امریکہ کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہاں کے باشندے طرح طرح کے کارنیوال مناتے ہیں اور اپنی خوش باش زندگی کے لئے مشہور ہیں۔

سان فرانسسکو کے نزدیک اوک لینڈ کی طیران گاہ پر چچازاد بہن خالدہ حیدر کی لڑکی زیبا مع اپنی پاکستانی دوست کو کب۔ زیبا کون کورڈیا یونیورسٹی مونٹریال (کینیڈا) سے ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن کے امتحان میں پانچ سو طلباء میں اوّل رہی تھی۔ اور سان فرانسسکو کے

ایک فاسٹ فوڈ چین اسٹور کی منیجر بن چکی تھی۔

کوکب نے زیبا کی کار اسٹارٹ کر کے فراٹے سے برکلے کی سمت جانے والی فری وے پر چھوڑ دی۔ یہ نوعمر پاکستانی لڑکیاں انتہائی خود اعتمادی اور اطمینان کے ساتھ سان فرانسسکو میں اپنے اپنے کیریئر شروع کر رہی تھیں اور قریب کے شہر ماؤنٹین ویو میں ایک بنگلہ کرائے پر لے کر رہتی تھیں۔

امریکہ میں دو ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔ ہر ریاست میں سرکاری یونیورسٹیوں کا ایک COMPLEX ہے۔ "یونیورسٹی آف کیلیفورنیا" اس ریاست کے چھ شہروں میں اسی نام سے موجود ہے۔ مشہور عالم "لبرل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے" کا حسین اور پُر فضا کیمپس۔ خود شہر سان فرانسسکو دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ایک سرسبز پہاڑیاں، اونچے نیچے بل کھاتے راستے مورش ہسپانوی طرز کے مکانات، عظیم الشان ڈاؤن ٹاؤن، تیز نیلا بحرالکاہل۔

منصور العارفین برکلے میں کیمپس کے نزدیک پارکر اسٹریٹ نامی ایک خوش منظر محلّے کے اندر ایک نفیس اپارٹمنٹ میں اپنے ساتھی طالب علم یونس کے ساتھ رہتا تھا۔ یونس پاکستان کے سب سے بلند پایہ قائدِ اعظم اسکالرشپ پر ریاضی پڑھنے آیا تھا۔ دونوں بے حد ذہین، نیک اور خوش مزاج لڑکے تھے۔ منصور العارفین جو لاہور میں کنڈرگارٹن کلاس سے زیبا کا ہم جماعت رہا تھا برکلے میں پڑھنے کے علاوہ جز وقتی ملازمت بھی کر رہا تھا ایک شام اُن کے ہاں آئے ہوئے ایک ہندوستانی طالب علم نے مجھ سے کہا۔ بتایئے۔ ہمارے پتا جی کی ہر پندرہویں روز چٹھی آتی ہے، کہ واپس آجاؤ واپس جا کر جوتیاں چٹخائیں؟ جتنا یہاں پڑھا ہے اس کے لحاظ سے منتریوں کی سفارش لگانے پر سات آٹھ سو کی نوکری ملے گی یا نہ بھی ملے۔ یہاں پارٹ ٹائم کام کر کے بھی اتنا کما لیتے ہیں کہ ایسے اچھے اور فرنشڈ اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیتے ہیں۔ مع وال ٹو وال کارپٹ بڑھیا فرنیچر، مستقل گیس، فریجڈ ٹیلیفون لگوانے کے لئے صبح بل کمپنی سے کہو چھ گھنٹے کے اندر اندر اُن کا آدمی ٹیلیفون لگا جائے گا۔ بمبئی میں اپارٹمنٹ کتنا مہنگا ملے گا؟ اور وہ بھی خالی۔ فرنیچر، بنا گیس، یہاں مکانوں کی کوئی کمی نہیں۔ اسٹوڈنٹ لوگ اس ٹھاٹھ سے رہتے ہیں، جب ہر طرح کی آسائش یہاں موجود ہے تو ہم

واپس جا کر پیارے دیش میں کیا بھاڑ جھونکیں۔؟''

''گھر یاد نہیں آتا۔؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت یاد آتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی سب ۔ یہی تو ہم لوگوں کا یہاں.........ہے۔''اس نے افسردگی سے کہا۔

پارکر اسٹریٹ سے کچھ فاصلے پر نہایت کلرفل بازار تھا۔ بیفکر ابشاش ماحول لوگ باگ بانسری گٹار منڈولین بجاتے پھر رہے تھے۔ اپاہج طلباء اپنی موٹر کرسیوں پر مزے سے گھوم رہے تھے۔ ایک اپاہج نوجوان اپنی مخصوص کار خود چلاتا ہوا آیا۔ بغیر کسی کی مدد کے خود اپنے کل پرزوں پر چلتا ہوا کار سے اُتر کر کتابوں کی دوکان میں داخل ہوگیا۔ کیمپس پر ایک آرکیڈ میں ایک کالا طالب علم میوزک سامنے رکھے ہوئے وائلن پر کوئی کلاسیکل نغمہ بجا رہا تھا۔ وائلن کا کیس سامنے کھلا رکھا تھا۔ سامنے سے گزرتے طالب علم ٹھٹھک کر سنتے کیس میں چند سکے رکھتے اور آگے چلے جاتے وہ آدمی اپنی موسیقی فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ یہ گویا اس کا جز وقتی پیشہ تھا۔

کیلی فورنیا بلحاظ سائنس اور ٹیکنالوجی باقی سارے امریکہ سے آگے ہے۔ ساتھ ہی آزاد منش فنکاروں اور ادیبوں کا اڈا ہے۔ سان فرانسسکو نیویارک اور شکاگو کی طرح بڑا ادبی اور صحافتی مرکز ہے۔ سارے انوکھے دل جلے مشرب بھی یہیں سے شروع ہوئے، ہندو آشرموں کی افراط، بھانت بھانت کے ایکو ونک قائد کے حلقے۔ ہپی سب سے پہلے یہیں نمودار ہوئے تھے۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے اپنی آزادخیالی کے لئے مشہور ہے۔ ایک صبح اس کے چوک میں ہائیڈ پارک لندن کی طرح جگہ جگہ مختلف مسائل پر دُھواں دھار تقریریں کی جارہی تھیں۔ چہار طرف طرح طرح کے پوسٹر لگے ہوئے تھے ایک سمت کے لب یعنی ہم جنسوں کی آزادی کے علمبردار اپنے اسٹال سجائے بیٹھے تھے اور اپنے پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے۔ یونین کی عمارت کے سامنے جم غفیر، شاہ مخالف مظاہرہ، دھواں دھار تقریریں لڑکے اور لڑکیاں درختوں پر چڑھے بیٹھے تھے۔'' انسانیت کش شاہ ایران کو امریکہ سے واپس کرو۔'' کے پرچم اور پوسٹر ایک لڑکی'' کمیونسٹ پارٹی آف یو ایس اے'' کا پمفلٹ میرے ہاتھ میں تھما کر آگے بڑھ گئی۔ تہران میں یرغمالیوں کی نظر بندی کا دسواں یا گیارھواں روز تھا

اور سارے ملک میں ایک چرچا تھا۔

ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی عمارت کے سامنے'' گھڑیال نے گجر بجایا۔'' روز دوپہر کو یہ گھنٹہ گھر باری باری ان سب ملکوں میں سے ایک کی قومی دُھن بجاتا ہے جن کے طالب یہاں پڑھ رہے ہیں۔'' زیبا نے بتایا۔'' کل پاکستان کی قومی دُھن بجی تھی۔''

نوجوان طالب علم ذوالفقار علی بھٹو اسی کیمپس پر گھومتے تھے۔ اس بات کو ابھی اتنا زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اور وہ جلاوطن محمد رضا پہلوی جن کے خلاف سامنے یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے چوک میں احتجاجی جلسہ ہو رہا تھا۔ محض چند سال قبل بحیثیت اعلیٰ حضرت شہنشاہ آریہ مہر، وزیراعظم پاکستان ______ بھٹو سے ملنے اسٹیٹ وزٹ پر کر دفر پرویزی کے ساتھ پاکستان جاتے تھے اور بھٹو کی زمینداری واقع ضلع لاڑکانہ میں شکار کھیلتے تھے۔ کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ۔

گھنٹہ گھر کے نزدیک ایک خوبصورت پل کے نیچے پہاڑی نالے کا پانی بہتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر بروس پرے کے دفتر کے کلیسائی دریچوں کے باہر اونچے درخت خوشگوار دھوپ میں نہا رہے تھے۔ کمرے کے اندر اُردو کے چند امریکن طالب علم پھانسی کے سزایافتہ دہشت پسندوں کے متعلق سوالات کرنے میں مصروف تھے جن کا تذکرہ '' آخرِ شب کے ہم سفر'' میں کیا گیا تھا۔ (ڈاکٹر بروس پرے نے وہ مضمون اپنے امریکن شاگرد مارٹن کو زیروکس کر کے لانے کے لئے کہا)، مارٹن پل کی پل میں غائب ہو گیا۔

اتنی خوبصورت، سہانی، دلچسپ، مسرت بخش، فرحت انگیز دُنیا اور چند انسانوں کو چند انسان سیاست کے نام پر پھانسی دے کر، گولی سے اُڑا کر، زہر بم پھینک کر، خنجر بھونک کر اس عالمِ رنگ و بو سے معدوم کر دیتے ہیں آخر کیوں؟ ایران میں پچھلے برسوں میں کتنے مارے گئے۔ اور اب بھی کتنے مارے جا رہے تھے۔ بساطِ ارض پر ہر جگہ، شانتی، شانتی۔ چند امریکن سوامی مالا جپتے باہر نالے کے پل پر سے گزر گئے۔'' یہاں برکلے میں ایک ماتا جی بھی نمودار ہو گئی ہیں۔'' دوپہر کو کیمپس کے ایک جھلملاتے ریستوران میں لنچ کی میز پر جتندر کمار جین نے مجھ سے کہا۔'' کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔'' میں نے جواب دے دیا۔

امن۔ ہر قیمت پر امن حاصل کرنا چاہئے۔
تو فلسطینی مجاہد؟ کویکرز کے پاس بھی اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

اس پلیٹ گلاس طعام خانے کے باہر سرسبز سرسراتے جنگل پر بارش کی جانفزا پھوار پڑ رہی تھی۔ دور سرمئی راستے پر کیمپس پولیس کی پٹرول کارگشت کرتی نکل گئی۔ طعام خانے کے مقابل میں اسٹوڈنٹس یونین کی یونانی عمارت کے چوک میں معزول شاہِ ایران کے خلاف جلسہ جاری تھا۔ ''مَیں اس جلسے کی تصویریں لیتی مگر اپنا کیمرہ گھر بھول آئی۔'' مَیں نے کہا۔ '' مجھے کنجی دیجئے میں جا کر لے آتا ہوں۔'' مارٹن نے کہا۔ زیبا نے اسے کنجی دے کر منصور العارفین کے اپارٹمنٹ کا پتہ اور اندر کا نقشہ سمجھایا۔ لونگ روم سے گیلری میں جا کر بائیں دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ فرش پر بہت سا سفری اسباب بکھرا نظر آئے گا۔ اس میں کیمرہ تلاش کر لینا۔ آسان بات ہے۔''

مارٹن نے ہوشمندی سے سر ہلایا اور ترنت کیمرہ لے کر واپس آیا۔ کھانے کے بعد اُس نے ''پت جھڑ کی آواز'' کی ہیروئن ''تنویر فاطمہ'' کی ابنارمل نفسیات کے متعلق ذہین سوالات کئے۔ ادھر جتندر کمار جین (جن کے اور راقم الحروف کے لئے لنچ دیا گیا تھا) فصیح و بلیغ اُردو بول رہے تھے۔ موصوف تین دن کے لئے نیویارک سے آئے ہوئے تھے۔

مغرب اور سوشلسٹ ممالک کی یونیورسٹیوں میں جو طالب علم برِصغیر کی زبانیں پڑھنا شروع کرتے ہیں وہ اکثر اُردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ نامور ہندی ادیب جب نجی طور پر بات چیت کرتے ہیں تو بے ساختہ اور لامحالہ اُردو بولتے ہیں۔ لیکن اُردو کی جو صورتِ حال ہے تو ہے۔ عبرت۔ عبرت۔ پریذیڈنٹس رُوم میں (جس کی دیوار پر یونیورسٹی کے سابق پریذیڈنٹوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔) منعقد راقم الحروف کے سیمینار کے لئے (جس کا اعلان سان فرانسسکو کرانیکل میں چندر روز قبل کیا جا چکا تھا۔) کافی سامعین موجود تھے۔ اُردو والے نازاں ہیں۔ آہاہا۔ دیکھئے صاحب مغرب میں بھی لوگ اُردو پڑھ رہے ہیں۔ بنکاک یا قاہرہ یا بغداد کی یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھائی جائے تو اتنے مرعوب نہ ہوں گے۔

سیمینار سے قبل پروفیسر بروس پرے نے لسانیات کے دارالعمل میں کارِ جہاں دراز ہے (جلد اوّل) کے دو طویل ابواب ''باغی سپاہی'' اور کجا پلٹن اور کجا پائے مور۔'' ریکارڈ

کروائے اور مارٹن نے لکھنؤ کے تلفظ کے متعلق پوچھا۔ یہ الگ بات ہے کہ دلّی اور لکھنؤ دونوں کے تلفظ معدوم ہونے والے ہیں۔

سان فرانسسکو ایک پرستانی شہر ہے۔ ابھی خیال آیا کہ اس کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ امردوں کو انگلستان میں FAIRY کہتے ہیں۔ سان فرانسسکو میں سُنا ہے ہر ساتواں شخص GAY ہے۔ اُردو میں اس قسم کے لوگوں کو ''جنت کی چڑیاں'' کہا جاتا تھا (نجانے اس کی وجہ تسمیہ کیا تھی شہر میں پرانا رومینٹک ماحول قائم رکھنے کے لئے چند سڑکوں پر ٹرام گاڑیاں باقی رکھی گئی ہیں۔ زیبا اور میں ایک ٹرام گاڑی پر چڑھے۔ اس نے ٹن ٹن کر کے چڑھائی پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ زیبا بیگم جو مسلسل میری تصویریں کھینچتی رہتی تھیں اچانک چلتی ٹرام سے سڑک پر اُتریں تصویر کھینچی اور پھر کود کر اوپر آ گئیں۔ مَیں نے خوب ڈانٹا'' اور نہ ہوئے اس وقت بشیر خاں ڈرائیور ورنہ زمین آسماں ایک کر دیتے۔'' میں نے کہا۔'' آپ کی والدہ محترمہ کے ہشکارنے پر روانہ ہونے والی کار کے پیچھے لگیج کیریئر میں اُن کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔''

''لگیج کیریئر ___؟'' زیبا نے اپنی والدہ محترمہ کی طرح آنکھیں گول کر کے پوچھا۔

''ہاں اس زمانے میں ڈِگی کے بجائے ہوتا تھا۔ ہمارا لگیج کیریئر بہت چوڑا تھا۔ ہم لوگ اس پر چڑھ کر بیٹھ گئے بری طرح حادثہ ہو جاتا۔ بشیر خاں نے ایک راہ گیر کے بتانے پر کار روکی اور خوب جھاڑا۔'' فرانسسکو واپس پہنچے جب ٹرام گاڑی پولک اسٹریٹ کے نزدیک رکی۔ پولک اسٹریٹ شہر کے GAY لوگوں کی آماجگاہ تھی۔ اُن کی رقص گاہیں شراب خانے، کتابوں اور رسالوں کی دکانیں (ایک چینی کتب فروش کی دوکان کے دریچے میں PLAY BOY کی قسم کے اَن گنت CAKE رسالے رکھے ہوئے تھے) ان کے مخصوص فیشن کی ملبوسات کے ڈیپارٹمنٹ اسٹور اور ریسٹوران۔

دوسرے روز ہم لوگ سان فرانسسکو سے چند میل دُور ایک حسین یورپین نما ساحلی شہر سا سلیٹو گئے۔ وہاں ایک ریسٹوران کے دریچے میں چند خواتین سی بیٹھی نظر آئیں۔ دوبارہ غور سے دیکھا وہ سب حضرات تھے۔ واپسی پر رات کو سان فرانسسکو کی ایک نیم تاریک رقص گاہ میں جھانکا، وہاں رنگ برنگی متحرک روشنیوں میں مرد مردوں کے ساتھ ڈسکو رقص کر رہے

تھے۔ بڑا بھیانک سا ماحول تھا۔ لیکن ہمیں مغرب کے اس اخلاقی زوال پر اپنے اخلاقی برہمی کے اظہار کرنے سے پہلے روایتی فارسی اور روایتی اُردو شاعری پڑھ لینی چاہئے۔

''سنا ہے برکلے میں ایک لزبین بار بھی موجود ہے۔ لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھتے چلیں۔'' منصور العارفین نے برکلے کی سمت کار موڑتے ہوئے کہا۔ سان فرانسسکو کی یہ GAY دُنیا باقاعدہ ٹورسٹ اٹریکشن بن چکی ہے۔'' اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ برکلے واپس پہنچ کر ہم لوگ اس بار کا پتہ نشان ڈھونڈتے پھرے۔ ایک سنسان سڑک پر ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے ایک ٹرک کھڑی تھی۔ برجس میں ملبوس سیاہ مردانہ فلیٹ ہیٹ ترچھی لگائے ایک خاتون ایک دروازے سے نکلی اور ٹرک اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گئی۔

ایک عورت دروازے کے سامنے جھاڑو دے کر شکستہ بوتلیں سمیٹ رہی تھیں۔ ایک خوش شکل لڑکی چست مردانہ لباس پہنے (جو عام لڑکوں اور لڑکیوں کی جینز یا سلیکس سے مختلف تھا) سر پر سیاہ مردانہ ہیٹ ترچھی لگائے چیلو کا کیس سنبھالے سڑک پار کر کے اس دروازے پر پہنچی۔ جھاڑو والی عورت بڑبڑائی۔ ''کیا ہوا؟'' نو وارد لڑکی نے پوچھا۔ ''برابر کی دکان والے سارا کچرا اور ٹوٹی بوتلیں جان بوجھ کر یہاں پھینکتے ہیں''۔ جھاڑو والی نے جواب دیا۔

''سُور کے بچے۔'' چیلو بجانے والی لڑکی بولی، اور اندر چلی گئی۔ بعض اوقات کسی منظر کی صرف ایک جھلک یا چند الفاظ ایک صورتِ حال کو منکشف کر دیتے ہیں۔ ظاہر تھا کہ پاس پڑوس کے لوگ اس کلب کو ناپسند کرتے تھے۔

کار سے اُتر کر ہم چاروں ذرا تذبذب میں تھے۔ اندر کس طرح جائیں۔ صاف پتہ چل جاتا کہ ان لوگوں کو ایک عجوبہ سمجھ کر بطورِ سیاح اُنہیں دیکھنے آئے ہیں۔ ہمت کر کے میں زیبا اور منصور العارفین اور یونس اندر گئے۔

بار پر دو اُداس صورت لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک موٹے شیشوں کی عینک لگائے کم رُو بھدّی سی لڑکی تھی۔ دیواروں پر ویمنز لب تحریک کے زیرِ قیادت دیئے جانے والے لیکچروں مذاکروں اور فلم شوز وغیرہ کے پوسٹر لگے تھے۔ ''یہ بڑا غضب ہوا کہ ویمنز لب تحریک یہاں ایک حد تک لزبین خواتین کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔'' زیبا نے کہا۔

کلب خالی پڑا تھا۔ بلیرڈ کی میز کے قریب چیلو بجانے والی لڑکی اپنا ساز درست کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ کوارٹیٹ کی باقی اراکین ابھی نہیں آئی تھیں۔ شاید وہاں موسیقی کا پروگرام ہونے والا تھا۔ بار پر بیٹھی خواتین نے ہمیں ناگواری سے دیکھا۔ منصور العارفین اور یونس بالکل دُشمن علاقے میں کھڑے تھے۔''چلو واپس چلیں۔ آئیڈیا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ہم چاروں جو دراصل خاصے زوس تھے۔ باہر آئے۔ جھاڑو والی کوڑا سمیٹ کر جا چکی تھی۔ اسٹریٹ لیمپوں کی پہلی بیمار روشنی میں سڑک اور زیادہ افسردہ اور بیمار معلوم ہو رہی تھی۔

سان فرانسسکو شہر میں ہیٹ ایش بری کا محلّہ بھی اب خاموش پڑا تھا۔ پندرہ سال قبل جہاں سے ذیلی کلچرز اور آزاد رَویوں کے یہ سارے غلغلے اُٹھے۔ اسی محلّے کے باغیوں نے سارے مغرب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہپی۔ فلاور چلڈرن۔ ایل ایس ڈی کھانے والے ہم جنسوں کی آزادی کے علمبردار ہرے کرشنا والے سبھی کا اس محلے میں ظہور ہوا۔ اب وہ خط بہت باعزت ہو گیا تھا۔ وہ باغی امریکہ اور مغرب کی سماجی تاریخ میں اپنا احتجاجی رول ادا کر کے غائب ہو گئے۔ (ایلن گنز برگ جس کی معرکتہ آرا وطویل نظم HOWL نے مڈل کلاس امریکہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ان سر پھروں کا گرو تھا، احتجاج کی اب ضرورت نہیں رہی۔ دس پندرہ سال کے اندر اندر وہ سارے جدید رویئے اب امریکن زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل ہو چکے تھے۔ مڈل کلاس منافقت کے خلاف جو زبردست احتجاج اس نئی نسل نے کیا تھا وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔

فرشتوں کی ملکہ مریم کا شہر

اہلِ ہسپانیہ نے بسایا تھا۔ ایل پیوبلو دی نیوترا سینورا لا رینا دی لاس اینجلز۔ "ہماری بی بی ملکتہ الملائیکہ کا شہر" امریکہ اور میکزیکو کی جنگ کے بعد صلح نامے کی زد سے امریکہ نے اس شہر اور سارے کیلیفورنیا پر قبضہ کرلیا۔ امریکہ کی قومی اساطیر میں پلگرم فادرز ریڈ انڈین قبائل کے خلاف لڑائیاں، پائینرز، کاؤبوائے، وائلڈ ولسٹ کی آبادکاری، گوڈرش امریکن خانہ جنگی، حبشی غلاموں کی آزادی وغیرہ شامل ہے جسے مارک ٹوین، برٹ ہارٹ، دوسرے ناول نگاروں اور بعد میں ہالی وڈ فلموں میں پیش کیا گیا۔ اسی گوڈرش کے لئے ہزارہا چینی بحرالکاہل عبور کر کے کیلیفورنیا پہنچا تھا۔

"غریب میکزکن اب بھی متواتر سرحد پار کر کے تلاشِ روزگار میں لاس اینجلز آتے رہتے ہیں۔" میرے بھتیجے منصور حیدر نے کہا کہ ہم لوگ لاس اینجلز ایرپورٹ سے بہت دُور نارتھ ہالی وُڈ کی طرف جا رہے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے مگر سان فرانسسکو جیسا خوبصورت نہیں۔ میں نے اظہارِ خیال کیا شمالی ہالی وُوڈ کے ایک خوبصورت رہائشی علاقے میں ہسپانوی طرز کے سُرخ کھپریل والے سفید دو منزلہ مکان میں میرے بھتیجوں کا اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔ داخلے کے ہال میں بھورا و بیز قالین۔ بڑھیا صوفے۔ نفیس جالی کے پردے۔ اُوپر اسی طرح کا اپارٹمنٹ جیسا سان فرانسسکو میں منصور العارفین کا تھا۔ میرے بھائی سیّد مصطفےٰ حیدر کے تین بڑے لڑکے یہاں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس اینجلز میں زیرِ تعلیم تھے اور جز وقتی

ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ اُن کی بڑی بہن ناہید اسی طرح شہر کی یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا میں ڈیڑھ سال ٹیکس ایڈمنسٹریشن پڑھ کر اپنی سی ایس پی کی ملازمت پر کراچی واپس جا چکی تھی۔ اس سے چھوٹا جلال حیدر سی ایس پی جو کراچی میں مجسٹریٹ تھا پندرہ ماہ کی چھٹی لے کر بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے آیا تھا۔ منجھلے اور چھوٹے عدنان حیدر اور منصور حیدر انٹرنیشنل فنانس وغیرہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ زمانے لَد گئے جب برِصغیر کے نوجوان شیکسپیئر اور ارسطو کے مطالعے کے لئے انگلستان جاتے تھے۔

بچوں کے باورچی خانے کے دریچے میں سے دُور ایک پہاڑی پر سفید حروف میں HOLLY WOOD لکھا صاف نظر آتا تھا۔ مکان سے کچھ فاصلے پر سانتا مونیکا سان مارنیو وغیرہ جانے والی سڑکوں کے بورڈ لگے تھے۔ ذرا فاصلے پر سن سیٹ بولیوار تھی۔ معقول لڑکپن میں ان جگہوں کے نام بڑے سحر انگیز لگتے تھے۔ سان فرنانڈو ویلی، جان اسٹین بک وغیرہ کے ناولوں میں اس کا ذکر بہت پڑھا۔ وہ وادی سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ دو پہاڑیوں کے درمیان کھلی فضا کے یونیورسل ایمفی تھیٹر میں ساڑھے پانچ ہزار سیٹیں تھیں اور اسٹیج پر فرینک سناٹرا۔ ڈونا سمر، کینی راجوز وغیرہ شام کو اپنے شو پیش کرتے تھے۔ ایک صبح یونیورسل سٹی میں سیاحوں کی طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ بچوں کے ساتھ قطار میں اپنی ''گلیمر ٹرین'' کی باری کی منتظر تھی جب اچانک فرینک اسٹین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سہم کر رہ گئی۔ وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ سبز رنگ کا میک اپ کیسے بے حد طویل القامت دیو پیکر فرینک اسٹین اس مستقل تماشے کا ایک کردار تھا۔

گلیمر ٹرین ساری یونیورسل سٹی کا چکر لگاتی ایک سرنگ میں داخل ہوئی اچانک LASER شعاعیں چمکنے لگیں۔ سائنس فکشن کے متعدد کردار فولادی اسپیس سوٹ پہنے ٹرین کی طرف لپکے۔ بھیانک دھماکے، طرح طرح کی آوازیں۔ آؤٹر اسپیس کے ایک جہاز نے ٹرین کا راستہ روک لیا۔ LASER توپیں چلیں۔ ٹرین کا کنڈکٹر خوفناک آواز میں بولا۔ ''مسافرو۔ بڑا افسوس ہے کہ ہم ایک غیر متوقع مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ لیکن فکر نہ کیجئے۔'' (پھر بندوقیں چلیں) ایک سو بیس سیاحوں سے بھری گلیمر ٹرین ایک UFO پر چڑھ گئی۔ بلپ، بلپ، روشنیاں۔ ٹرین مصنوعی خلا میں پرواز کرنے لگی۔ سیاروں کی جنگ شروع

ہوئی۔ کچھ دیر بعد ٹرین سرنگ سے باہر نکلی (یہ سارا ماجرا یونیورسل پکچرز کی فلم ____ BATTLE OF GAIACTICA کا تھا جسے روزانہ ان ہزاروں سیاحوں کے لئے اس سرنگ میں کئی بار دہرایا جاتا تھا جن کی ''گلیمر ٹرینیں'' ایک کے بعد ایک ساری یونیورسل سٹی کے عجائب وغرایب کی سیر کرواتی رہتی تھیں۔)

ہماری ٹرین اب ندی کے اونچے چوبی پل پر چڑھی۔ وسط میں پہنچتے ہی پل ''ٹوٹ'' گیا۔ ٹرین ایک دھچکے سے ٹوٹے ہوئے راستے پر سے نکل کر ''بحیرۂ احمر'' پر آئی۔ یہ جھیل ____ TEN COMMANOMENTS فلم کے لئے بنائی گئی تھی۔ اچانک پانی کے دو حصے ہوئے اور ٹرین حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح ''بحیرۂ احمر'' میں سے نکل گئی۔ ایک اور جھیل پر پہنچے جس کے اندر "JAWS" والی شارک پڑی ہوئی تھی۔ دور جھیل کے وسط میں آدمی ناؤ میں بیٹھا تھا۔ مصنوعی شارک نے اس پر حملہ کیا۔ مصنوعی آدمی پانی میں گر پڑا۔ خون کا فوارہ اُبلا۔ اب شارک منہ کھول کر ہماری طرف لپکی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اصل شارک نہیں۔ ٹرین جھیل کے کنارے سے آگے بڑھی۔

یہ سارے تماشے متواتر بالکل صحیح وقت پر دکھائے جاتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کی بھول چوک نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر اس شارک سے مکینیکل حرکت اور رفتار میں ذرا سی بھی غلطی یا دیر ہو تو یہ ٹرین سے ٹکرا سکتی ہے۔ ''لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا'' جلال میاں نے کہا۔ ''سرنگ میں جب وہ مریخ کا آدمی ٹرین کی طرف بڑھا اور LASER توپیں چلیں تو چند سیکنڈ کے لئے مجھے بھی ذرا لگا تھا۔'' مَیں نے اعتراف کیا۔

اب ہم لوگ وائلڈ ویسٹ کے ایک پچھلی صدی کے شہر میں سے گزر رہے تھے جس میں سینکڑوں کاؤبوائے فلم بن چکے تھے۔ ایک دو منزلہ مکان میں مستقل آگ لگ رہی تھی اور ایک مصنوعی کاؤبوائے اوپر سے کود رہا تھا۔ اس کے بعد یورپ کے مختلف شہر، جھیلیں، قرونِ وسطیٰ کے قلعے۔ ٹرین سے اُتر کر ہم لوگ ایک مستقل سیٹ پر گئے۔ جہاں ایک جمبو جیٹ رکھا تھا جو گویا پانی میں ڈوب رہا تھا۔ ڈائرکٹر نے ناظرین میں سے چند کو اوپر بلایا اور ان کو سمجھا کر جمبو جیٹ کے اندر فلم بندی شروع کی۔ چند منٹ بعد وہیں ٹی وی اسکرین پر وہ پورا سین دکھلا دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اصل فلم کے انٹر کٹ دکھلائے گئے جن میں جیک لیمن اور ڈیرن

مک گیون نے کام کیا تھا۔اصل فلم کے مناظر اور اُن کی نقل میں کوئی فرق نہ تھا۔

سارا ہالی ووڈ کا ''پیالہ'' یعنی گول وادی اور اس کے چاروں طرف پہاڑ یونیورسل سٹی کے اوپر کھلے ریسٹوران سے نظر آتے ہیں۔ ریسٹوران میں ہر میز پر قیمتی کاغذ KLEENAX رومالوں کے بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔(یہ ڈبے ہر امریکن گھر کے ہر کمرے میں بھی موجود ہوتے ہیں۔) اس وسیع کھلے ریسٹوران میں جہاں سینکڑوں لوگ آجا رہے تھے۔کوئی یہ ڈبے چرانے والا نہ تھا۔

ایک مرتبہ کراچی میں مشہور کرکٹ کمنٹیٹر اور صحافی عمر قریشی نے (جو برکلے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔) مجھے بتایا تھا کہ جب وہ یو سی ایل اے میں پڑھتا تھا تو وہ اور اس کے خوش شکل ساتھی ہالی ووڈ فلموں کا خصوصاً۔ BIBLICAL EDICS میں (جن کا ان دنوں بہت زور تھا) چھوٹے چھوٹے رول کر لیا کرتے تھے۔جس کے ان کو بہت پیسے ملتے تھے۔اسی ریسٹوران میں کچھ دیر بعد تینوں بچے مزید کافی وغیرہ لانے کے لئے دکانوں کی سمت گئے۔قریب کی میز پر تنہا بیٹھی ایک حسین لڑکی نے توصیفانہ نظر ان پر ڈال کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔جواباً مَیں بھی مندرجہ ذیل مکالمہ:۔

''یہ بے حد ہینڈسم نوجوان یہاں اداکار ہیں؟''

''نہیں۔''

''کون ہیں؟ ہسپانوی۔اطالوی؟''

''پے کستین۔''

لڑکی۔بلینک۔پھر۔''ان کو یہاں ڈسکور کر لینا چاہئے۔''

''ان بے حد ذہین اور پڑھائی کے شوقین بچوں کو فلموں میں کام کرنے کا قطعی شوق نہیں۔کیا تم ٹیلنٹ اسکاؤٹ ہو؟''

لڑکی (ٹھنڈا سانس) ''نہیں۔یہاں کام کی متلاشی۔آپ؟''

''مَیں؟ (پراسرار توقف) خاتون لاما۔''

لڑکی بلینک۔

''لاما۔بدھسٹ سوامی۔''

''اوہ۔لیڈی گورو۔!''

میں: مشفقانہ،روحانیت سے پُرمسکراہٹ چہرہ پُرنور۔

لڑکی: اچانک دلچسپی میں برازیل سے آئی ہوں۔کیا میں یہاں کامیاب ہوسکوں گی؟یعنی کراو ڈسین کے علاوہ؟

میں: ہوبھی سکتی ہواورنہیں بھی۔یہ اس آدمی پرمنحصر ہے۔جوشال سے آئے گا۔قد بہت لمبا ہوگا۔سرخ بال۔بائیں کنپٹی پرزخم کانشان اوراس کے نام کا پہلا حرف ایل ہوگا۔''

بچے واپس آئے۔یہ عجیب وغریب مکالمہ کان میں پڑا۔اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی۔اتنے میں اس بے چاری کا خرانٹ سا ساتھی آگیا اور پرتگالی میں اس سے تیز تیز بولنے لگا۔مجھے اسٹین بک کے ناول THE WAY WARD BUS کی غریب لڑکی یاد آئی جو کلارک گیبل پر عاشق تھی اور ہالی وُوڈ پہنچ کر اسٹار بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

ڈِزنی لینڈ دنیا کا''مسرورترین مقام''کہلاتا ہے۔اوراس کی سیر کے لئے کم ازکم ایک ہفتہ درکار ہے۔اسی وجہ سے دُوردُور سے لوگ آکر ڈِزنی لینڈ ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔جو ایک برق رفتار مونوریل کے ذریعے اس حیرت ناک جگہ سے ملحق ہے۔وہ مونوریل ایک بہت اونچے پُل پر ایک پٹری پرزائیں زائیں چلتی رہتی ہے۔

یہ اتنی تیزی سے ترچھی ترچھی چل رہی ہے کہیں گر نہ جائے۔''میں نے نیچے سڑک پر کھڑے ہوکر فکرمندی سے کہا۔''پھوپھی آپ کا مزاج بالکل مکینکل نہیں ہے۔فکر نہ کیجئے یہ ریل بالکل نہیں گرے گی۔''عدنان میاں ہنس کر بولے۔نیچے کار پارک میں امریکن سیلانیوں کی ہزارہا کاروان کاریں موجود تھیں۔ان متحرک پُرتکلف گھروں میں وہ دوسرے شہروں سے اپنے بچوں کے ساتھ ڈِزنی لینڈ آئے تھے۔

ڈِزنی لینڈ کے اندر''واشنگٹن ڈی سی۔''میں ابراہیم لنکن کھڑے تقریر کررہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں زبردست ریوالونگ اسٹیج پر والٹ ڈِزنی کے سارے بولتے گاتے ناچتے جانور پلوٹو گوفی ڈونلڈ ڈک وغیرہ وغیرہ مزاحیہ ڈرامہ پیش کرنے میں مصروف تھے۔ہر پُتلا مکینکل اور الیکٹرونک تھا۔ایک جگہ امریکن تاریخ کے سارے ادوار یکجا کردیئے گئے

تھے۔ ''مین اسٹریٹ'' میں گھوڑے والی ٹرامیں چل رہی تھیں۔ ایک سنیما حال میں خاموش فلم دکھائے جارہے تھے۔ فینسی لینڈ میں اسنو وائٹ اور بونے ایلس کا پورا ونڈر لینڈ، سلیپنگ بیوٹی اور کنگ آرتھر کے قلعے مع دربار اور نائٹ اور ساحر اور سب متحرک اور گویا جھیلوں کے کنارے گھنے جنگلوں میں اصلی ہاتھی۔ سرکس ٹرین فیرنٹیر لینڈ میں کاؤبوائے اور ''انڈین'' اور وائلڈ ویسٹ کے سموچے قصبے۔ پورا لندن شہر۔ اس کے اوپر اُڑتا پیٹر پین۔ ایک دریا کے دونوں طرف پریوں کے مشہور مغربی کہانیوں کے مناظر موجود تھے۔

دریا پر سے تماشائیوں کی کشتیاں گزر رہی تھیں۔ ٹومارو لینڈ یعنی ''کل کی دنیا'' میں سائنس کے عجائبات خلا کا ''بلیک ہول''۔ پھر مارک ٹوئین کی اسٹیم بوٹ'' جو دنیا کے مشہور جنگلوں'' میں بہتے ''دریاؤں'' پر سے گزر رہی تھی۔ ہسپانوی بحری قزاقوں کے جہاز کرسٹفر کولمبس کا جہاز۔ پرانی وضع کی ٹرین نیو اور لینز کے ایک پرانے محل میں مسخرے بھوت ٹام سوائیر کا جزیرہ سولہویں سترہویں میں نئے برّاعظم اور ملک دریافت کرنے والے یورپینوں کے جہاز مغرب نے پچھلے چار سو سال میں جو زبردست ترقی کی ہے۔ اس کا پورا مرقع ڈزنی لینڈ میں انتہائی دلآویز اور ڈرامائی طریقے سے پیش کردیا گیا تھا۔

ڈزنی لینڈ کے نیچے مصنوعی سمندر ہے۔ اس کا ایک حصہ جھیل کی صورت میں نظر آرہا تھا، اس میں ڈبکنی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ہر جگہ سیاحوں کی بھیڑ بچے، جوان، بوڑھے مگر سب خاموش، منظم قطاریں، شوروغل مفقود۔ ایک ڈبکنی کشتی میں اُتر کر عدنان منصور اور میں دریچوں کے سامنے بیٹھ گئے۔ کشتی تہِ آب چلی گئی۔

اب روشن سمندر میں تمام آبی کائنات نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ طرح طرح کی مچھلیاں، سمندری پودے، جغادری گھونگھے، شکستہ بادبانی جہاز اُن کے اندر زیوروں اور قیمتی ظروف سے بھرے صندوق ہر چیز مصنوعی ''سمندر'' کا چکر لگا کر سب مرین اوپر آئی۔

کچھ فاصلے پر رو پہلے قصر اقوام کے گرداگرد ایک ندی بہہ رہی تھی۔ پل پر سے گزر کر سیاحوں کی قطاریں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں ایک قطار میں نہر پر چلتی اس فینسی محل کے اندر داخل ہوئیں جس کے پھاٹک کے اندر عربی سمیت دُنیا کی ہر بڑی زبان میں ''امن'' لکھا ہوا تھا۔

نہر کے دونوں جانب فرش سے بے حد اونچی چھت تک ہر ملک وقوم کے ''بچے''

یعنی گڑیاں اور گڈے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ایک ساتھ انتہائی دلآویز دُھن میں گا رہے تھے
IT'S A SMALL WORLD بہت سی گڑیاں غیر مرئی طور سے معلق فضا میں ناچ گا رہی
تھیں۔ ہر ملک کی گڑیوں کے پیچھے ان کا قومی پسِ منظر تھا۔ ہندوستان کی نغمہ سرا رقصاں
گڑیوں کے پیچھے تاج محل (جس کی سیڑھیوں پر ایک شیر بیٹھا تھا!) ''قصر الاقوام'' کے اندر یہ
ہزاروں کی تعداد میں متحرک گڑیاں گڈے جانور اور پرندے جو سب پلکیں جھپکا جھپکا کر ایک
ساتھ گا رہے تھے۔ انجینیئر نگ کا کمال تھا۔ کس قدر پیچیدہ مشینری اس نازک اور وسیع فینسی کو
چلانے کے لئے کام کر رہی ہوگی۔ مختلف قوموں کے طرزِ تعمیر کی محرابوں (چینی، مراقشی وغیرہ
وغیرہ) نیچے بل کھاتی نہر پر سے گزرتی اس انتہائی خوابناک ماحول میں سے نکل کر کشتی محل سے
باہر آئی۔ وہ گیت برابر جاری رہا۔ قصر الاقوام ڈزنی لینڈ کا حاصل مشاعرہ تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر
گھومنے کے بعد میں نے عدنان میاں سے کہا کوئی اور چیز دیکھنے کے بجائے مثلاً۔
JOURNEY INTO INNERSPACE یا ''ذرّے کے دل کے اندر سفر'' یا ''خلا کا
بلیک ہول۔'' وغیرہ۔ مجھے اس سے قطعی دلچسپی نہیں۔ سائنس سمجھ ہی میں نہیں آتا)۔

ایک بار پھر کشتی میں بیٹھ کر اس روپہلے نغمے کے اندر سے گزرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم
لوگ پھر وہاں گئے وہ رقصاں اور نغمہ سرا گڑیاں گڈے اور وہ گیت ایک ناقابلِ فراموش خواب
تھا جب کہ ایل اے سے دور لونگ بیچ پر دُنیا کا سب سے بڑا جہاز کوئن میری برطانیہ کی عظمتِ
رفتہ کے ایک دھندلے خواب کی صورت میں کھڑا ہے۔ برطانوی شاہی روایات نے اہلِ
امریکہ کو ہمیشہ مسحور کیا۔ اُنہوں نے یہ جہاز خرید کر اسے ایک ٹورسٹ اٹریکشن بنا دیا ہے۔ نیچے
بکنگھم پیلس کے سنتریوں کی وردی پہنے امریکن پہرہ دیتے ہیں اور بینڈ برطانوی دُھنیں بجاتا
ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران کوئین میری ایک فوجی جہاز بنا دیا گیا تھا۔ ایک کیبن کے
باہر لکھا تھا۔ ''ونسٹن چرچل یہاں رہے۔''

ایک دکان میں ایک پنجابی پاکستانی نوجوان اپنے ملک کی گھریلو مصنوعات
فروخت کر رہا تھا۔ تانبے کے گلدان، پشاوری چپلیں، مخملی واسکٹیں، کرتے۔ وہ نوجوان چرچل
کے بعد دُنیا کا نمائندہ تھا۔

ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلز میں ہالی ووڈ بولوار تمام مشہور فلم اسٹاروں کے ناموں سے

مزین ٹائیلوں سے بنی سائیڈ واک پر سے گزرتے منصور میاں چینی تھیٹر دکھلانے لے گئے۔ جس کے فرش کے سیمنٹ میں فلمی اداکاروں کے دستخط اور پنجوں کے نشان ثبت تھے۔ راستے میں ایک آرکیڈ کے نیچے ایک نوجوان چمڑے کی پوشاک میں ملبوس، زنجیریں لگائے، کھڑا اطمینان کے ساتھ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ منصور میاں نے کہا ___

''پھوپھی دیکھیے یہ یہاں کے لیدر پیپل LEATHER PEOPLE میں سے ایک ہے۔'' جس طرح سان فرانسسکو میں زیبا اور منصور العارفین نے وہاں کی یہ عجیب الخلقت مخلوق دکھائی تھی۔ یہ ''چمڑا پوش لوگ'' جنت کی چڑیوں کا گویا ایک ذیلی فرقہ تھا۔ ان کے شراب خانے لیدر بار کہلاتے تھے۔ یہ لوگ نزاکت اور انسانیت کے بجائے اپنی وینگ مردنگی کو مشتہر کرتے ہیں۔ اور چمڑے کے کپڑے پہن کر زنجیروں اور کیل کانٹوں سے لیس ہو کر اوپچی بنے گھوما کرتے ہیں۔

منفرد برطانوی طنز نگار ایلوین واہ نے ۱۹۴۸ء میں کیلی فورنیا کے چند روزہ قیام کے بعد اپنا وہ شاہکار طنزیہ ناول "THE LOVEO ONES" اس خطے کی انوکھی رسوم تجہیز و تکفین کے بارے میں لکھا تھا۔ '' فارسٹ لان کا قبرستان اس ناول کا موضوع تھا۔ سان فرانسسکو میں منصور العارفین نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے بڑے اطمینان سے اپنا تعارف کرایا کہ وہ مردوں کا ہیئر ڈریسر ہے (پسماندگان متوفی کا پورا میک اَپ ہیئر اسٹائل مینس لِفٹ وغیرہ کرواتے ہیں تا کہ آخری دیدار کے وقت متوفی اپنی بہترین حالت میں نظر آئے)۔

فارسٹ لائن میں مشہور عالم فلمی ستارے اور کروڑ پتی مدفون ہیں۔ پھاٹک پر مکان کے سائز کی ایک مرمریں کتاب کے پچھلے صفحات پر اس انوکھے گورستان کے متعلق عبارت نقش ہے۔ اندر ہی ایلوین واہ کے ناول کی سیٹنگ، چوڑی سڑکیں، پرفضا سرسبز ٹیلے، بل کھاتے خیابان، آبشار، چمنستان، جابجا خوشنما گرجا گھر، سبزے کی سطح پر ننھے ننھے کتبے۔ درختوں اور گرجاؤں میں بجتی پوشیدہ موسیقی، پرندوں کی مدھم چہکار، بلبل کے ریکارڈیڈ لقمے۔ پھاٹک کے نزدیک ایک ٹیوڈر عمارت کے اندر دفاتر، مردوں کی بیوٹی پارلر لاشیں حنوط کرنے کا دارالعمل، شام ہو چکی تھی۔ دفاتر بند تھے۔ گلدستوں اور پھولوں کی روشن دکان میں البتہ ایک

لڑکی کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے فوراً ایلویّن واہ کے ناول کی ہیروئن کا خیال آیا۔ عجیب بات ہے، ٹیگور کے شانتی نکیتن میں ایک مرتبہ ایک جلسے کی بھیڑ میں ایک کابلی والا گھومتا پھرتا نظر آ گیا تھا جو شاید مقامی سُود خور پٹھان تھا۔

دفاتر سے کچھ فاصلے پر ایک کوشک کے دریچے میں بیٹھی متبسم خاتون نے فارسٹ لان کا مصور نقشہ پیش کیا۔

شام کے چھ بجنے والے۔ ہم لوگ آخری بلکہ اکیلے سیاح تھے۔ سارا فارسٹ لان بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ ایک چڑھائی پر گئے تاکہ ''ابدی موسیقی اور ابدی راحت کی وادی'' بھی دیکھ لیں، جو نقشے میں اس طرح کے ناموں والی ان گنت جگہوں میں سے ایک تھی۔ سارے قبرستان کو پھر دیکھنا ناممکن تھا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ سناٹے میں ایک سانولا آدمی نچلی سڑک پر بڑبڑاتا ہوا اکیلا چلتا نظر آیا۔ نجانے کون تھا۔ مخبوط الحواس یا بہرہ شکل سے ہندوستانی یا پاکستانی سا معلوم ہوا۔

''اس سے بات کر کے پوچھیں؟'' عدنان نے فوراً ولنٹیر کیا۔

''نہیں بھئی۔ کیا پتہ پاگل ہو۔ اب بھاگو یہاں سے۔'' میں نے کہا۔ ہم لوگ واپس آئے۔ دور سیرا ینوادا کے سلسلۂ کوہ پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک رولز رائس و یز گمبھیرتا سے گزرتی اوپر چلی گئی۔ کیا پتہ کلارک گیبل یا ٹائرن پاور یا لینڈ ڈارنل کا کوئی عزیز یا پرستار پھول چڑھانے آیا ہو۔ ہم لوگ پھاٹک سے باہر نکلے۔ اچانک میری نظر آسمان پر پڑی۔ محرم کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اس جگہ فارسٹ لان کیلی فورنیا میں محرم کا چاند عجیب سا لگا۔ یہ لوگ اس فینسی دُنیا میں رہنے اور فینسی قبرستانوں میں دفن ہونے والے محرم اور اس کی کائنات سے ناواقف ہیں۔ اور واقعہ کربلا کو پہچاننے کے لئے تو تیسری آنکھ چاہیے۔

ٹیلی ویژن پر شروع شروع میں نیوز کاسٹر ایران کو آئی رین کہہ رہے تھے۔ اب اُنہیں ایران کہنا آ گیا تھا۔ ایک روز منصور میاں کے ایک پاکستانی دوست نے مجھ سے کہا۔ ''آج مجھے کالج میں لڑکوں نے ایرانی ایرانی پکار کر بہت تنگ کیا۔ میں نے کہا کہ میں پاکستانی ہوں۔ تو وہ بولے۔ پھر بھی تو مسلمان تو ہو سب مسلمان ظالم ہوتے ہیں اور غیر منطقی اور نیم منطقی اور نیم مجنوں۔ دوسرے دن اسلام آباد کے امریکن سفارت خانے پر حملے کی

خبر آئی۔شام کو وہ لڑکا آ کر بولا'' آج لوگوں نے پاکستانی پاکستانی کہہ کر آوازے کسے۔
''اب کیا کروں؟''

''کہہ دو تم انڈین ہو۔'' میں بولی۔ دوسرے دن کلکتہ اور حیدر آباد کے امریکن قونصل خانوں پر ہندوستانی مسلمانوں نے دھاوا بولا۔اب اس لڑکے نے آ کر کہا۔
''اب انڈین بتانا بھی خطرے سے خالی نہیں!اب کیا کروں؟''

دور ڈزنی لینڈ کے اس خوابناک روپہلے محل میں وہ خوبصورت الیکٹرونک گڑیاں بڑی بڑی معصوم آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسلسل وہ دلنشیں گیت گا رہی ہیں۔ IT IS A SMALL WORLD لیکن یہ بساط عالم صد افسوس کہ بازیچہ اطفال ڈزنی لینڈ نہیں۔کاش کہ ہوتی۔ بچوں کا ایک آرٹسٹ دوست جو شیشے اور چمکیلے ذروں کے موزیک کا منفرد کام تھا۔میری آمد سے قبل اپارٹمنٹ کے لونگ روم کی دیواروں پر اپنی تصاویر چھپا گیا تھا تاکہ میں اُن کو دیکھ کر اس کے ہندوستان جانے کا بندوبست کروں۔وہ تنترک بدھسٹ نیپالی تبتی دیومالا کی تصاویر بناتا تھا۔اور ہندوستان کے سپنے دیکھتا تھا۔مَیں نے اسے مشورہ دیا کہ سا سیٹو جا کر وہاں کسی پکچر گیلری کے ذریعہ اپنی تصاویر فروخت کرنے کی کوشش کرے اور سان فرانسسکو میں ہندوستانی کونسل جنرل سے مل لے۔'' سچے فن کا کوئی قدردان نہیں''۔اس نے آہ بھری۔وہ ہپی نہیں تھا۔ بالکل نارمل شخص تھا۔'' امریکہ میں واحد انسان اس تکنیک کو استعمال کر رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔وہ یونیورسٹی سے آرٹ کی ڈگری لے چکا تھا۔جس روز وہ اپنی تصاویر دیواروں سے اُتار کر ان کو ایک چھوٹے ٹرک میں رکھ کر سان فرانسسکو روانہ ہوا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔نیپال اور تبت جائے بغیر وہاں کے اسرار کی تصویریں بنانے والے اس سفید فام امریکن کے اندرونی خواب نجانے کیا ہوں گے۔اس نے دو تین تصویریں ایرانی فینٹسی کی بھی بنائی تھیں۔نیپال اور تبت اور ایران! کہ خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہے ــــــ

گو سارا امریکہ لوگوں نے اپنے اپنے خواب دیکھتے ہوئے تعمیر کیا تھا۔لیکن امریکہ میں کالوں کا مسئلہ باقی ہے۔لاس انجلز میں ۶۵ء میں نسلی فساد ہوئے تھے۔ایک شام ڈاؤن ٹاؤن میں مٹر گشت کرتے ہوئے عدنان میاں نے مجھ سے کہا۔'' پھوپھی دیکھئے سامنے جو سڑک ہے یہ پورا ایک بلاک کا راستہ بے حد خطرناک ہے۔اگر رات گئے پیدل گزریں تو

کالے عموماً چاقو نکال کر پرس چھین لیتے ہیں۔'' لیکن ہم تو عین اسی سڑک پر کھڑے ہیں اور اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔'' کوئی بات نہیں ہمارے ساتھ نکل چلئے۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔'' ایک دیوار کے سہارے چند کالے کھڑے تھے۔ جس طرح فلموں میں خطرناک لوگ کھڑے دکھلائے جاتے ہیں۔ ہم اُن کے پاس سے گزر گئے۔ انہوں نے ہم کو دیکھا کچھ بولے نہیں۔ بلاک سے نکل کر میری جان میں جان آئی۔ چند روز بعد پھر ہم لوگ اِسی راستے سے گزرے۔ اب مجھ میں ہمت آ گئی تھی۔'' گوروں نے خواہ مخواہ کالوں کو بدنام کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ اپنا پرس مضبوطی سے تھام کر عدنان اور منصور کے ساتھ پھر اس سائڈ واک پر سے گزری کالوں کا جتھا اسی جگہ پر موجود تھا۔ اِن میں سے ایک نے عدنان کو مخاطب کیا۔ میری جان نکل گئی۔ یا الٰہی خیر یا الٰہی خیر۔ عدنان میاں مسکراتے ہوئے ان کے پاس گئے۔ انہوں نے سگریٹ مانگا۔ سگریٹ دینے کے بعد وہ لپک کر ہم سے آن ملے۔

'' آئندہ ہرگز ہرگز رات برات اس سڑک پر سے نہ گزرنا۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔
'' خطرناک شہر ہے۔ تم یہاں رہتے ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے۔''
'' ہمیں معلوم ہے۔'' مطمئن جواب ملا۔

امریکہ میں کالوں کا مسئلہ یقیناً اب بھی موجود ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر وہی ہیں۔ افلاس زدہ محلوں میں وہی رہتے ہیں۔ بیروزگاروں کا سرکاری وظیفہ زیادہ تر اُن ہی کو ملتا ہے۔ گوروں کے مقابلے میں چھ فیصدی زیادہ تر کالی لڑکیاں بن بیاہی مائیں ہیں شکاگو میں ۷۸ء میں نومولود بچوں میں ۴۲ فی صد کو بن بیاہی ماؤں نے جنم دیا تھا اور ان میں ۸۰ فی صد بن بیاہی مائیں کالی تھیں۔ امریکہ میں چار بچوں والا شہری کنبہ جن کی سالانہ آمدنی چھ سات سو ڈالر یعنی تقریباً چار ہزار روپے ہوا سے BELOW NATIONAL POVERTY LINE سمجھا جاتا ہے۔ کالوں کی زیادہ تعداد اس بے حد کم آمدنی والے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

صرف دس دن یہاں گزار کر یہ جگہ بھی کتنی مانوس معلوم ہو رہی ہے۔ نمبر ۱۱۹ نارتھ ریچمونٹ کی مالکن ایک بدمزاج بوڑھی عورت ہے۔ جوانی میں حسین رہی ہوگی اور کیا پتہ جوانی میں یہ بھی ایکٹرس بننے کے ارادے سے یہاں آئی ہو۔ اہلِ دنیا کی کہانی عجیب وغریب ہے مثلاً نکڑ کی دکان پر سیرین بریڈ، یعنی نان بیچنے والا لبنانی یہ یا اس کے باپ دادا کن حالات

میں یہاں پہنچے ہوں گے؟ امریکہ کے تقریباً سارے شہروں میں اس کے بھائی بند مڈل ایسٹرن نان بیچنے والے موجود ہیں۔جس طرح یونانی اطالوی اور البانوی ریسٹوران والے۔اوراس جگہ بھی سارے امریکن قصبوں اور محلوں اور شہری مضافات کی طرح وہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ ایک عالی شان پبلک لائبریری۔ یورپین اور مڈل ایسٹرن ریسٹوران۔ بنک، ہال، سوپر مارکیٹیں، مکانوں کے باغوں میں MOTORIZED LAWNMOWER کی سیٹ پر بیٹھی گھاس ٹھیک کرتی بیویاں۔

''ایل اے'' تجارت اور کامیابی کا شہر ہے۔امریکن خواب کی تعبیر؟ کرسمس آنے والی ہے۔دوکانوں کی سجاوٹ اور چکاچوند اور گہما گہمی میں اضافہ۔''مانا کہ یہ CONSUMER سوسائٹی ہے مگر ہم چیزیں خریدتے خریدتے بھی اُکتا چکے ہیں۔'' ایک روز نوعمر منصور میاں نے مجھ سے کہا۔

ایلن گنز برگ نے اپنی نظم'' کیلی فورنیا کی ایک سوپر مارکیٹ'' میں لکھا تھا۔ والٹ وِٹ مین! سر میں درد لئے پورے چاند کو تکتا گلیوں میں سے گزرتا میں تمہارے متعلق کیا سوچ رہا ہوں! بھوکا اور تھکا ہارا، اور تصویری پیکروں کی تلاش کرتا اور تمہاری فہرست سازی کے خواب دیکھتا میں پھلوں کی ایک جگمگاتی سوپر مارکیٹ میں گیا۔سیب، راہداریوں میں شوہروں کی بھیڑ۔ٹروپیکل ناشپاتیوں میں بیویاں۔ٹماٹروں میں بچے اور تم گارسیالورکا! تم تربوزوں میں کیا کر رہے تھے؟ میں نے تم کو بھی دیکھا۔ بوڑھے لاولد اکیلے۔ والٹ وِٹ مین! تم ریفریجریٹر کے گوشت اور دوکانوں کے ملازم چھوکروں کو تاک رہے تھے۔ میں نے تم کو ہر ایک سے سوال کرتے سنا۔میں تمہارے پیچھے پیچھے گھوما کیا۔ہم گلیاروں میں ٹہلتے رہے۔تمام منجمد نعمتوں کا مزا چکھا۔اور کیشئیر کے پاس سے نہ گزرے۔والٹ وِٹ مین ہم کہاں جارہے ہیں؟ کیا ہم رات بھر تنہا سڑکوں پر گھومیں گے؟ درختوں کے سائے تاریکی بڑھا دیتے ہیں۔ مکانوں میں روشنیاں بجھ جائیں گی۔ہم دونوں تنہا ہوں گے۔محبت کے گمشدہ امریکہ کے خواب دیکھتے مکانوں کے باغات کی سڑکوں پر کھڑی نیلی کاروں کے سامنے سے گزرتے اپنے خاموش کاٹج واپس آجائیں گے؟

آہ۔ پیارے بابا۔ بزرگ عزیز۔ ہمت کا سبق سکھانے والے تنہا بڑے میاں کس

قسم کا امریکہ تمہارا تھا۔ جب شیروتن نے اپنی کشتی کھیئی اور تم ایک دھواں دھواں ساحل پر اُترے اور لیتھ کے سیاہ پانیوں میں کشتی غائب ہوتی دیکھا کیے؟''

ایک شام سن سیٹ بولوار پر سے گزرتے ہوئے محرم کا چاند پھر دکھلائی پڑا۔ دفعتاً خیال آیا جس تاریخ کو آسٹن میں ڈاکٹر گیل مینو نے ڈنر رکھا ہے وہ شاید نویں دسویں کی رات ہوگی۔ گھر واپس پہنچتے ہی پروگرام دیکھا اور گیل مینو کو آسٹن فون کیا۔''گیل مجھے بالکل خیال نہیں رہا جب تم نے آیووا سٹی فون کر کے پروگرام بنایا تھا۔ لیکچر وغیرہ تو ٹھیک ہے مگر ۳۰ رنومبر کو نویں یا دسویں تاریخ محرم کی ہوگی اور میں ڈنر میں شرکت نہ کرسکوں گی۔''

''اب کیا کروں؟'' یونیورسٹی آف ٹیکسس آسٹن کے شعبہ انڈین ہسٹری کی پروفیسر گیل مینو کی آواز آئی۔'' مجھے بھی خیال نہیں رہا کہ وہ عاشورہ ہوگا۔ میں نے ایک مہینہ قبل یہ پروگرام طے کیا ہے۔ یونیورسٹی کے سو کے قریب لوگوں کو تم سے ملوانے کے لئے دعوت نامے بھیج چکی ہوں۔ اب تو وہ دعوت ملتوی نہیں کی جاسکتی۔ مجھے یقین ہے امام حسینؑ معاف کردیں گے۔ تم سفر میں ہو۔ ٹھیک بات ہے نا؟''

''لیکن شب عاشورہ کو ڈنر۔'' میں نے پریشان ہوکر کہا۔

جلال میاں بولے۔'' پھوپھی۔ ہمارے ایک دوست کے پاس اسلامی اور انگریزی مخلوط کیلنڈر ہے۔ ہم اسے فون کر کے صحیح تاریخ پوچھتے ہیں''۔ معلوم ہوا۔ ۳۰ رنومبر گیارہ محرم ہوگی۔ میں نے گیل کو دوبارہ فون کیا۔'' شکر ہے۔'' اُس نے کہا۔'' روانگی سے چند گھنٹے قبل جلال الدین میاں نے گھبرا کر کہا۔'' ارے آپ کو اب تک بیورلی ہلز تو دکھلائے ہی نہیں۔'' اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ ہم لوگ گھر سے نکلے۔ بیورلی ہلز کا چکر لگایا۔ منصور میاں کے بشاش فربہ دوست جمال نے کہا۔'' یہ پھاٹک کھلا ہوا ہے۔ اندر چلتے ہیں۔ یہ جارج ہیملٹن کا مکان ہے۔ کہہ دیں گے غلطی سے آگئے تھے۔ تفریح رہے گی۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ مگر یہاں کسی فلم اسٹار کے پھاٹک پر پہرہ نہیں جیسا ہمارے ہاں کا شیوہ ہے۔''

(امریکہ میں مکانوں کے گرد احاطے کی دیوار یا جنگلہ نہیں ہوتا کیوں کہ آوارہ بکریاں یا گائیں گھاس اور پھول نہیں چریں گی) ہماری اور اُن کی نفسیات میں بہت فرق

ہے۔ ہمارے ہاں احساسِ دولت اور اسٹیٹس سمبلز کا شدید غلبہ ہے۔ جو اُن کے ہاں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، اگر آپ کے فلم اسٹار اپنے پھاٹکوں پر سنتری نہ کھڑے کریں تو شاید اُن کے پرستار عوام اُن کے مکانوں پر ہلّہ بول دیں۔ یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔'' جلال میاں نے کہا۔

ایک جگہ ''بے بی گوڈ بال یوگی گرد مہاراج'' کا محل ایستادہ تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں اہلِ مغرب اس قسم کے لوگوں سے کس طرح مسحور ہو جاتے ہیں دہرہ دون کے ایک معمولی راوت گھرانے کے مکان سے بیورلی ہلز کیلی فورنیا کے اس محل تک کا راستہ صرف اس روحانی طور پر مضطرب اور نا آسودہ اور کنفیوزڈ مغرب کے چیلوں کی وجہ سے ہی طے ہوا۔ HUWL کے آگے اور کیا ہے ایلن گنز برگ؟

رات کے ایک بجے گھر واپس پہنچ کر پیکنگ کی۔ ائیر پورٹ جانے کے لئے سب صبح چار بجے اُٹھ گئے۔ میں نے ٹیلی ویژن کھولا۔ ہالی ووڈ کے کسی سٹیشن سے پرنس کھمبانا کے ارشاداتِ عالیہ سننے کے بجائے میں نے ایک کلیسائی پروگرام لگایا۔ کسی ہسپانوی سروس میں فرشتوں کی ملکہ تقدیس کی جارہی تھی۔ نیوترا اسنورا۔ نیوترا اسنورا۔ ہم سب کے لئے دُعا کیجئے۔ یہ دُنیا بہت رحم کے قابل جگہ ہے میں نے دل میں کہا۔

دریچے کے باہر ہالی ووڈ کی پہاڑیوں پر پَو پھٹی۔ اب ان سرخ صحراؤں کا قصد ہے، جہاں کاؤبوائے اور ریڈ انڈین اب بھی بستے ہیں۔

☆

کاؤبوائے اور ریڈانڈین

ایرکرافٹ جنوبی کیلی فورنیا سے مُڑکر اب جنوب مغربی صحراؤں اور سُرخ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ ریاست ایری زونا کے شہر ٹوسون کا ایرپورٹ کچھ کچھ چک لالہ (راولپنڈی) ایرپورٹ معلوم ہوا۔ امریکن طیران گاہوں کے عام معیار سے بہت مختصر۔ ہوائی جہاز ایرجیٹی کی سقف گیلری سے جا لگنے کے بجائے میدان میں رُک گیا۔ سامنے کے دروازے میں بی بی لبنڈا اوننگ کھڑی نظر آئیں۔ اُن کے پیچھے مشہور انڈولوجسٹ ڈاکٹر مائیکل مہار۔ ریاست اری زونا اپنے صحرائی حسن کی وجہ سے PAINTED PESERT کہلاتی ہے اور ہسپانوی میکزئین تہذیب کی چھاپ۔ دیوپیکر کیکٹس۔ چاروں طرف خشک پہاڑ۔ شدید گرم، یورنیورسٹی کے پوئیٹری سنٹر کے مہمان خانے میں چہار دیواری والا عقبی صحن۔ عرب اندلسی مکانوں کی صدیوں پار سے آئی ہوئی آواز بازگشت۔

کھانے والے کمرے کی دیوار پر سوویت یونین کا یوجینی یونیسکو ایک پوری نظم انگریزی میں لکھ گیا تھا۔ باورچی خانے کے دریچے کے باہر زرد پھولوں والا گھنا درخت۔

شام کو یونیورسٹی پولیس کی خاتون افسر نے آکر خیریت دریافت کی۔

صحرائی راتوں میں وسعت اور تاریکی اور سناٹے کا احساس زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صحرا کی ان تنہا رویوں یعنی گلہ بانوں نے جو کاؤبوائے کہلائے۔ اپنی خیمہ گاہوں اور چوبی کاٹجوں کے سامنے یا الاؤ کے گرد سیاہ آسمان کے نیچے بیٹھ کر گٹار بجاتے ہوئے وہ نغمے

تخلیق کئے۔

اس اندھیری رات میں کیمپس سے بہت فاصلے پر ہندی پروفیسر انوپ چنڈ والا کے رولا کے روشن مکان میں اگر استعارے کو آگے لے جایا جائے تو یوں کہئے کہ میدان علم کے نئے کاؤبوائے جمع تھے۔ اور کاؤگرلز ڈاکٹر لزلی فلیمنگ (آگ کا دریا پر جن کا طویل مقالہ جرنل آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں شائع ہوا تھا۔) ایک پاکستانی پنجابی نوجوان ڈاکٹر ریاض جو یونیورسٹی کے عربی فارسی مخطوطات کے نگراں تھے اور بہت سے امریکن پروفیسر اور پروفیسرنیاں جن کو ڈاکٹر اور مسز چنڈ والا نے راقم الحروف سے ملوانے کے لئے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مع ایولین اور رابرٹ۔ روی جو بسلسلۂ ریسرچ لکھنؤ میں رہ چکے تھے۔

ذرا ایک منٹ ٹھہریئے۔ مغرب کے ذخائر علوم وفنون شرقیہ۔ یوری انڈیا آفس لائبریری سارا برٹش میوزیم ہندوستان کے تمام کتب خانے۔ ہندوستان کے ایک سائیکل رکشا کھینچنے والے کے لئے بے معنی ہیں۔ کیوں کہ اس کی کچھ مدد نہیں کرتے۔

کسی بھی مغربی کیمپس پر جا کر کبھی کسی کو یہ خیال آتا ہے کہ مثلاً علی گڑھ یا لکھنؤ، الہ آباد یا ڈھاکہ یا اور کوئی یونیورسٹی ٹاؤن ہندوستان اور بنگلہ دیش میں ایسی جگہیں ہیں چند ہزار نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے ہم قوم مفلوک الحال مدقوق نوجوان یا بوڑھے چلچلاتی دھوپ اور لو یا کڑکڑاتے جاڑے یا برسات میں سائیکل رکشا کھینچتے ان طلباء اور ان کے استادوں کو یونیورسٹی لاتے لے جاتے ہیں۔

اب میں ڈاکٹر چنڈ والا کے ڈرائنگ روم آپ کو واپس لئے چلتی ہوں۔ موصوف بہت ہی خلیق اور بھلے آدمی تھے۔ گڑھواں کے باشندے۔ یہاں اٹھارہ سال سے پڑھا رہے تھے۔ اُن کی بیوی بھی بہت ملنسار اور نیک خاتون تھیں۔ ہندی گیتوں میں دیوی کے تصور پر ڈاکٹریٹ کر چکی تھیں۔

شکتی کے تصور کی تجسیم مختلف ہے۔ بنیادی تصور یکساں ہے اور علامہ اقبال کو تو دیو استبداد اور جمہوریت کی نیلم پری دونوں ایک سے معلوم ہوئے تھے۔

دوسرے روز اسکول آف جرنلزم کے صدر شعبۂ ڈاکٹر فورڈ کی ایک کلاس میں راقم الحروف نے انڈین جرنلزم پر لیکچر دیتے ہوئے ڈاک ہرکاروں کے ذریعے سرکاری خبر رسانی

درباری وقائع نویسی کا تذکرہ کیا جو سامعین کے لئے بالکل غیر متوقع چیز تھی، کیوں کہ وہ ہندوستان کے اٹھارہویں صدی سے شروع ہونے والے چھاپے خانوں اور اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہ جانتے تھے۔

ایک دلچسپ بات ہے۔عہدِ وسطیٰ میں عرب کاغذ سازی نے اسلامی تہذیب دنیا میں پھیلائی تھی۔پندرہویں صدی یوروپ میں چھاپے کی ایجاد کے کچھ عرصے بعد مارٹن لوتھر کی اصلاحِ دین کی کامیاب اشاعت ہوسکی۔آج کے ایران میں آیت اللہ خمینی کی تقریروں کے کیسٹ شاہ کی شہنشاہیت کے آخری دنوں میں ایران میں گھر گھر بجائے گئے تھے۔اس روز دور دراز طہران میں امریکن یرغمالیوں کی قید کا شاید تیسواں دن تھا۔لیکچر کے دوران ایک لڑکا ٹیلی پرنٹر کا کاغذی فیتہ لالا کر میز پر رکھتا جارہا تھا۔اس پرچیی ہر ایران کے متعلق ہر خبر کے آخر میں دو الفاظ درج تھے۔ ——— SLUG KHOMEINI اس پیانے کے قومی غم و غصے اور تنفر کا اظہار پچھلی جنگِ عظیم میں جرمنوں کے خلاف ہی کیا گیا تھا۔

تیسرے روز پروفیسر فورڈ نے بے حد تعجب سے بار بار پوچھا۔" آج انہوں نے چند امریکن عورتوں کو رہا کر دیا ہے۔عورتوں کو کیوں رہا کیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

"بہت ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ شیعہ اسلام میں فاطمہؓ بنت رسولؐ خاص اہمیت کی مالک ہیں علاوہ ازیں شیعہ مذہبی قانونِ وراثت وغیرہ بھی عورتوں کے لئے زیادہ منصفانہ ہے۔ممکن ہے اسی لئے یہ ایرانی علماء عورتوں کو کچھ اہمیت دیتے ہوں۔مگر چند ماہ بعد ماہرِ تعلیم خانم پارسا کو گولی سے اُڑا دیا گیا۔

اس صبح (ADVANCED JOURNALISM) کی کلاس میں مَیں نے ایرانی تاریخ میں شاہ اور ملاّ کی آویزش، شیعہ اسلام میں امامت کے تصور وغیرہ کے متعلق ایسے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کی جو مسئلۂ خلافت و امامت تو خیر بہت آگے کی بات ہے، اسلام ہی سے قطعاً ناواقف تھے۔

ڈاکٹر فورڈ نے بعد میں اس کلاس سے کہا کہ اس لیکچر پر مبنی ایک اسٹوری ایران پر تیار کرے۔(ہر امریکن یونیورسٹی کے مدرسہ صحافت کی طرح اس اسکول آف جرنلزم کا بھی اپنا ضخیم روزانہ اخبار تھا جسے طلباء شائع کرتے تھے۔)

تیسرے پہر کو میں ڈاکٹر مائیکل مہار کے ساتھ لفٹ میں اوپر جا رہی تھی۔ ایک فلور پر ایک صاحب پھرتی سے داخل ہوئے۔ ''میں ابھی واشنگٹن سے واپس آرہا ہوں۔ بھاگا بھاگا گیا تھا کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ والوں کو ایران کے متعلق کچھ سمجھاؤں میں نے بچشم خود تہران میں شاہ کے مخالف مظاہرین کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا ہے اور ان کو مارنے والے فوجی امریکن اسلحہ جات سے لیس ہوتے تھے۔ امریکہ سے اس شدید تنفر کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مگر وہاں کسی نے میری نہیں سنی۔'' اتنا کہہ کر وہ صاحب ایک فلور پر اسی سرعت کے ساتھ لفٹ سے نکل گئے۔

یہ صدر شعبۂ فارسی تھے۔ ڈاکٹر مہار نے بتایا شام کو شیعہ علوم شرقیہ میں ''وزٹنگ انڈین میوزیم جرنلسٹ'' کے لئے پارٹی کے دوران فارسی ادبیات کے وہ خوش رفتار و خوش گفتار امریکن پروفیسر پھر ملے۔ فارسی ایرانی لب و لہجے میں بولتے تھے۔ دو سال ایران میں رہ چکے تھے۔ پارٹی کے دوران ایک مصری پروفیسر سے میں نے دریافت کیا۔ مصر میں قبطیوں کو کیا بہت تنگ کیا جاتا ہے؟''

''نہیں۔ مگر وہ امریکہ آکر یہی کہتے ہیں تاکہ ہم مذہب عیسائی امریکنوں کی ہمدردی حاصل کریں، اور گرین کارڈ مل جائے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

یہ بات بھی مجھے سو فیصدی صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اسلامی انتہا پسند مصر میں آج کل قبطی گرجا پر حملے کر رہے ہیں۔

دُکھی دُنیا کے ان ہولناک مسائل سے بے نیاز کیمپس پر ایک جگہ گھاس پر بیٹھے ہرے کرشنا والے امریکن چھوکرے کیرتن گا رہے تھے۔ ایک لڑکا ہارمونیم بجا رہا تھا۔ ایک ڈھول اُن کے لٹریچر کی کتابوں کا انبار سامنے رکھا تھا اور ایک ___ " JESUS FREAK " نوجوان ایک سرمُنڈے امریکن سنیاسی کی ناک کے نیچے بائبل ٹھونس کر مناظرے میں مصروف تھا۔ بے حد دلچسپ بحث جاری تھی۔ ہندو یوگیوں کے پھیلائے ہوئے CULTS کے ردِ عمل کے طور پر نوجوانوں میں چند عیسائی فرقے بھی نمودار ہو چکے ہیں۔ " JESUS FREAKS " ان میں سے ایک گروہ ہے۔

ایک ساڑی پوش خاتون کو قریب سے گزرتا دیکھ کر سنیاسیوں نے بڑی خوشی سے

''ہرے کرشنا!'' کا نعرہ لگایا۔ میں نے نہایت متانت سے اس کا جواب دیا۔ شِوا شِوا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ اُن کے چہرے اُتر گئے۔ اور وہ پھر اپنے ڈھول مجیرے اور مناظرے کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہرے کرشنا والے امریکنوں کے سامنے شِوا کا نام لو تو بہت خفا ہوتے ہیں۔'' میں نے لنڈا سے کہا۔ ''مکمل مفاہمت دیوتاؤں میں بھی نہیں ہے۔ تو قبطیوں اور مسلمانوں اور ایرانیوں اور امریکنوں اور عربوں اور اسرائیلیوں میں کیسے ہوگی۔''

ایرپورٹ سے شہر جاتے ہوئے مَیں نے پروفیسر مہار سے کہا تھا کہ ''ورمونٹ کے گھنے رنگ برنگے جنگلوں اور کوہساروں کے بعد یہ صحرا کس قدر مختلف ہے۔ کیا تم کو مشرقی ساحل کی کسی یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا؟''

''پن سلوینیا اور شمال میں منی سوٹا مَیں وہاں گئی نہیں۔ وقت نہیں ملا۔ ورمونٹ میرے کزن نے بلایا تھا۔ ایرٹکٹ بھیج دیا تھا۔''

پروفیسر مائیکل مہار نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ دوسرے روز اپنی کھچا کھچ بھری عمرانیات کی کلاس میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا جب یہ بمبئی سے آیووا سٹی پہنچیں تو آیووا سٹی سے برلنگٹن تک جانے کا ایرٹکٹ پہلے سے اُن کا منتظر تھا جو ان کے کزن نے کینیڈا سے بھیجا تھا۔ یہ یگانگت اس معاشرے کی خصوصیت ہے۔ جس میں EXTENDED خاندان کو اصل خاندان میں شامل سمجھا جاتا ہے۔''

''آپ کو یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوئی لیکن ہم لوگوں کو آپ کا معاشرہ عجیب لگتا ہے جس میں ''اصل'' خاندان اور EXTENDED خاندان میں فرق کیا جاتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

مغرب میں رشتہ داروں کی اجنبیت ہم لوگوں کو ہمیشہ متحیر کرتی ہے۔ مَیں مغربی جرمنی میں ایک ایسے میاں بیوی کو جانتی ہوں۔ میاں ہندوستانی ہیں۔ بیوی جرمن۔ جب کبھی وہ لڑکی اپنی ماں کو اپنے بچے کے چند گھنٹے کی ''بے بی سٹنگ'' کے لئے بلاتی تھی بطور معاوضہ ماں کے لئے قیمتی تحائف رکھ جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں نانیاں دادیاں خود تحائف لا کر بے تکان بے بی سٹنگ کرتی ہیں۔''

''اسی لئے جوائنٹ فیملی کے متعلق کچھ بتاؤ۔'' ڈاکٹر مہار بولے۔

جوائنٹ فیملی اور کاسٹ سسٹم وغیرہ پر آپ خود کافی لیکچر دے چکے ہوں گے لیکن میرے خیال میں آپ کے شاگرد یہ بالکل نہیں جانتے کہ یہ زندگی کس قسم کے مکانوں میں گزاری جاتی تھی۔'' میں نے بلیک بورڈ پر ایک روائتی انڈو مسلم ''مردانہ'' اور ''زنانہ'' مکان کا نقشہ بنایا۔ دالان۔ دردالان کے اندر ایک قطار میں بچھے پلنگ۔ صحنچیاں۔ آنگن۔ مشرق کی گھریلو اجتماعی زندگی میں فرد PRIVACY کا تصور تقریباً مفقود تھا۔

مرزا ابوطالب اصفہانی جو کلکتے سے ۱۷۹۹ء میں ڈبلن گئے تھے۔ انہوں نے ایک آئرش مکان میں قیام کر کے حیرت کے ساتھ قلم بند کیا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں ہر کام کے لئے الگ الگ کمرے ہیں۔ کھانے کا کمرہ الگ۔ سونے کا الگ۔ بیٹھک کا الگ۔ اور باورچی خانے میں قیمہ اور پیاز کاٹنے کے لئے آہنی مشینیں اور برِصغیر ہندو پاکستان و بنگلہ دیش کے روایتی مکانات آج بھی اسی طرح کے ہیں جیسے مرزا ابوطالب کے زمانے میں تھے اور جو تعجب مرزا ابوطالب کو آج سے پونے دوسو سال قبل انفرادیت پرست مغرب میں پہنچ کر ہوا تھا۔ اسی تعجب سے امریکن طلباء مشرقی طرزِ زندگی کے متعلق سن رہے تھے۔ مغرب میں آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں بھی بغیر اطلاع یا بن بلائے بلا اجازت اچانک نہیں پہنچ سکتے لیکن اسی وجہ سے آپ کو ماہرینِ نفسیات اور سوامیوں سے اپوائنٹمنٹ لینے پڑتے ہیں۔ میں نے کہا۔

شام کو یونیورسٹی کے ایک آڈی ٹوریم میں ''اسلام میں عورتوں کا درجہ'' پر لیکچر دیتے ہوئے محسوس ہوا کہ سامعین کے لئے اسلام بھی ایک دوسرے کرّے کی چیز تھی۔ یہ موضوع اس وقت ڈاکٹر فورڈ اور ڈاکٹر فلیمنگ نے اسلامی ممالک میں انتہا پسند تجدیدیت کی لہر کے مدِ نظر تجویز کیا تھا۔ ''جرم''۔ ''چار شادیاں'' ''پردہ مسلم عورتوں کی کم تر حیثیت'' وغیرہ عام تصورات اور سعودی عرب اور ایران کے موجودہ حالات کے مناظر میں ایک پیچیدہ اور نازک موضوع تھا۔ اسلام میں حقوقِ نسواں اور اسلامی تاریخ میں عورتوں کے اہم رول وغیرہ کے متعلق بے حد وضاحتی اور تقریباً تبلیغی لیکچر کے بعد حسبِ معمول آیت اللہ خمینی کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ۔

آپ کہتی ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ سب حقوق دیئے ہیں۔ مگر ملا خمینی نے تو

پردے کا حکم صادر کیا ہے۔ آپ کہتی ہیں اس روایتی پردے کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ ورنہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھلے منہ حج کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ اور آپ نے کہا اسلام میں چرچ اور CLERGY نہیں ہے۔ تو پھر یہ ایران کے آیت اللہ لوگ کون ہیں؟'' امریکنوں نے سوال کیا۔

سامعین میں ایک نہایت جوشیلے پاکستانی مسلمان بھی موجود تھے۔ انہوں نے میری تقریر پر نہایت کٹر ملا پن کے اعتراضات کئے۔

جس وقت میں نے کہا۔ مغربی عورتوں کو شوہر سے علیحدہ اپنی جائداد رکھنے کا حق اب جا کر ملا ہے۔ قرآن نے یہ حق چودہ سو برس قبل دیا تھا وغیرہ۔ اس وقت سامعین ایک امریکن لڑکی۔ ''بالکل ٹھیک''۔ ''بالکل درست'' کہے جا رہی تھی۔ شہر ٹوسون کے روزنامے کے دو رپورٹر اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ ان کے سوالات سے نپٹنے کے بعد ہال سے باہر نکلنے لگی تو وہ لڑکی سامنے آئی اور مصافحے کے بعد گرم جوشی سے بولی ''السلام علیکم''! میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ قطعی شرعی لباس۔ پیشانی تک اسکارف لمبی آستین۔ ٹخنوں تک لمبا فراک۔ ''مرحبا۔ اسلام آج کل اتنا بدنام ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کی صحیح صورت پیش کی۔'' اس شرعی امریکن لڑکی نے کہا۔

''کیا تم اسلامی تاریخ کی طالب علم ہو؟۔'' میں نے دریافت کیا۔

''الحمد للہ کہ میں خود مسلمان ہوں۔ وہابی مسلمان۔''

لیجئے صاحب۔ اب تک امریکن ''ہندو'' صافے اور کرپانیں باندھے امریکن ''سکھ'' لڑکے لڑکیاں نظر آتے تھے۔ اب تبلیغی جماعت کی کوشش سے اِکا دکا طالب علم مسلمان بھی ہونے لگے اور وہ بھی FUNDAMENTALIST ۔ کیوں کہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے والوں کو اس مذہب کا انتہا پسند روپ ہی بھاتا ہے۔ ہرے کرشنا والے مغربی لوگ ہندوستان کے پیدائشی سناتن دھرم ہندوؤں سے کہیں زیادہ کٹر ہیں یہ CONVERT کی نفسیات ہے۔

دوسری صبح شہر کے اخبارات میں مفصل دو کالم کی رپورٹیں چھپیں۔ ''موزلم جرنلسٹ کا کہنا ہے۔'' ایران کی صورتِ حال کے متعلق موزلم جرنلسٹ کا خیال ہے کہ یہ ایران کی

انتقامی کارروائی ہے کیوں کہ سی آئی اے کی مدد سے شاہ ______ وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ امریکہ کو چاہئے کہ ایران کا یہ مطالبہ کہ شاہ کے جرائم کی تحقیقات کی جائے منظور کر لے۔'' وغیرہ وغیرہ لفظ ''انڈین'' وہاں عموماً ان قبائل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جن کو ہم ریڈ انڈین کہتے ہیں۔

ریاست آری زونا نوا ہو اور ہو پی انڈین قبائل کا وطن ہے۔ کیلی فورنیا کے ساتھ اری زونا اور ٹیکس بھی میکز یکو نے جنگ میں ہار کر امریکہ کو دے دیئے تھے لیکن ''سرخ ہندوستانی'' قبائل سے گورے مہاجروں کی لڑائیاں جاری ہیں۔ اپاش قبیلے سے بیس سالہ جنگ ۱۸۸۶ء میں جیتی گئی تھی۔ گایوں کے ریوڑ پالنے والے RANCHERS نے گلوں کی حفاظت کے لئے کاؤبوائے نوکر رکھے۔ امریکن رومانس کی تخلیق، سرخ ہندوستانیوں اور ڈاکوؤں کے علاوہ خود بھیڑ پالنے والوں، گائے پالنے والوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ مزید کاؤبوائے رومانس۔

''کوئی ریڈ انڈین بستی دکھلایئے۔'' میں نے پروفیسر مہار سے کہا۔

اس روز بڑی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایولین دردی اور لنڈا کے ساتھ ڈاکٹر مہار کی کار میں صحرا کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سُرخ مرچیں نظر آئیں۔ جو دھوپ میں سکھائی جارہی تھیں۔ مرچیں میکزیکن کھانوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

میکز یکو کی سرحد پار کر کے ہر سال تقریباً تیس لاکھ میکزیکن اور باقی جنوبی امریکہ کے لوگ غیر قانونی طور پر براہِ ٹیکسس امریکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ پریشان حال تیسری دنیا امریکہ کی سرحد سے شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن خود امریکہ کے اندر ہر شخص مصروفِ عیش نہیں ہے۔

چند خستہ حال مکان دکھائی دیئے جن کے سامنے کھٹارا کاریں کھڑی تھیں۔ چند ریڈ انڈین ان کھٹارا کاروں کے انجنوں پر چڑھے کاہلی سے تمبا کو پی رہے تھے۔ کچھ بہت ہندوستانی سا منظر تھا۔ سستی اور بے پرواہی۔

''چراغ تلے اندھیرے۔'' میں نے اظہارِ خیال کیا۔

''یہ لوگ کاہل ہیں اور اپنا طرزِ زندگی بدلنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر مہار نے کہا۔'' لیکن

اب پچھلے دس سال سے اُن کے ہاں بھی سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے۔''

''کمال ہے۔ کالوں نے لڑ بھڑ کر، دکھ اُٹھا کر، قربانیاں دے کر امریکن کلچر میں اپنا اہم مقام حاصل کرلیا۔ موسیقی، ادب، تعلیم، سیاست ہر جگہ مگر ملک کے یہ باشندے اور اُن کا یہ حال، اُن کی اپنی یونیورسٹیاں اور اپنی موسیقی اور اپنے اخبار ہونے چاہئیں تھے۔ آخر وجہ کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''بہت سے انڈین ملک کی سفید فام آبادی میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں۔ اور اُن کی اکثریت پس ماندہ رہ کر اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

بستی کا انڈین کمیونٹی سینٹر سنسان پڑا تھا۔ احاطے کی دیوار پر ایک انڈین لڑکا بڑی چابکدستی سے ایک قبائلی رقص کا فریسکو بنانے میں مصروف تھا۔ وہ سوالات کا مختصر جواب دیتا رہا۔ نا مسکرایا نہ خود سے کوئی بات کی۔ سینٹر سے نکل کر ہم لوگ شاہراہ کے کنارے ایک میکزیکن ریسٹوران میں گئے۔ میکزیکن انڈین مخلوط النسل لوگ سرخی مائل رنگت، کھڑا نقشہ ___ کچھ ہریانہ کے جاٹ سے معلوم ہوتے تھے۔ (ریڈ انڈین قبائل دراصل منگولین لوگ تھے جو ہزار سال قبل آبنائے بیرنگ عبور کر کے سائبیریا سے امریکہ پہنچے تھے۔) سولہویں صدی عیسوی میں ہسپانوی اور پرتگالی فاتحین نے مایہ اور ازبک وغیرہ پوری تہذیبیں اُجاڑ ڈالیں۔ مگر جب باقی ماندہ (انڈین) رومن کیتھولک ہو گئے تو ہر جگہ اور جنوبی امریکہ اور ادھر گوا اور فلپائن میں مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کرتے رہے۔ انگریز اور دوسرے شمالی یورپین اور پروٹسٹنٹ فاتحین کے برعکس ان لوگوں میں نسلی تعصب نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ اُن کے اندلسی عرب ورثے کا لاشعوری اثر تھا۔ یعنی یہ کہ جب مفتوح زمی یا کافر نے اسلام قبول کیا تو بلا تخصیص رنگ و نسل امت میں شامل کرلیا گیا۔

سیاہ چشم میکزیکن ویٹرس نے مرچوں والا کھانا پیش کیا۔ ایک ریڈ انڈین لڑکی اپنا قومی لباس پہنے بال میں ایک پر لگائے ریسٹوران سے نکلی اور اپنی کار ڈرائیو کرتی روانہ ہوگئی۔

اور آگے ریگستان کے وسط میں ایک سفید رنگ کا ہسپانوی کیتھرن تیز نیلے آسمان کے مقابل میں ایستادہ تھا۔ سامنے دیوقامت کیکٹس۔ اندر مذہبی تصاویر اور شمعوں کے ہجوم میں ایک حنوط شدہ نوجوان راہب شیشے کے تابوت میں خوابیدہ اس کے سیاہ لبادے پر پنوں

کے ذریعے بے شمار تصاویر ٹانک دی گئی تھیں۔

زیادہ تر تصویریں نوجوان فوجی سپاہیوں کی تھیں۔ جو اُن کی ماؤں نے ان کی منتیں مان کر اس مقدس پادری کے کفن پر ٹانک دی تھیں۔

جب ہم لوگ ٹوسون واپس آرہے تھے۔ وہ ریڈ انڈین اسی طرح اپنی کاروں کے انجنوں پر چپ چاپ بیٹھے تمباکو پیتے نظر آئے۔ کالوں کی مانند یہ لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟

''اب ایک کاؤبوائے اسٹور بھی دیکھتی چلو شاید وہاں کاؤبوائے بھی نظر آجائے۔'' ڈاکٹر مہار نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''اس دکان میں گھوڑوں کی مرصع زین چمڑے کے ملبوسات، ٹوپیاں، ایڑی والے مرصع جوتے، مرصع پیٹیاں کٹار۔ غرضیکہ پورا کاؤبوائے سازوسامان بک رہا تھا۔ برآمدے کے باہر گھوڑا باندھنے کی کھونٹیں بھی موجود تھیں۔ جب گلہ بانی کمپیوٹر اور راڈار اور REMOTE CONTROL سے شروع ہوگی۔ کاؤبوائے بھی معلوم ہوجائیں گے۔

رات کو لنڈا کے ہاں دعوت میں اُن کے ماہر موسمیات شوہر نے نہایت نفیس کھانا تیار کیا تھا۔ معہ مرچوں والی میکزیکن مسور کی دال، باقی مہمان ایک ایک ڈش ساتھ لائے تھے۔ ڈاکٹر ریاض کے بیوی بچے چند روز بعد لاہور جانے والے تھے۔ ڈاکٹر اور مسز چنڈولہ کچھ عرصہ قبل ہندوستان ہوآئے تھے۔ وہی معاملہ یہاں ہر طرح کی آسائش تھی۔ مگر دل وطن میں اٹکا تھا۔

لنڈا کے اونچی چھتوں والے بنگلے میں برطانوی ہند کی چھاؤنیوں کے بنگلوں کی جھلک موجود تھی۔ دشتِ اری زونا کے پرانے کیمپ ماحول اور گرم موسم نے یہ اسٹائل تخلیق کیا ہوگا۔

لنڈا اُردو جدیدیوں کے بارے میں مقالہ لکھنے میں مصروف تھی۔'' یاد رکھو اگر تمہارے بجائے تیسری دُنیا کی کوئی لڑکی، الجیرین، یا تھائی لینڈ یا انڈونیزیا سے یا کوئی کالی امریکن ہی یہ مقالہ لکھنے ہندوستان و پاکستان آتی۔ اُردو حلقوں میں اسے اس قدر اہمیت نہ دی

جاتی لیکن تم سفید فام ہو۔اور امریکن ہو ہمارا COLONIAL HANGOVER ابھی زائل نہیں ہوا ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ایک مرتبہ رالف رسل نے مجھ سے اظہارِ خیال کیا تھا کہ لوگ ان کو اس لئے زیادہ قابلِ ذکر سمجھتے ہیں کہ ایک انگریز اُردو پڑھتا پڑھاتا ہے۔
اوراب، دس گیلن وزنی ہیٹ پہننے تیل کے کروڑ پتیوں کے دیس ٹیکس جارہی ہوں۔

تنہا ستارہ

ساری دنیا کے بچے اور قبل از بلوغ سطح کے ذہن کے لوگ ہالی ووڈ کے HORSE OPERAY پر عاشق ہیں۔ امریکن ''وائلڈ ویسٹ'' کے یہ کردار سر شہسوار دستے یعنی RANGERS شیرف۔ بہادر اور نیک دل اور اصول پرست کاؤبوائے بدطینت اور بے رحم آؤٹ لا اور مجرم اور ڈاکو یہ گویا ایک _____ MODERN MORALITY PLAY کے علامتی کردار تھے۔ مجھے ایک اندوہناک کاؤبوائے گیت یاد آیا۔

امپرنیٹ کے زمانۂ ادارت میں بعنوان GUN IS A GUN IS A GUN رابرٹ کینیڈی کے قتل کے بعد امریکہ میں بندوقوں اور پستولوں کی فراوانی پر ایک مضمون لکھا تھا۔(صدر کینیڈی بھی ٹیکسس کے شہر ڈیلاس میں مارے گئے تھے۔)

تو اس کاؤبوائے گیت سے میں نے وہ مضمون امپرنٹ میں شروع کیا تھا۔ اور وہ گیت یوں تھا۔

''صبح منہ اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر RANOG پر گیا وہاں مجھے سفید لینن میں ملبوس کوئلے جیسی سیاہ آنکھوں اور لہراتے بالوں والا ایک نوعمر کاؤبوائے دکھائی پڑا۔ اپنے دوست اور عزیز میں بوسٹن میں چھوڑ آیا۔ میرے ماں باپ کو پتہ نہیں میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں پہلے ٹیکسس گیا اور ایک RANOG پر نوکری کر لی۔ میرے سینے پر گولی آن لگی اور موت میرا مقدر ہے۔''

پروفیسر آرنلڈ ٹوئینبی کا کہنا ہے۔'' شمالی امریکن کاؤبوائے ، جنوبی امریکن۔ GAUCGOS (امریکن، یوروپین، ریڈانڈین،مخلوط النسل،شہسوار گلے بان) اور آسٹریلیا کے ریور ہانکنے والوں نے از منہ رفتہ کے سینتھین ،تا تاری اور عرب شہسواروں کی طرح دنیا کو مسحور کیا۔ امریکن اور آسٹریلین STEPPES (وسیع چراگاہوں کی امکانی قوت اتنی زبردست تھی کہ انہوں نے زرعی اور صنعتی تمدن کے پروردہ لوگوں کو کم از کم ایک نسل کے لئے خانہ بدوشوں میں تبدیل کر دیا جب کہ ان خطوں کے اصل باشندوں نے گلہ بانی کی بجائے محض۔ PASTORALPRE سطح پر شکار کر کے جانور مارنے اور کھانے کے طرزِ زندگی پر اکتفا کیا۔اور اس سے آگے ترقی نہ کی۔

ٹیکس LONE STAR STATE کہلاتی ہے اور LONE RANGER ایک رومانی شہسوار کردار ہے۔

چنانچہ ٹیکسس پہنچ کر آپ ہوپ ایلونگ کیسڈی اور رائے روجرز وغیرہم کے پسِ منظر کی جھلکیاں دیکھنے کی اُمید تو رکھ سکتے ہیں مگر محمدی بیگم مرحومہ اڈیٹر تہذیب نسواں کی حیات اُن کی بہن کی ہاتھ کی ایک کاپی بک پر لکھی ذرا غیر متوقع چیز ہے۔

جب ڈاکٹر گیسل میمنو نے مجھے آیوواسٹی فون کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ ہندوستانی مسلم عورتوں کی اوّلین تعلیمی تحریک پر کام کر رہی ہے اور اس سلسلے میں محمدی بیگم، عبداللہ بیگم، نذر سجاد حیدر، وغیرہ پر کافی ریسرچ کر چکی ہے۔ گیلی کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر ملنسار اور دلچسپ لڑکی ہے۔ بالفاظِ دیگر چنڈوخانے کی ایک رُکن۔ (اس رُکنیت کو آپ محض اپنی چھٹی حس کے ذریعے ہی پہچان سکتے ہیں۔)

ٹوسون سے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ٹیکسس کا شہر آسٹن جس کے ایرپورٹ پر منتظر گیل مینو ویسی ہی نکلی جیسی توقع تھی۔

'' گیل یونیورسٹی آف ٹیکسس ایٹ آسٹن میں انڈین ہسٹری پڑھاتی تھی۔ اور علی برادران اور خلافتِ تحریک پر اس کی کتاب نیویارک سے چھپنے والی تھی۔ (اب شائع ہو چکی ہے)

اری زونا بھن رہا تھا۔ یہاں شدید سردی تھی۔ آسٹن خوبصورت شہر تھا۔ موسمِ خزاں

کے زرد عنابی درختوں سے معمور کیمپس کے نزدیک ایک خیاباں کے کنارے جولا رل لین کہلاتا تھا۔ گیل کا مکان سنہرے درختوں میں پوشیدہ تھا۔ دوسری منزل پر مہمان کمرے کی دیواروں پر ایک انگریز نما بزرگ کی تصویریں آویزاں تھیں۔

''ہاں۔ بوب کے دادا انگریز تھے۔ امریکہ آ گئے تھے۔ میں خود فرانسیسی نژاد ہوں۔، بوب یونیورسٹی میں امریکن ہسٹری پڑھاتا ہے۔''

''گیل چار سال لکھنؤ میں رہ چکی تھی جہاں اس کا پہلا شوہر بسلسلہ CARE تعینات تھا۔ اسکا خورد سال بچہ ٹام لکھنؤ میں خدا کو پیارا ہوا تھا۔ اور وہ پلٹتے ہوئے ایک بچی متبنٰی کرلائی تھی۔ اس کا نام لیلٰی رکھا تھا اور اسے شہزادیوں کی طرح پال رہی تھی۔ میں نے شروع شروع میں اس سے اُردو بولی لیکن وہ یہاں رہ کر خود ہی اُردو بھولتی جا رہی ہے۔''

گیل نے بوب کے انگریز دادا کی تصویر کے نیچے چمڑے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ باہر زرد پھولوں والے درخت پت جھڑ کی ہواؤں میں سائیں سائیں کررہے تھے۔ آج سے ساٹھ ستر سال بعد لیلٰی کی پوتیاں کہیں گی۔ ہماری دادی ہندوستان سے آئی تھیں۔ (اگر دنیا اس وقت تک باقی رہی)

''ہندوستان میں بہت دنوں تک کئی مرتبہ تمہارے تعاقب کی کوشش کی۔ مگر ملنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں اپنی کتابوں کے سلسلے میں بھی بہت سے سوالات کرنا چاہتی تھی۔ عصمت اور تہذیب نسواں کے تو میں نے سارے فائل کھنگال ڈالے۔'' گیل نے کہا ____

گیل اور بوب کا کتب خانہ بہت وسیع اور گیل کا اُردو ذخیرہ کتب قابلِ ذکر تھا۔ اس نے مجھے محمدی بیگم کی سوانح زندگی کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ دکھایا۔ جوان مرحومہ کی بڑی بہن نے لکھا تھا۔ اور جو وہ میرٹھ یا لاہور جانے کہاں سے کھودلائی تھی۔

شام کو اپنے باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہوئے اس نے کہا۔'' پچھلی صدی کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ رجعت پسند اور تنگ نظر تھے۔ اس وجہ سے اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں یہ تجزیہ صحیح نہیں۔ ذرا ان ::رگوں کے ڈیلیما پر غور کرو۔ ایک ایسی قوم جس کی اپنی کوئی زبردست تعلیمی روایات نہ ہوں۔ بآسانی مغربی اثر قبول کرلیتی ہے۔ لیکن ہندی مسلمانوں کی اپنی درسی اور تہذیبی بے حد اعلیٰ

اور درخشندہ روایات تھیں۔ اور اب اُن کو احساس دلایا جا رہا تھا کہ وہ روایات ناکارہ اور فرسودہ ہو گئیں۔ مسلمان عورتیں خود ایک رچے ہوئے تمدن کی خالق اور پروردہ تھیں۔ برطانوی کولونیل رنگ میں جانا اُن کے لئے اتنا آسان نہ تھا۔ ان کا اپنا تہذیبی تفاخر اور برتری کا احساس اور غروران کے اس مدافعانہ رویے میں شامل تھا۔"

"ایک امپریل قوم جو یک لخت غلام قوم بن گئی۔" میں نے کہا۔ "اس طرح کی صورتِ حال میں دو رویے ہو سکتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں کا ردِ عمل کہ اتاترک نے اسے مکمل مغربی چولا پہنا دیا۔"

پروفیسر گیل مینوانڈ و مسلم تہذیب اور تاریخ کی استاد تھی۔ اگلے روز یونیورسٹی کے ایک طعام خانے میں راقم الحروف کے لئے جو لنچ دیا گیا۔ اس کے میزبان اطالوی نژاد جواں سال ماہرِ اقتصادیات پروفیسر جنوزی صوبہ بہار کے زرعی مسائل کے ماہر نکلے۔ (اور ان کے نفیس عالیشان دفتر کی دیواروں پر بہار کے ننگے بھوکے ہل کندھے پر اُٹھائے کسانوں کی تصویر تکلیف دہ) سینٹر فور ایشین اسٹڈیز کے ڈاکٹر بھرت بھٹ (جغرافیہ)۔ جیمز برو (ینتھر وپولوجی) راجہ راؤ، (فلسفہ) ہرمین وان اولفن اورینٹل اور افریقی ادبیات و لسانیات۔ گائتری۔ اسپیواک۔ (انگریزی ادب) اور "پبلک لیکچرز کے دفتر" کی ایک خاتون لنچ کے مہمانوں میں شامل تھیں۔ ناولسٹ راجہ راؤ عرصے سے ہند و فلسفہ پڑھا رہے تھے اور عنقریب ریٹائر ہونے والے تھے۔ بھرت بھائی گجراتی تھے۔ اور گائیتری انتہائی ذہین بنگالین جو اپنے امریکن یہودی مصنف شوہر سے طلاق لے چکی تھی۔ اس کے سابق خاوند نے طلاق کے بعد اس کے متعلق ناول بعنوان THE BIRDE WORE COLD لکھا تھا جو شائع ہو چکا تھا۔ گائیتری نل پروفیسر تھی اور بے حد بائیں بازو کی وچار دھارا سے تعلق رکھتی تھی۔

ڈچ نژاد پروفیسر وان لفن نے لسانیات کی تجربہ گاہ کے ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں ایک گھنٹے کا انٹرویو بزبان اُردو ریڈیو ٹیپ کروایا۔

"مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آسان ہو گئیں" والا شعر گیل نے فریم کروا کر اپنے دفتر کے کمرے میں لگا رکھا تھا۔ قریب اس کے مرحوم بچے کام کی تصویر رکھی تھی۔ دریچے کے باہر کیمپس کے درخت سرد ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ صحت مند طلبہ کے خوش پوش غول کسی جگہ کوئی

دبلا پتلا لاغر کمزور انسان نظر نہ آیا۔ اور ہر کیمپس پر اتنے ہجوم کے باوجود خاموشی اور سکون۔ کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا۔ مصائب اور پریشان حالی کے پیدا کردہ عصابی تناؤ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے بھی ہم لوگ ہر جگہ چیختے چلاتے پھرتے ہیں۔ اونچی آواز میں بولنا قومی خصوصیت بھی ہے۔

دوسرے روز یونیورسٹی میں ''جدید ہندوستان کی ہندو اور مسلم عورت'' پر لیکچر دینے سے قبل گیل نے تعارف کرواتے ہوئے نذر سجاد حیدر اور اُن کی پھوپھی اکبری بیگم مصنفہ گودڑ کا لال کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکچر کے دوران مجھے گودڑ کے لال کی ثریا یاد آ گئی۔ مصنفہ نے اسے لاہور میڈیکل کالج پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو گویا ہندوستانی عورت کی بغاوت اور آزادی کی بغاوت کی علامت تھی۔ مگر نقاب پہن کر ڈاکٹری کی تعلیم ممکن نہ تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ تاکہ لوگ اس پر نظر نہ ڈالیں وہ چہرے پر سیاہ پوڈر مل کر کلاس میں جاتی تھی۔ امریکن سامعین کو یہ قصہ انوکھا لگے گا۔ مگر آج سے سترہ سال پہلے ایک پردہ نشین مصنفہ نے جو تخلیقی اور اپنا آئیڈیل کردار پیش کیا تھا'' وہ آج بھی ایک حد تک مشرقی عورت کا مسئلہ ہے۔ روایت کی پابندی اور روایت سے انحراف۔'' بعد میں لامحالہ مسز گاندھی کے متعلق متوقع سوالات۔

گجراتی نژاد امریکن بھرت بھائی نے دریافت کیا۔ آپ نے کہا تھا کہ ہندوستانی ہاؤس وائف بڑی خود اعتمادی سے مشترکہ خاندان کا انتظام کرتی آئی ہے۔ تو کیا مسز گاندھی کی حکومت ایک ایسا سنڈروم ہے کہ۔

''کوئی سنڈروم نہیں ہے۔ آپ امریکن لوگ نظریہ سازی کے اتنے شوقین ہیں کہ آپ نے فوراً سے پیشتر اس کی بھی ایک تھیوری بنالی۔'' میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ایک دیونی سی میم میرے نزدیک آئی۔ اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ اسرائیل کی کسی یونیورسٹی کی لائبریرین تھی۔ اور امریکہ آئی ہوئی تھی۔

''آپ نے برطانوی ہند کی سیاسی شعور والی عورتوں میں ایک مغلیہ گوہر جان کا ذکر کیا کہ اس نے وائسرائے کو ڈیفائی کیا تھا اور یہ کہ وہ یہودی تھی۔''

''ہاں آرمنی یہودی۔''

''اگر وہ یہودی تھی تو آرمنی کیسے ہوئی؟ محض یہودی کہئے۔ ایسے یہودی جو آرمینا

میں رہتے تھے۔"

دیکھئے گوہر جان کی یہودی قومیت یا اس کی یہودیت کی شناخت آپ کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں، میرے لئے وہ ایک ایسی خاتون تھی جس کے اجداد آرمینیا سے کلکتہ آ گئے تھے۔ اور بس۔"

گراں ڈیل اسرائیلی خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بھنا کر دوسری طرف کو ٹہل گئی۔ اب ایک اداس صورت لڑکی نے ذرا نیچی آواز میں کہا۔

"میں ایرانی ہوں۔ میں اور میرا شوہر یہاں پڑھتے ہیں۔"

وہ خاموش اور سہمی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل کی بات تھی کہ ایرانی طلباء اپنے پیسے کے بل بوتے پر سارے مغرب میں دندناتے پھرتے تھے اور کافی بد دماغ مشہور تھے۔ اب وہ امریکہ میں ہر جگہ گھنا چکے تھے۔ سچ ہے بوا۔ کبھی کے دن بڑے۔ کبھی کی راتیں۔

تیسرے روز راجہ راؤ نے لنچ پر بلایا تھا۔ گیل کے گھر سے نکلتے کلب جاتے ہوئے راستے میں کیمپس کا بازار پڑتا تھا۔ ایک چوراہے پر ہاٹ لگا ہوا تھا۔ بوہیمن لڑکے کان میں بُندے پہنے ہوئے مختلف دستکاریاں فروخت کر رہے تھے۔ چند نوجوان گٹار بجا کر اپنی موسیقی بیچنے میں مصروف تھے۔ پرانی تصویریں اور ٹیکسس کی ریڈ انڈین گھریلو مصنوعات بک رہی تھیں۔ بڑا پُرسکون اور سہانا دن تھا۔ ایک آدمی اپنے بازی گر کتے کا تماشا دکھا رہا تھا۔ پُرامن بےفکری کے دن۔ اور اس طرح کے خوبصورت کیمپوں سے نکل نکل کر لاکھوں کی تعداد میں ایسے خوش باش نوجوان میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ محض ویت نام اور کوریا نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم اور اس سے پہلے، اور اس سے پہلے"۔ ایک گولی میرے سینے میں آن لگی، اور موت میرا مقدر ہے۔"

ساری دنیا کے نوجوانوں کا گیت ہے۔ ساری "پہلی" "دوسری" اور "تیسری دُنیا" کے نوجوانوں کا ترانہ جن کو جنگ کا ایندھن بنایا جاتا ہے۔ یہ دُنیا ویدانتی راجہ راؤ کی رسّی نہیں جسے سانپ سمجھ لیا گیا۔ سچ مچ سانپ ہے۔

آراستہ و پیراستہ یونیورسٹی کی طرح فیکلٹی والو کا طعام خانہ بھی ہیلٹن ہوٹل معلوم

ہورہا تھا۔

"ہماری درسگاہیں دراصل اتنی دولت مند اس لئے ہیں امریکن صنعتوں کی طرف سے بھی اُن کو بھاری امداد ملتی ہے۔ یہ صنعتیں اپنے ٹیکنولوجسٹ یہاں ٹرین کرتی ہیں۔" گیل نے کہا "اور ٹیکسس تو بہر حال تیل کی وجہ سے بے انتہا دولت مند ریاست ہے۔"

شام کو بوب گیل اور میں شہر کے ایک ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے۔ پارک میں اَن گنت کاریں۔ اندر بےفکر چہرے۔ اچانک میں نے گیل سے کہا۔

"یہ لوگ یا کسی بھی امریکن چھوٹے شہر یا بڑے شہر کے لوگ تیسری دُنیا کی درماندگی کو سمجھ سکتے ہیں؟"

"نہیں" گیل نے افسردگی سے جواب دیا۔

آخری شام گیل کے ہاں ڈنر تھا جسے منسوخ کرنے کے لئے میں نے اسے لاس اینجلز سے فون کیا تھا لیکن جو محرم کی گیارہویں تاریخ پڑنے کی وجہ سے منسوخ نہ ہوا تھا۔ گیل بیگم نے اس شام زرد غرارے کا جوڑا (جو لکھنؤ میں سلوایا تھا) اور جھمکے پہنے اور بریانی پکائی۔ نچلی منزل میں اس کا وسیع ایوان نشست اور باورچی خانہ اور کتب خانہ دانشگاہ کے دانشوروں سے بھر گیا۔ گائتری کہنے لگی۔ اتنے کم وقت میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ علی گڑھ تحریک سے متعلق کتابوں سے بھری ایک الماری کے سامنے ایک بزرگ امریکن ماہر اسلامیات کسی سے ایران کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔" اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ہم لوگوں کی کبھی نہیں سنتا۔"

یہ پرانا مسئلہ ہے۔ اہلِ سیاست نے اہلِ دانش کی بات کب سُنی ہے۔

ایک امریکن خاتون ایلزبتھ فرینا اور ایک عرب خاتون باسا قطان بزرگان نے ایک ضخیم کتاب "مڈل ایسٹرن ویمن اسپیک رلنا المسلمات فی الشرق الاوسط تیحدثن۔ زنانِ مسلمان خاورمیانہ سخن می گویند۔" جو انہوں نے مل کر ایڈٹ کی تھی۔ مجھے دی۔ یہ کتاب یونیورسٹی آف ٹیکسس پریس آسٹن اور لندن (برطانیہ) سے شائع ہوئی تھی۔ اور اس میں

حضرت عائشہؓ، حضرت رابعہ بصریؒ میڈیول SERPENT AND THE ROPE راجہ راؤ کا مشہور انگریزی ناول ہے۔

افغان شاعرہ رابعہ بلخی، اُمِ کلثوم، خالدہ ادیب خانم مصری لیڈی ہدیٰ شعراوی، جدید عراقی شاعرہ نازک الملائکہ، الجیرین مجاہدہ جمیلہ بداوی، جدید لبنانی ناولسٹ لیلیٰ اجنبلی، ایرانی شاعرہ فرخ فرخ زاد وغیرہ کے متعلق مضامین اور اُن کی چیدہ تخلیقات شامل تھیں۔ ان ہی جیسی خواتین میں سے ایک۔ جدید ایرانی ماہرِ تعلیم ڈاکٹر پارسا کو چند ماہ بعد اُن کے اپنے ہم وطنوں کا فائرنگ اسکواڈ گولی سے اُڑا دینے والا تھا۔ ہیہات۔ ہیہات۔ اُن کی پیش روزریں تاج طاہرہ کو بھی تو گلا گھونٹ کر اندھے کنوئیں میں گرا دیا گیا تھا۔

اے پیر حرم رسم درہ۔ شاہنشہی چھوڑ۔ گیل کی میز پر محمدی بیگم مرحومہ کی سوانح عمری سامنے رکھی تھی۔ صد شکر کہ اُنہوں نے اور اُن کی نسل کی مصلح، حریت نسواں کی علمبردار خواتین نے کولونیل برطانوی عہد میں جنم لیا۔ مطلق العنانی کے دور میں پیدا ہوئی ہوتیں تو شاید وہ بھی ماری جاتیں۔

باہر سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ گیل کے سیاہ بلے نے کتب خانے کے دریچے میں سے جھانکا اور بے بس انسانوں کو اپنے مسائل کے ناکام حل تلاش کرتے دیکھ کر اُکتا کر پھر باغ میں کود گیا۔

☆

ڈکسی مون

یونیورسٹی آف آیووا میں، بید مجنوں سے گھری آیووا ندی کے کنارے استادہ، ''انگلش اینڈ فلاسفی بلڈنگ'' کی چوتھی منزل پر انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایڈورڈ گنزر میرے سفر کے انتظامات جنات کی طرح منٹوں میں کر دیا کرتا تھا۔ کئی ہفتے قبل اس نے مجھے اطلاع دی تھی۔ ''تم نیواورلینز بطور سیاح جا رہی ہو اور وہاں کسی کو جانتی نہیں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم وہاں کسی ہوٹل میں قیام کرو۔ میں نے ایک سنگتراش خاتون مسز شیری سلیون کے ہاں تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا ہے۔''

آسٹن سے روانگی کی صبح گیل نے مجھ سے کہا۔ ''نیواورلینز بہت بڑا ایر پورٹ ہے۔ وہاں کے جمِ غفیر میں تم حسب معمول اپنی سلیکس میں ملبوس اترو گی تو ممکن ہے وہ خاتون تم کو میکزیکن یا ایشیائی نژاد امریکن سمجھ کر پہچان نہ سکے۔''

میں نے گیل کے باورچی خانے سے مسز سلیون کو فون کیا۔ ایک نہایت دوستانہ آواز سنائی دی۔ (نیویارک سے لاس اینجلز بھی بات کیجیے تو آواز اتنی صاف سنائی دیتی ہے جیسے مخاطب سامنے موجود ہے۔) میں نے کہا۔

''میں ٹیکسس ایرلائنز کی فلاں فلائٹ سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر پہنچ رہی ہوں۔ گلابی رنگ کا طویل اسکارف اور نیلا اورینٹل ڈریس۔''

''یہ اورینٹل ڈریس کیا چیز ہوتی ہے؟'' گیل نے ننھی لیلیٰ کو ناشتہ کراتے ہوئے

سر اُٹھا کر پوچھا۔

''امریکن ساؤتھ تم باقی امریکنوں کے لئے بھی ایک مختلف دنیا ہے۔ایڈون نے بتایا تھا کہ یہ ایک خالص سدرن فیملی ہے۔ DEEP SOUTH کے لوگوں کے شمال کے YANKEES ہی خاصے اجنبی ہیں۔ یہ مسز سیون گلابی دو پٹہ اور نیلی شلوار قمیض کیا سمجھ پاتی ؟''

''کیا پتہ وہ غرارہ پہنے تمہیں ایرپورٹ پر ملے اور جھک کر تسلیم عرض کرے۔'' گیل نے کہا۔

''نہیں لوگوں کے متعلق میرے اندازے عموماً صحیح نکلتے ہیں۔ یہ مسز سیون بے حد سویٹ اور پرخلوص خاتون ہیں۔لیکن مشرق کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔''

میرا قیاس درست ثابت ہوا۔

طیارہ ٹیکس کے بہت بڑے شہر ڈیلاس پہنچا وہی شہر یہاں ۶۳ء میں صدر کینیڈی قتل ہوئے۔ وہاں اُتر کر معلوم ہوا کہ نیو اور لینز جانے والی ٹیکسس ایرلائنز سے ٹھیک اسی وقت نیو اور لینز پہنچا دیا جائے گا۔جس وقت آپ ٹیکسس ایرلائنز سے پہنچتیں تو بے حد معذرت کے ساتھ کاؤنٹر کی............کہاتھرو بکنگ کے ذریعے سامان ایک ہوائی جہاز سے دوسرے میں منتقل ہوتا منزلِ مقصود پر مل جاتا ہے۔ پرواز منسوخ ہونے کی وجہ سے میں واحد مسافر تھی جو طیارہ تبدیل کر کے اس پرواز سے نیو اور لینز جا رہی تھی۔ایک کارکن بار بار معافی چاہتا کار میں بٹھا کر دوسری طیران گاہ میں لے گیا۔دوسری ایرلائنز کے لاؤنج میں پہنچا کر ایک بار پھر معذرت چاہی اور واپس گیا۔

نیو اور لینز پر میرا ایک بیگ غائب ہو گیا۔ میں نے متعلقہ دریچے والے سے کہا۔ اس نے مزاحمت سے جواب دیا۔ایسی گڑبڑ شاذونادر ہی ہوتی ہے۔اپنی جائے قیام کا پتہ دیجئے۔آج شام کے چھ بجے سے قبل بیگ آپ کو مل جائے گا۔

مسٹر اور مسز سیلون بھی غائب تھے۔میں نے اس آدمی سے اس کا نام اناؤنس کرایا۔ چند منٹ میں ایک خوش شکل متوسط العمر جوڑا مع ایک بچی نمودار ہوا۔

''ہم ٹیکسس ایرلائنز والی فرودگاہ میں منتظر تھے۔'' مسز سیلون نے کہا۔

سیلون نام سے ظاہر ہوتا تھا کہ موصوف آئرش نژاد کیتھولک تھے وہی نکلے۔ شیری سیلون ورجینیا کے انگریز نژاد کیتھولک تھی۔ (یاد کیجئے ورجینیا وہ پہلی نوآبادی تھی جو سر والٹر ریلے نے ۱۶۰۷ء میں بسائی تھی)

''لیکن میرے دادا محض سو سال قبل انگلستان سے آئے تھے۔'' شیری نے کہا جن کا لب ولہجہ اب تک خاصہ برطانوی تھا۔

''راستے میں ہم لوگ ذرا اپنی پوتی کی سالگرہ پارٹی میں شریک ہوتے چلیں۔'' شیری بولی۔ ''میرا یہ بیٹا بہو عنقریب ایک دوسرے کو طلاق دینے والے ہیں۔ بیٹا دوسرے گھر میں اُٹھ گیا ہے۔ بچی کی سالگرہ کے لئے آجائے گا۔''

ایک رہائشی علاقے میں ایک نئی وضع کے بنگلے کے اندر ایک معمولی شکل کی لڑکی نے استقبال کیا۔ کمرہ نشست مین چند مہمان موجود ہیں۔ ایک طرف منی سی ڈائننگ ٹیبل پر مُنا سا نقری ٹی سیٹ رکھا تھا۔ ننھی ننھی کرسیوں پر چند بچے بیٹھے تھے۔ چند منٹ بعد ایک بے انتہا خوبصورت نوجوان، گھنگھریالے سنہرے بال (اسے ہالی ووڈ میں ہونا چاہئے تھا۔) کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سیلونز کا لڑکا تھا۔ خالص اولڈ ورلڈ سدرن کرٹسی کے ساتھ تقریباً رکوع میں جا کر اُس نے مجھے سلام کیا تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی امریکن ساؤتھ میں موجود ہوں۔ جہاں آج ۱۹۷۹ء میں بھی امریکن خانہ جنگی۔ ۱۸۶۵ء سے قبل کی پرانی یورپین کلچر باقی ہے۔ لڑکا اپنی بچی سے کھیلتا رہا۔ بیوی سے بات نہیں کی۔ دوسری منزل پر اس کی بیوی کا موجودہ دوست رہتا تھا۔ طلاق حاصل کرنے کے بعد وہ اس سے بیاہ کرنے والی تھی۔ اس آدمی کا چھوٹا بھائی بھی پارٹی میں موجود تھا۔ دونوں بھائی ______SHOW BUSINESS میں تھے چھوٹا بھائی بچوں کو طرح طرح سے محظوظ کر رہا تھا۔

یہ دونوں بھائی نیو اورلینز کے اصل فرانسیسی نژاد باشندے ہیں۔''

کرسمس آنے والی تھی کچھ دیر بعد بہو کا منگیتر فادر کرسمس کے بھیس میں داخل ہوا۔ اس سال کمپیوٹرائیز کھلونے بازار میں آچکے تھے۔ ''فادر کرسمس'' ہر بچے کو گود میں بٹھا کر بڑے اخلاق سے اس کی فرمائش پوچھتا۔

''سر۔ آپ کو کیا چاہئے؟''

''ماوموزیل۔ آپ کو کیا چاہئے؟'' اور ہر بچہ اور بچی کسی کمپیوٹرائزڈ کھلونے کا نام لے دیتی (جن کی کئی ماہ قبل سے ٹیلیویژن پر زبردست پبلسٹی کی جا رہی تھی۔)

شیری کا لڑکا شکیل اپنے رقیب ''فادر کرسمس'' سے باتیں کرتا رہا۔ جو عنقریب اس کی بچی کا سوتیلا باپ بننے والا تھا۔ سارا ماحول بے حد مہذب اور پرتکلف تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ گھر ٹوٹ چکا ہے۔

لڑکے کی چار سالہ بچی اطمینان سے ''فادر کرسمس'' کی گود میں بیٹھی رہی۔

''تم سے ملوانے کے لئے ہم نے آج ہی نیو اورلینز کے ایک قدیم خاندان میں چند لوگوں کو جمع کیا ہے۔ کیوں کہ ایڈون کنزر نے آیوواسٹی سے مجھے فون پر بتایا تھا کہ تم کو امریکن ساؤتھ کی تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔'' شیری نے اپنی بہو کے گھر سے نکلتے ہوئے کہا۔

''انڈیا میں تم کون لوگ آباد ہو۔ بدھسٹ؟ موزلم۔؟'' مسٹر سیلون نے دریافت کیا۔

میرا یہ قیاس کہ بہت معصوم لوگ ہوں گے صحیح نکلا۔

ان کے بہو بیٹے کے اس موڈرن مکان سے نکل کر ہم لوگ ایک روایتی سدرن محلے میں پہنچے۔ جہاں خیاباں کے دونوں جانب استادہ کولونیل مکانات بالکل ٹینسی ولیمز کے ڈرامے ''جلتی ٹین کی چھت پر بلی'' والے سیٹ معلوم ہوتے تھے۔

ایک مکان کے چوڑے برآمدے اور سفید جھلملیوں والے دروازوں کے عقب میں خنک ڈرائنگ رُوم کے اندر چند معمر لوگ ٹیلی ویژن پر ''بال گیم'' دیکھنے میں منہمک تھے کہ بیس بال امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ جین سیلون نے طیارے کی پرواز منسوخ ہونے کا واقعہ بتایا۔ حاضرین نادم ہوئے۔ ''ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ امید ہے آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوئی ہوگی۔'' وغیرہ وغیرہ۔

صاحب خانہ امریکن بحریئے کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے۔ (جین سیلون بھی امریکن بحریئے کے شعبہ انجینئرنگ کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے اور اب انجینئرنگ کے سامان کا ذاتی کارخانہ چلاتے تھے)۔

صاحب خانہ کی بیوی نے اپنی خوابگاہ دکھائی جس میں اٹھارہویں صدی کا چھپر کھٹ

رکھا تھا۔ سرہانے میز پر نہایت ضخیم مصور بائیبل جس کے اوّلین اوراق پر اس کنبے کے پچھلے ڈھائی سو سال کی نسلوں کی پیدائش، شادی اور اموات کی تاریخیں درج کی جاتی رہیں تھیں باورچی خانہ اور باقی گھر بے حد موڈرن۔

شام کے چھ بجے جب ہم لوگ سلیونز کے مکان واقع والمونٹ اسٹریٹ پہنچے میرا بیگ برآمدے میں موجود تھا۔ جوڈیلا اس سے کسی فلائٹ پر منگوا کر حسب وعدہ چھ بجے شام سے قبل گھر پر پہنچایا جا چکا تھا۔

اس خیاباں میں بھی دورویہ جارجین کولونیل دومنزلہ مکان چوڑے پتوں والے ٹروپیکل درختوں میں گھرے کھڑے تھے سارے امریکہ کے مکانوں کی طرح ایک سے ایک خوش وضع سلیونز کے تینوں لڑکے الگ رہتے تھے۔ بڑی لڑکی کا نام برجٹ آئرش نام ہے۔ چھوٹی بارہ سالہ نفن اسکول جاتی تھی اس کا نام شیری کے انگریزی کے پس منظر کی یادگار تھا۔ اوقاتِ فرصت میں شیری تانبے کی مجسمہ سازی کرتی تھیں۔ شوقیہ فن کار تھیں۔ اپنے پائیں باغ کے کاٹج میں اسٹوڈیو تھا۔

شام کے وقت شیری کے بیٹے اور بہوئیں آجاتیں۔ جولڑ کا اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا وہ موجودہ گرل فرینڈ کے ساتھ آتا۔ زرعی قدامت پرست ساؤتھ میں خصوصاً کیتھولک کنبوں میں احساسِ یگانگت شمال کے مقابلے میں زیادہ معلوم ہوا۔ صنعتی تمدن کی بیگانگی ابھی جنوب میں شاید اس حد تک نہیں پھیلی تھی۔ پچھلی لاؤنج میں میز پر کرسمس کے تحائف کے کیٹیلاگ رکھے تھے۔ ایک اشتہار اس قسم کے غبارے کا تھا جو میں نے ورمونٹ سے نیویارک آتے ہوئے راستے میں اُڑتا دیکھا تھا۔ اشتہار کے نیچے لکھا تھا۔ ''اس کرسمس پر اپنی بیوی یا محبوبہ کو یہ تحفہ دیجئے۔ قیمت صرف پچاس ہزار ڈالر'' شیری نے جین کو وہ تصویر دکھلائی اور ہنسنے لگیں۔

''اتنا قیمتی تحفہ کتنے لوگ خریدیں گے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بہت سے'' جین سلیون نے کہا۔ ''ٹیکسس کے کروڑ پتی اور بہت سے لوگ ہم البتہ خرید سکتے ــــــ'' (یہ دو کاریں رکھنے والی اور ہر دوسرے سال یورپ سیر کے لئے جانے والی ایک مڈل کلاس فیملی تھی۔)

ہمارا سب سے بڑا لڑکا انٹلکچوئیل ہے۔ ایک یونیورسٹی میں امریکن ہسٹری پڑھاتا ہے۔ اس نے ایک نصف الجیرین نصف فرانسیسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ کیتھرین خود لامذہب لیکن کہتی ہے کہ اگر کبھی مذہب کی طرف راغب ہوئی تو اپنے باپ کا دین اسلام قبول کرے گی۔'' شیری نے کہا۔'' کل شام اس نے تم کو ڈنر پر بلایا ہے۔ ذرا مذہب کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کرنا۔''

شیری غالباً خواہشمند تھیں کہ کیتھرین بھی اپنی فرانسیسی ماں کی طرح رومن کیتھولک مذہب اختیار کرے۔ مگر تکلف اور فرد کی آزادی رائے کے احترام کی وجہ سے اس موضوع پر اس سے کچھ کہہ نہ سکتی تھیں۔

'' میرے والد فرانس میں رہتے ہیں۔ میں کبھی الجیریا نہیں گئی۔ مگر میرے چچا فرانس آتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے اُن کی لڑکیاں الجیریا میں کس قدر پابند زندگیاں گزارتی ہیں۔ اپنی مرضی کی شادی بھی نہیں کر سکتیں۔ مسلم سوسائٹی میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟'' ہر فرانسیسی ماں اپنی بیٹی کو بہترین ککری بک جہیز میں دیتی ہے۔ میں نیو اورلینز سیر کے لئے آئی تھی۔ یہاں اس نستعلیق مہذب سدرن لڑکے سے شادی کر لی۔ ماماں مجھے پیرس سے برابر کھانوں کی نت نئی ترکیبیں بھیجا کرتی ہیں۔''

دوسرے کمرے میں مہمان جمع تھے۔ ایک انگریز لڑکا اور اس کی فرنچ بیوی جو کیتھرین کی طرح ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ملازم تھے۔ فرانسیسی قونصل خانے کا ایک نوعمر ڈپلومیٹ اور ایک باریش امریکن نوجوان جو باتوں سے نہایت رُجعت پسند جنونی معلوم ہوتا تھا۔ سابق شاہ ایران کی تعریفوں میں مصروف تھا۔

'' مگر میں جانتا ہوں شاہ نے کتنے مظالم کئے تھے۔ فرانس کے اخباروں میں تمام تفصیلات چھپتی تھیں۔'' فرانسیسی ڈپلومیٹ نے کہنا شروع کیا۔ امریکن رجعت پسند نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ گوری اقوام کی نسلی برتری کے نظریے کا حامی بھی تھا۔

شیری کا لڑکا کیتھرین کا شوہر ٹپکل سوبر یونیورسٹی کا استاد معلوم ہوتا تھا۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک، مدھم پرسکون جنوبی DRAWL کا لہجہ (جس طرح دلیپ کمار اُردو بولتے

ہیں امریکن ساؤتھ کے لوگ اس انداز سے انگریزی۔)

انگریز نوجوان کچھ دیر تک بارلیش رُجعت پسند کی گفتگو سننے کے بعد مجھ سے آہستہ سے بولا۔ ''یہ آدمی بالکل بےوقوفی کی باتیں کر رہا ہے۔''

''تم کو امریکہ کیسا لگا؟۔''میں نے پوچھا۔

''بالکل نا قابلِ یقین۔''انگریز نوجوان نے برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ دیا۔

جس قسم کا یہ آدمی ہے شاید اسی طرح کے لوگ KUKLUX KLAN کے سفید برقعے اوڑھتے ہوں گے۔''میں نے کہا۔

ہندوستان میں بھی تو اچھوتوں کو LYNCH کیا جارہا ہے۔''انگریز نوجوان نے جواب دیا۔

''پرانے تعصبات جدید اقتصادیات سے خلط ملط ہو کر بڑی تباہی پھیلاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

امریکہ میں شمال کی آزاد خیالی اور جنوب کی قدامت پرستی اور کالوں سے تعصب کے جنوبی رویئے امریکن خانہ جنگی کی یادگار ہیں۔

۱۷۹۳ء میں اسپلنگ جینی ایجاد ہوئی۔اس کی وجہ سے صنعتی انقلاب آیا۔ادھر ہندوستان مانچسٹر کو خام سپلائی کرنے والی نوآبادی بنا۔اُدھر امریکن ساؤتھ میں کپاس کی مزید کاشت کے لئے افریقی غلاموں کی تجارت (جوسترہویں صدی سے جاری تھی) بڑھی۔شمالی ریاستوں کے جمہوریت پسند لوگ جنوب کے سیاہ فام غلاموں کی آزادی کے حامی تھے۔اہلِ جنوب کے سیاہ فام غلاموں کی آزادی کے حامی تھے۔اہلِ جنوب اس کے مخالف تھے اُن کی دولت و راحت کا دارومدار غلاموں کی محنت پر تھا۔جب ری پبلکن ابراہیم لنکن ۱۸۶۰ء میں صدر منتخب ہوئے جنوبی ریاستوں نے یونین سے علیحدہ ہو کر کون فیڈریٹ اسٹیٹس آف امریکہ کی تشکیل کی۔شمال سے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ۶۵-۱۸۶۱ء میں لاکھوں مارے گئے۔(یہ خانہ جنگی امریکن قومی اساطیر کا ایک اہم حصہ بنی) جنوب کے شکستہ غلام آزاد۔لیکن ابراہیم لنکن کو ایک جنوبی انتہا پسند نے قتل کردیا۔شمال اور جنوب کے مابین تلخی باقی رہی۔خانہ جنگی نے جنوب کو اقتصادی طور پر تباہ کردیا تھا۔وہ بہت دیر میں سنبھلا۔شمال نے تیزی سے

ترقی کی۔ خانہ جنگی کے بعد ہی سرمایہ داری سرعت سے آگے بڑھی فولاد اور مشین کی اس نئی دُنیا میں اَن گنت عظیم الشان شہر آباد ہوئے۔ اس بے اندازہ انڈسٹریل طاقت کے ساتھ ساتھ جرائم اور کرپشن میں بھی اضافہ ہوا۔ شمال کی صنعتی ترقی کے مقابلے میں ساؤتھ پھسڈی رہ گیا۔ کپاس اور گنے کے زمینداروں کی فیوڈل روایات کو یاد کرتا رہا۔ آج تک ساؤتھ کے "غریب گورے" ایک مسئلہ ہیں۔ اور کالوں سے وہی سب سے زیادہ متنفر کو کلکس کلان ان کی اس نفرت کی علامت ہے۔ اپنے حقوق کے لئے کالوں کی عظیم جدوجہد امریکن اساطیر کا ایک ولولہ خیز اور تابناک حصّہ ہے۔

باوجودیکہ شیری ایک نیک دل روشن خیال اور حساس خاتون تھی۔ لاشعوری طور پر کالوں کے خلاف تعصب اُن کے اندر بھی اسی طرح موجود تھا جس طرح مثال کے طور پر ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ مدراسی برہمن گیر برہمنوں یا اچھوتوں کے لئے اچانک اپنا رویہ ظاہر کر دیتا ہے۔

کالوں کے لئے شیری کا سرپرستانہ آقاؤں والا انداز ابھی باقی تھا ٹیلی ویژن لاؤنج میں ایک کالی عورت کی بڑی پینٹنگ رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اس کالی عورت کا برنجی سر۔ دونوں فن پارے شیری نے بنائے تھے۔ "یہ ورجینیا میں میری والدہ کی پرانی نیگرو خادمی تھی۔ نہایت وفادار اور تمیز دار بے چاری مرگئی۔" شیری نے بالکل اس طرح کہا جیسے اودھ یا روہیلکھنڈ کی کوئی بیگم صاحبہ اپنی کسی خانہ زاد وفادار مرحومہ باندی کا ذکر کرتی ہوں۔

ایک روز ہم غریب کالوں کے محلے سے گزر کر ڈاؤن ٹاؤن جارہے تھے۔ ہر کاٹج کے سامنے ایک ایک نئی کار کھڑی تھی۔ کچھ غریب کالے اپنی کاریں دھونے میں مصروف تھے۔ سڑک پر کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ سامنے ایک عظیم الجثہ اشتہار میں ایک کالی موڈل لڑکی کوئی قیمتی چیز خریدنے کی دعوت دے رہی تھی۔

"ان لوگوں کو اب تمام مراعات حاصل ہو چکی ہیں پھر بھی شاکی رہتے ہیں۔" شیری نے اظہارِ خیال کیا۔ (ہمارے ہاں کہا جاتا ہے۔ "ہریجنوں کو سب کچھ مل رہا ہے پھر بھی شاکی۔")

ہمارے اور مغرب کے SLUMS میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نہ ہم اپنے

افلاس کا مقابلہ امریکن افلاس سے کر سکتے ہیں۔ محمد علی کلے اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں کہ" ہم لوگ اتنے غریب تھے کہ ہمارے باپ کے پاس ایک دس سالہ پرانی کارتھی اور وہ بھی کبھی نئے ٹائر نہ خرید سکتا تھا۔ اور ہمیشہ سیکنڈ ٹائروں سے کام چلاتا تھا۔"

یہاں محمد علی کلے کی" نیشن آف اسلام" کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے ۱۹۱۶ء میں بیروزن امریکہ چرچ " کریسچن سائنس" ٹموتھی ڈریو نامی ایک نیگرو نے مورش سائنس ٹمپل قائم کیا۔ (قرونِ وسطیٰ سے مغرب میں مسلمان افریقیوں کو مُور یعنی مراقشی کہا گیا ہے۔ یورپین ہسپانوی مسلمان بھی مُور کہلائے۔ یورپین نشاۃ ثانیہ کی مصوری اور ادب میں BLACK MOOR موجود ہے۔) نومسلم نوبل ڈریو علی نے دعوئے نبوت بھی کیا۔ ہر مہدویت یا نبوت کے دعوے دار کی تحریک کی طرح یہ بھی ایک نیم مذہبی نیم سیاسی تحریک تھی۔

ڈریو علی کا اسلام بھی ذرا انوکھا سا تھا۔ کالوں کی (MYSTICAL STREAK) اُن کے مصائب کی پیداوار ہے۔ اس نے امریکن مسیحی کالوں کے وہ لازوال روحانی نغمے NEGRO SPIRITYALS تخلیق کئے۔ (نیویارک مین ہیٹن میں برابر سے گزرتے ایک کالے بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر آپا حسن نے کہا تھا کیا بات ہے کہ ہر بوڑھے کالے کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انکل ٹام ایسے ہی رہے ہوں گے۔) تو بہر حال (پیغمبر) نوبل ڈریو علی نے" قرآن مقدس" (نعوذ باللہ) شائع کیا جو دراصل ایک مسیحی تصوف کی کتاب اور چینی تبتی عارفانہ اقوال کے مجموعے پر مبنی تھی۔

مورش سائنس ٹمپل دراصل امریکن کالوں کی سیاسی بیداری کا ایک مظہر تھا۔ مغرب میں جس طرح کالوں کی تحقیر کی جاتی رہی تھی جواباً اس" صحیفے" میں علی نے لکھا تھا کہ ایشیائی اقوام کی تخلیق الوحی تھی اور افریقہ برتر ڈریو علی امریکہ سے باہر ایک نیگرو ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور کالوں کی معاشی مسائل کا حل اس کے ٹمپل کے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔

دوسری زیادہ کامیاب" بلیک مسلم" کساد بازاری کے زمانے میں شروع ہوئی اس کا بانی ویلیس فرڈ تھا۔ چارلس ایرک لنکن نے بلیک مسلمانوں پر اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ چونکہ عربی میں" فرد" کے معنی واحد کے ہیں۔ FARD جو" اللہ" سے بھی مماثل کیا جانے لگا۔ ایلائی یا محمد فرڈ کے جانشین اور" پیغمبر" بنے۔ یہ بھی گوروں کی مخالف تحریک تھی۔

گوایلائی یاہ محمد اپنی مدافعت کے وقت تشدد استعمال کرنے کے علاوہ اہنسا کے مبلغ تھے۔ اُن کے لڑکے اکبر محمد نے جامعہ الزہر میں دو سال پڑھا۔ ان کا سب سے مقبول اور بے حد ذہین پیرو میلکم لِٹل میلکم ایکس کے نام سے نیو یارک ٹمپل کا لیڈر بنا۔ وہ کالوں پر پولس کے مظالم کے جواب میں تشدد استعمال کرنے کا حامی تھا۔ گو اپنے پیشوا کے اہنسا کے اصول پر کار بند رہا۔ سیاہ فام امریکہ کے اس نہایت قابل پُر جوش لیڈر اور اعلیٰ درجہ کے مقرر الحاج میلکم کو نیو یارک میں ایک تقریر کرتے ہوئے ۲۱ رفروری ۱۹۶۵ء کے روز شہید کر دیا گیا۔

محمد علی کلے نیشن آف اسلام کے ایک بے حد جوشیلے رکن ہیں۔ کالوں میں ایک بے حد کٹر قسم کا ''حنفی مسلم'' فرقہ بھی ظہور میں آچکا ہے۔

جس سال امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہوئی یعنی ۱۸۶۱ء میں ایک امریکن مشنری خاتون مس ازابلاتھوبرن نے شہر لکھنؤ میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ (اس وقت جان عالم واجد علی شاہ اختر پیا کو مٹیا برج سدھارے صرف چار سال ہوئے تھے۔) یہ جوشیلی امریکن باہمت خدا پرست خواتین دور دراز امریکہ سے ہندوستان آئی تھیں کہ عورتوں میں جدید تعلیم کی روشنی پھیلائیں۔ اس طرح کے امریکن پرپسی ٹرین اسکول دہرہ دون لاہور اور دوسری جگہوں پر کھلے اور اے پی مشن اسکول کہلائے۔ لیکن رفتہ رفتہ ازابلاتھوبرن کالج لکھنؤ نے اپنی خالص امریکن روایات، مکمل امریکن سٹاف اور بے حد اعلیٰ معیار کی تعلیم کی وجہ سے اوپری طبقہ کے لئے ایک خاص SNOB VALUE بھی اختیار کرلیا۔ (یہی اسنوب ویلیو نینی تال اور مسوری کے امریکن سکول کے لئے آج تک موجود ہے۔)

اس ازابلاتھوبرن کالج کی تقریبات میں جو کمیونٹی سونگ ہم لوگ گاتے تھے۔ اس کا اصل پس منظر اب جا کر معلوم ہوا۔ کیلیفورنیا میں مجھے'' مائی ڈارلنگ کمنٹائن یاد آئی تھی۔ جس کا گولڈرش والا FORTY-NINER باپ تھا اور جو روز صبح ۹ بجے ندی میں سے اپنی بطخیں ہنکا کر لے جاتی تھی۔ اور ایک دن پانی میں ڈوب گئی تھی۔

ایک بشاش گیت جو ہم ہندوستانی لڑکیاں بڑی مسرت و شادمانی سے گاتے تھے یوں تھا۔

''پولی ڈولی ڈوڈل گاتا میں اپنی سیلی سے ملنے ساؤتھ گیا اپنی سوزی اینا سے ملنے

لوزیانہ جارہا ہوں۔راستے میں ایک ندی پڑی۔گاتے ہوئے میں اسے پار نہ کر سکا۔تو میں ایک نگر پر سوار ہوگیا کیوں کہ میں اسے ایک گھوڑا سمجھا۔ریل روڈ ٹریک پر ایک جھینگر بیٹھا تھا۔" وغیرہ۔

یہ کورس سفید جنوب کی نفسیات اور ایتھوس کا عکاس تھا۔مگر جب ہم پیانو کے ساتھ اسے گاتے تو ہم کو مطلق ہوش نہ تھا کہ کیا گا رہے ہیں۔

لیکن کالوں کے متعلق چند المناک اور دل نشیں گیت بھی تھے۔میرا پسندیدہ نغمہ MY OLD KENIUCKY HOME تھا جو میں پیانو پر بجاتی تھی۔"کین ٹکی کے اس پرانے مکان پر سورج تیزی سے چمک رہا ہے۔ڈارکی لوگ مسرور ہیں گیہوں کی فصل پک گئی۔مرغزار سرسبز۔چڑیاں دن بھر گاتی ہیں بچے جھونپڑے کے فرش پر لوٹ لگاتے ہیں،سب خوش ہیں۔

"رفتہ رفتہ بُرے وقت نے دروازے پر دستک دی۔اب وہ لوگ جنگل اور پہاڑی اور ساحل پر شکار نہیں کھیلتے۔کاٹج کے دروازے کے سامنے پرانی بنچ پر بیٹھ کر چاندنی رات میں گیت نہیں الاپتے۔وقت آگیا ہے کہ ڈارکی یہاں سے چلے جائیں۔شب بخیر۔میرے پرانے کن ٹکی کے مکان شب بخیر۔لیڈی! اور اب مت روؤ۔آج اور مت روؤ۔ہم کن ٹکی کے پرانے گھر کی یاد میں ایک گیت گائیں۔وہ گھر جو بہت دور رہ گیا۔

اور میرا بے حد پسندیدہ غیر فانی نیگرو گیت OLD FOLKS AT HOME سوانی دریا کے کنارے بہت دُور۔بہت دُور میں وہیں واپس جانا چاہتا ہوں۔جہاں میرے بوڑھے ماں باپ رہے ہیں۔میں ساری ساری دنیا میں اُداس گھومتا ہوں۔مجھے میرے پلانٹیشین واپس لے چلو جہاں میرے بوڑھے ماں باپ رہتے ہیں۔"

یہ ایک ایسا جذباتی رقت خیز کورس تھا جسے گاتے گاتے لوگوں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔"میڈسن ڈکسن لائن" کی سرحد کے نیچے کی "غلام ریاستیں" جو ڈکسی لینڈ کہلاتی تھیں ان کی نیگرو میوزک بے مثال ہے۔

اتوار کی صبح میں شیری جین سلیون کے ساتھ کیتھڈرل گئی۔جس وقت ہم کلیسا کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ایک رولز رائس آ کر رکی۔میک اَپ سے لیس ہیروں سے

لدی سیاہ ویل پہنے ایک ضعیفہ اپنی پوتی کے سہارے کار سے برآمد ہوئیں۔ بہو نے ان کا ویل درست کیا۔ بیٹے کا بازو تھام کر وقار سے چلتی اندر گئیں۔ شاید کسی پرانے پلانٹر کا خاندان تھا اور گارڈن ڈسٹرکٹ سے آیا تھا۔

اندر کیتھڈرل میں ماس کے بعد (حاضرین میں کوئی کالا چہرہ نظر نہ آیا) لاٹ پادری نے میز پر آ کر کہا" ہمارے جو بھائی آئی رین میں محبوس ہیں آؤ ان کے لئے دعا کریں۔

۱۸۰۳ء میں ریاست لوزیانہ امریکہ نے فرانس سے خریدی تھی۔ نیو اورلینز فرنچ ہسپانوی کنکشن کی وجہ سے زیادہ تر رومن کیتھولک ہے۔ تین مشہور عالم کیتھولک یونیورسٹیاں اس شہر میں موجود ہیں۔ تولان، لایولا، زیویرز۔ ایک سینٹ چارلس اسٹریٹ جس پر اب تک اسٹریٹ کاریں چل رہی تھیں۔

''تم کو یقین نہیں آئے گا۔ ذرا جھانک کر غور سے دیکھو۔ وہ اسٹریٹ کار جو سامنے سے آ رہی ہے۔ اس کا نام " DESIRE " ہے۔'' شیری نے کیتھڈرل سے لوٹ کر سینٹ چارلس اسٹریٹ واپس آتے ہوئے کہا۔ خیاباں کے دونوں طرف پرشکوہ کولونیل مکانات۔

چند ہوٹلوں نے انیسویں صدی کا یوروپین ڈیکور باقی رکھا تھا۔ کرسمس کی وجہ سے ہوٹل پرستان بنے ہوئے تھے۔ باہر قدیم کائی آلود شاہ بلوط جن کے نیچے ایک زمانے میں ڈویل لڑے جاتے تھے۔ نوتر دام کا مذہبی مدرسہ۔ تاریخی فرنچ کوارٹر پر خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور اتوار کا سکون فرانسیسی ناموں والی سڑکوں پر سیاحوں کے لئے بگھیاں چل رہی تھی۔ ایک خاموش چوراہے پر جینز میں ملبوس ایک باریش نوجوان (جو ہپی نہیں تھا) گٹار پر جنوب کے نغمے سنا رہا تھا۔ قدموں میں اس کے ساز کا کیس سکوں کے لئے کھلا رکھا تھا۔ ایک گیت ختم کر کے اس نے کہا۔ اب میں اپنا مذہبی گانا سناؤں گا۔'' پھر اس نے ایک انگریزی بھجن شروع کیا۔'' کرشنا۔ کرشنا!''

نوتر ادام اور لایولا اور سینٹ زیویرز کی اس کیتھولک دنیا سے وہ بھی روحانی طور پر ارپٹ آؤٹ کر چکا تھا۔

ایک معصوم صورت لڑکا سائڈ واک پر اسٹول بچھائے اکارڈین بجا رہا تھا۔ ایک تماشہ گھر کے باہر بے حد حسین نیم عریاں رقاصاؤں کی تصاویر چسپاں تھیں۔ دروازے کے

اوپر لکھا تھا۔ ''دنیا کے خوبصورت ترین لڑکے'' یہ رقاصائیں دراصل ''تیسری جنس'' والے DRAN SVESTITES تھے۔ فرنچ کوارٹر مع بوربون اسٹریٹ اپنے بیہودہ تماشوں کے لئے ساری دُنیا میں مشہور ہے۔

''سان فرانسسکو کے بعد نیواور لینز تیسری جنس والوں اور GAY لوگوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان کافی رابطہ رہتا ہے۔'' شیری نے ہنس کر کہا۔

اس وقت میں نے ایک بات نوٹ کی۔ جب میں اور شیری اس تماشا گھر کے سامنے رک کر تعجب سے وہ تصاویر دیکھ رہے تھے۔ جین سلیوں ٹہلتے ہوئے دور چلے گئے۔ اور جب تک ہم دونوں وہاں سے آگے نہیں بڑھتے وہ وہیں ٹھٹھکے رہے۔ یہ ایک قدامت پسند، مہذب، پرانی اخلاقیات کے پابند وضع دار سدرن جنٹلمین کا بے ساختہ رویہ تھا جو مجھے بھلا معلوم ہوا ایک قدامت پسند وضع دار ہندوستانی بھی یہی کرتا۔

ایک چوک میں میڈیول یورپ کے بازی گر کی پوشاک پہنے ایک خوبرو نوجوان نٹ نے مجمع لگا رکھا تھا۔ لیکن سب تماشائی خاموش۔ شوروغل ناپید۔ ایک طرف بہت سارے آرٹسٹ تصویریں بنانے میں مشغول تھے یا اپنی تصاویر بیچ رہے تھے ایک بنچ پر ایک بوڑھا کوچہ گرد مغنی ایک کاؤبوائے گیت کی YOODLING میں مصروف تھا۔ ایک اور چوک میں ایک بوڑھا حبشی چھتری لگائے رقص کر رہا تھا۔ اس کے گرد بھی تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ نیواور لینز نیگرو جاز کی جائے پیدائش ہے۔

ایک جگہ وہ منڈی تھی جس میں امریکن خانہ جنگی سے قبل نیگرو غلام نیلام کئے جاتے تھے۔ ایک دوکان کے باہر T - SHIRTS آویزاں تھیں جن پر ____ NUKE IRAN چھپا تھا (یعنی ایران پر نیوکلیر بم گرادو۔) بحری قزاقوں کی گلی کے قریب ایک اوپن ائیر ریسٹوران میں لوگ باگ اتوار منا رہے تھے جیکسن اسکوائر اور بندرگاہ کے سامنے ریل کی پٹریوں پر سے مال گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

مارک ٹوین کے دریا مسسی پی پر جہاز چل رہے تھے۔ فضا میں ڈکسی لینڈ کی رومینٹک موسیقی مرتعش تھی۔ ٹینسی ولیمز کے ڈرامے A STREET CAR NAMED DESIRE کی سیٹنگ والے رنچ کوارٹر میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔

صبح سویرے شاہ بلوط اور میگنولیا اور شمشاد اور پامیٹو اور بید مجنوں سے ڈھکے ساحلوں سے ہٹ کر اسٹرن وہیلر اسٹیم بوٹ "COTTON BOSSOM" تاریخی یادگار کے سامنے سے گزری جہاں ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ عہد مارک ٹوئن کی وضع کے اس جہاز میں بھی پہیئے لگے تھے۔ مگر وہ بطورِ آزمائش پانی گرا رہے تھے۔ میں اسی طرح کے جہاز پر ہزاروں میل دور شمالی ریاست الی نوائیں اسی دریا مسس پی پر سفر کر چکی تھی۔

''کپاس کا شگوفہ'' اب اس جگہ کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ جہاں بدنام زمانہ ژاں لیفیت اور اس کے بحری قزاق رہا کرتے تھے۔ ژاں لیفیت ایک خوفناک اسمگلر تھا۔ ۱۸۰۸ء میں جب ریاستہائے متحدہ نے نیگرو غلاموں کی درآمد پر پابندی لگائی۔ اس شخص نے اپنی آمدنی جاری رکھنے کے لئے اپنے جہازوں کے کپتانوں کو حکم دیا کہ دُشمنِ برطانیہ اور دُشمنِ فرانس کے جہازوں پر چھاپہ مار کر قبضہ کر لیں۔ ۱۸۱۴ء میں جنگ کے دوران ایک برطانوی کپتان نے ژاں لیفیت کو رشوت دینا چاہی کہ وہ نیواورلینز پر فوجی قبضہ کرنے میں اس کی مدد کرے۔ تب اچانک ژاں لیفیت کا جذبہ حب الوطنی بیدار ہو گیا۔ اس نے متوقع برطانوی حملے کی خبر امریکن گورنر کو دے دی۔ جنگ میں وہ خود اس کے قزاق انگریزوں کے خلاف خوب خوب لڑے۔ فتح بطور صلہ امریکن پریذیڈنٹ میڈیسن نے لیفیت اور اس کے ساتھیوں کے جرائم معاف کر دیئے۔ ژاں لیفیت اسپینش امریکن ساحلی قزاقوں کے زمرے کی آخری کلرفل شخصیت تھا۔ ناولوں اور فلموں کا موضوع۔

امریکہ کی دوسری بڑی بندرگاہ نیواورلینز کے دریا پر اقوامِ عالم کے جہاز اپنے اپنے پرچم لہراتے گزر رہے تھے۔ ہندوستانی کارگو جہاز شِوساگر قریب سے نکل گیا۔ سوویت روسی جہاز اُڑیسہ دُور جاتا نظر آیا۔ کاش کاش امریکن اور روسی ایک دوسرے سے دوستی کر لیں۔ دنیا چین کا سانس لے۔

پرانی شوبوٹ کی وضع کی چہار منزلہ کشتی فرنچ کوارٹر کے وسط میں جیکسن اسکوائر کے سامنے سینٹ پیٹر اسٹریٹ کی گودی پر واپس آئی۔ اس نوع کے متعدد جہاز سیاحوں سے لدے مسس پی پر رواں تھے۔ پچھلی صدی میں سدرن پلانٹر اپنی زمینداریوں سے اسی قسم کے

جہازوں پر سوار ہو کر نیو اورلینز آتے تھے۔

ایک صبح رومان پرور RIVER ROAD PLANTATIONS کی طرف جاتے ہوئے ''اوبز رویشن کوچ'' مسسی پی دریا کے کنارے کنارے گزری۔ راستے میں جگہ جگہ پلانٹرز کے پرانے مکانات۔ اونچے شاہ بلوط! گنے کے کھیت۔ دریا پر تجارتی کشتیاں چل رہی تھیں۔ بالکل اسی وضع کے دو منزلہ جارجین کولونیل مکانات اسی عہد میں سارے بنگال اور بہار اور یو پی میں تعمیر ہوئے جس میں جُوٹ اور نیل اور افیون کے انگریز پلانٹرز رہتے تھے۔ لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے بعد فاقہ کش ہندوستانی کسان ان پلانٹرز کے نیم غلام بنے۔ یہاں امریکن ساؤتھ میں کپاس اور گنے کے پلانٹرز کے زرخرید غلام افریقہ سے منگوائے گئے تھے۔ وہ اتنی مختلف دنیائیں تھیں۔ مگر ان کا سماجی معاشیاتی سانحہ یکساں۔ یہ سفید فام امریکن پلانٹرز امریکن خانہ جنگی میں کٹ مرے تھے۔ خانہ جنگی نے ہزاروں پرانے زمیندار خاندان تباہ کر دیئے۔ اُن کے عالی شان مکان اسی طرح سجے سجائے سیاحوں کے لئے رکھے گئے ہیں۔ بہت سے مکان اب تک آباد ہیں۔ ایک محل کی گائڈ لڑکیاں پچھلی صدی کی SOUTHERN BELLES کی پوشاک میں ملبوس تھیں۔ اس روایتی ساؤتھ کے متعلق اتنے ناول اور ڈرامے لکھے گئے اور فلم بنے۔ اس خطے کی پولی مٹی میں کنکر مفقود ہیں لہٰذا ان مکانات کی سڑکوں پر دریائی سیپیوں کی بجری بچھی تھی۔

واپسی پر کوچ ان محلات اوران کے نیگرو غلاموں کی کابجوں کو شاہ بلوط کے جھرمٹوں میں چھپا چھوڑ کر نئی ایکسپریس وے پر آ گئی۔ یہ ایکسپریس وے ساٹھ ستر میل تک دلدلی جنگلوں میں سے گزری۔ پل کے دونوں جانب پانی میں استادہ اونچے درخت اور جھیل کے کنارے سرسراتے شمشاد کے جھرمٹوں کے بعد شہر میں داخل ہو کر اچانک ایک عمارت پر ایک مدراسی ڈاکٹر کے نام کا بورڈ بڑا عجیب لگا۔

''تمہاری آمد کی اطلاع ریڈیو نیو اورلینز کو کر دی گئی تھی۔ کل وہاں چلنا ہوگا ــــــ'' رات کو والمونٹ اسٹریٹ میں شیری نے کہا۔ دوسرے روز مسٹر رابرٹ کار نے ــــــ WORLD VOICES کے آدھ گھنٹے کے انٹرویو میں ہندوستانی سیاست اور مسز اندرا گاندھی سے لے کر انڈین فلم انڈسٹری تک بے حد سوالات کئے گئے۔

''آپ کے ملک کی اتنی قدیم تہذیب ہے۔اور اتنی روحانی بلندی۔ پھر اتنا شدید افلاس کیوں؟''

''اتنے کم وقت میں برطانوی کولونیلزم کی اقتصادیات پر لیکچر تو نہیں دے سکتی۔ برطانیہ نے ڈیڑھ سو سال تک استحصال کیا اور اس کے بعد غلط اکنومک پلاننگ اور تیزی سے بڑھتی ہوئی بے تحاشہ آبادی۔ لیکن مغربی میڈیا میں ہندوستان کے افلاس ہی کا چرچا ہے۔ یہ ذکر کبھی نہیں کیا جاتا کہ ہندوستان اپنے سوپر سونک جیٹ طیارے بھی بنا رہا ہے اور مصنوعی چاند بھی۔''

''آپ پہلی ہندوستانی ہیں جنہوں نے اس پروگرام میں برطانیہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ ورنہ عموماً جو خاص خاص ہندوستانی ہم یہاں مدعو کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ پچھلے پروگرام میں یو این کے فلاں صاحب آئے تھے، انہوں نے کہا۔''

''لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟'' میں نے بات کاٹی۔'' خود آپ لوگ برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے استحصال کے خلاف کیوں لڑتے تھے۔؟''

رابرٹ کار بہت ہنس مکھ آدمی تھے۔ کہنے لگے۔'' آپ کے سوالات کے لئے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہے۔ اچھا ایک آخری سوال اور۔ آیت اللہ خمینی۔''

آیووا سٹی میں پروفیسر پال اینگل نے بھی مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان میں بہت سے لوگوں نے اُن سے کہا۔'' کاش انگریز نہ جاتے۔''

۴۷ء سے پہلے اگر کسی کو معلوم ہوتا کہ آزادی کے برسہابرس بعد لوگ ایسی خواہش ظاہر کریں گے تو کسی کو یقین نہ آتا۔

جس روز صبح میں نیواورلینز سے روانہ ہو رہی تھی شیری نے کہا ایرپورٹ جانے سے پہلے تم کو گارڈن ڈسٹرکٹ اور سینٹ لوئی کا قبرستان دکھاتی چلوں۔ گارڈن ڈسٹرکٹ امیروں کا محلّہ ہے اور یہ قبرستان یہاں کی خاص چیز ہے۔

پرفضا گارڈن ڈسٹرکٹ سے نکل کر قبرستان کی طرف جاتے ہوئے شیری نے کہا۔ ''یہاں کی مٹی دلدلی ہے۔ مردے زمین کے اندر دفن نہیں کئے جاتے سنگی میزوں کے اوپر اُن کے مرمریں تابوت رکھ دیئے جاتے ہیں۔''

برابر کی سڑک پر سے گزرتے ہوئے میں نے نظر دوڑائی۔ سفید خوبصورت مزار۔ سب زمین سے بہت اونچے ڈھائی سو سال سے اس نظر فریب شہر کے باسی مرنے کے بعد ان انوکھی قبروں میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ زمین کے اندر نہ سہی۔ اوپر سہی مرزا غالب کہہ گئے تھے۔ جو یوں ہوا تو کیا اور یوں ہوا تو کیا۔ انجام وہی ہے۔

الفا اور اومیگا

نیو اور لینز سے شکاگو سوا تین گھنٹے کی اُڑان۔ پونے تین بجے سہ پہر شکاگو پہنچ کر چار بجے سیڈر ریپڈز کے لئے یونائیٹڈ ایرلائنز کا ہوائی جہاز شام کے ساڑھے چار بجے سیڈر ریپڈز تاریک تھا۔ تیز ہوا اور برفباری۔

جس وقت آیووا سٹی مے فلاور اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ نادیا میر ناضرت کو موجود پایا۔

''تمہاری غیر موجودگی میں۔'' میرتی نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''انٹرنیشنل رائیٹنگ پروگرام میں ایک عدد ولادت ہوئی۔''

''ولادت۔؟ کس کے ہاں؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''بوجھو۔''

سوچا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ ''اولگا؟ لیلی؟ ایگنس، یا تھیا تو ہو نہیں سکتیں۔ رہیں نادیا اور فاطمہ تو یہ دونوں غیر شادی شدہ ہیں۔''

''پھر سوچو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''فاطمہ!''

فاطمہ ذکیے؟'' میں نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔ ''مگر اس کی شادی نہیں ہوئی اور نہ

معلوم ہوتا تھا کہ............''

''نیور مائینڈ، چند روز ہوئے رات کے دو بجے اس نے مجھے فون کیا۔ فوراً ہسپتال لے گئے۔ صحت مند بچی پیدا ہوئی۔ اسے وہاں چھوڑ کر فاطمہ تیسرے دن نیویارک چلی گئی۔ جہاں اس کا کلچے شروع ہونے والا تھا۔''

''سخت جان، قوی، ہیکل باغی افریقی لڑکی۔'' نادیا نے کہا۔

''اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ بچی کا باپ کون ہے۔ شاید وہ جنوبی افریقہ ہی میں موجود ہے اور اس کا ہم قوم ہے برٹ اور تھیا نے فاطمہ سے کہا ہے کہ اگر وہ چاہے تو وہ بچی کو متبنّیٰ کر کے ہالینڈ لے جائیں گے۔ مگر اس نے منظور نہیں کیا۔ بن بیاہی کالی عورتوں کے ہاں یہاں بھی عام طور پر بہت بچے پیدا ہوتے ہیں اور اب گوروں کے ہاں بھی بہت ہو رہے ہیں۔

''یہ نئی اخلاقیات کی دنیا ہے۔ مگر نجانے فاطمہ پر جنوبی افریقہ میں کیا اُفتاد پڑی ہو، کیا پتہ کسی نے اسے دھوکا دیا ہو۔ نہ معلوم اس کے ذاتی مسائل کیا ہیں ممکن ہے اسے ریپ ہی کیا گیا ہو۔ اسے جج کرنے یا اسے ہمدردی جتانے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔'' نادیا نے کہا جو اپنے رویوں میں بہت مغربی تھی۔

یہی رویہ پروگرام کے باقی اراکین کا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے اور دوسروں کے معاملات میں ناک نہ ڈبونے کے زریں مغربی اصول کے تحت کسی نے اس واقعہ کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔

میں پروگرام کی مدت میں متعدد بار باہر جاتی رہی تھی اور بہت سے سیمیناروں میں شرکت نہ کر سکی تھی (''موڈرن انڈین فکشن'' کے متعلق سیمینار بالکل شروع ہو چکا تھا) ویٹ بار اور جمز بک اسٹور کی ادبی محافل بھی جاری تھیں۔

ایک سرد شام ہم لوگ نامور جواں سال جاپانی شاعر گوزو یوشی ماسو کو سننے ویٹ بار گئے۔ اس نے جاپانی میں اپنا کلام بلاغت نظام اور بیک وقت اس کی برازیلین بیوی اور ایک کالی لڑکی انجلٹیا نے اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ ساتھ ساتھ ساز بجائے گئے۔ بے پناہ شور مچا۔ گوزو (اسے بھی جاپانی فلموں کا ہیرو ہونا چاہئے تھا۔) اچھلا کودا فرش پر اُکڑوں بیٹھ کر حلق

سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ سر کے بال نوچے۔ چھت کی طرف منہ اُٹھا کر چلایا۔ تو وہ کی قسم کی اداکاری کی۔ اس ہنگامے میں انگریزی تراجم کو نہ سمجھنا ہی مدعا تھا۔ یہ ذرا زیادہ ہی ڈرامائی HAPPENING تھی۔ سامعین مسحور ہوئے (امریکن جاپانیوں سے بھی بہت مسحور ہیں) گوزواوک لینڈ یونیورسٹی میں پوئیٹ ان ریذیڈنس تھا۔ جہاں ترقی پسند اُردو شاعر منیب الرحمٰن پروفیسر ہیں۔

الوداعی دعوت کی رات پال اینگل کے ہاں صبح دو بجے تک شور غوغا رہا۔ ہمیشہ کی طرح (سوائے میرے) سب ناچے۔ اگنیس بھی ناچیں۔ اس طرف وہ پہلی بار مسرور نظر آئیں۔ ایسا لگا جیسے دکی بام کی ہیروئن کچھ دیر کے لئے اپنے خول سے باہر آ گئی۔

اب لوگوں نے واپس جانا شروع کر دیا تھا۔ روز دریچے میں سے نظر آتا۔ مائیکل کا اسباب لدر ہا ہے۔ آج لیلیٰ گئیں۔ نیو بافاریہ روانہ ہوا۔ رات کو مینو یوگوسلاویہ جا رہا ہے۔ کل آری ایتھنز جائے گا۔ پروگرام کی طرف سے سات سو ڈالر کے ایر ٹکٹ ملک کے اندر سیر سپاٹے کے لئے ملتے تھے۔ لوگ باگ دور نزدیک کے چکر لگا کر واپس آرہے تھے۔ نادیا اور لیلیٰ بھی گھوم آئی تھیں۔ میں چونکہ یونیورسٹیوں کی دعوت پر گئی تھی۔ سات سو ڈالر باقی تھے۔ لیکن اب برف باری شروع ہو چکی ہے اور کافی سیر کر لی ہے۔ واشنگٹن سے پرانی عزیز دوست جین ایبل کون (دیکھئے کارِ جہاں دراز ہے جلد دوم) کا فون آیا۔ یہاں کب پہنچ رہی ہو۔ میں نے کہا۔ جین آپا کچھ رشتے داروں نے آسٹریلیا بلایا ہے جو برِ اعظم پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لہٰذا فی الحال وہاں جاتی ہوں۔ لہٰذا وہ باقی ماندہ ساڑھے چھ سو ڈالر کرائے میں ڈال کر سڈنی کا ٹکٹ بنوایا۔

اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں میں سے پارک کے اتنے موسم تیزی سے بدلتے دیکھے تھے۔ اگست کی روشن دھوپ۔ خزاں کے لہلہاتے آتشیں اور ارغوانی رنگ۔ شام کو جب آیوواندی پر سورج ڈوبتا سامنے وسیع آسمان پر پھیلی ہوئی شفق طویل دریچوں میں سے ایک سنیما سکوپ نظام معلوم ہوتی۔ اب وہاں تاریکی تھی اور برف کے گالے آیوواندی منجمد ہونے والی تھی۔ بہت جلد برف ہٹانے والے خودکار ریل سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ نمک کے ذریعے برف پگھلائی جائے گی۔ لوگ باگ اسکیٹنگ کریں گے اور سیڈرر۔ پیڈز میں پہیوں کی جگہ

پھسلنے والے تختے طیاروں میں لگا دیئے جائیں گے۔

لاس اینجلز روانگی کی صبح سورج نکل آیا۔ برٹ اور تھیا خدا حافظ کہنے کے لئے لوبی میں موجود تھے۔ اگینس اور بالا زینگل لپکے ہوئے نیچے آئے۔ اور اداسی سے مسکرائے۔ ہوالنگ اور پال فرانٹے سے آ کر اسی پھرتی سے بریکفاسٹ کے لئے گھر لے گئے اُن کا کھانے کا کمرہ تیز دھوپ سے روشن تھا۔ پال نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ وقت بھی اچھا گزرا اور بہت جلد ختم ہو گیا۔" ہوالنگ چینی تحقیق کا ایک طلائی گڈ لک تعویذ نکال کر لائیں جو ہمارے امام ضامن کی طرح چین میں طویل سفر پر جانے سے مسافر کو پہنایا جاتا تھا۔

وہ بدھسٹ چین کی رسم تھی۔ مجھے یاد آیا۔ جب میں پہلی مرتبہ سوویٹ یونین جا رہی تھی۔ روسی قونصل۔ ان کی بیوی اور چند اور روسی بھی ہمراہ جانے والے تھے۔ روانگی سے قبل جب ہم لوگ اُن کے گھر سے چلنے لگے۔ روسی قونصل کی بیوی نے اچانک اشارہ کیا۔ سب پھر بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اٹھے۔ انہوں نے کہا یہ ہمارے ہاں کا پرانا ٹوٹکا ہے۔ نیک شگون طویل سفر پر جانے سے پہلے۔ (مادیت کے فلسفے میں اس کے شگون اور ٹوٹکے کا کہیں ذکر نہیں۔)

جرمن نژاد کالونسٹ پال، چینی ہوالنگ اور امام ضامن کی روایت والی راقم الحروف اینگلز کی پہاڑی سے اُترے سامنے آیو واندی بہہ رہی تھی جو روایات کے بننے اور بگڑنے سے بے نیاز اسی طرح بہتی رہے گی۔ (اگر دنیا باقی رہی)

شب گذشتہ سے فلاور کے نکڑ پر اپنے کوزی فلیٹ میں پیٹر ناضرت نے یوگنڈا کے متعلق اپنا سیاسی ناول IN A BROWN MANTLE دیتے ہوئے اس پر لکھا تھا۔

IN THE COLD DYING DAYS OF THE SEVENTIES A LAST SOUVEINIR OF THE LAND OF WAR - TO REMIND YOU THAT WE CAN NOT CHANGE OUR FUTURE WITH OUT KNOWING OUR PAST.

شکاگو۔ ڈینور۔ گرم خوشگوار، کیلی فورنیا نمبر ۱۱۹ نارتھ رتھمونٹ جلال عدنان منصور تینوں بچے اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔ بیورلی ہلٹن اور سارا لاس اینجلز رات کو لاکھوں

روشنیوں سے جگمگاتا طیران گاہوں کے وسیع COMPLEX میں طویل متحرک برقی سڑکوں پر مشرق کی سمت پرواز کرنے والوں کے ہجوم رواں تھے۔ کوریا۔ جاپان۔ تائیوان۔ جزائر بحرالکاہل و غرب الہند۔ جم غفیر میں ایک خفیف سی جھنجھناہٹ اور افراتفری۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اورینٹ یہاں سے شروع ہوگیا۔

پین امریکن کا جمبو جمعرات کی صبح دو بجے لاس اینجلز سے اُڑا۔ چند گھنٹے بعد ڈیٹ لائن پر سے گزرا اور جمعہ کا دن غائب۔ نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ کی پہاڑیوں پر وہ لطیف کہرہ تیر رہا تھا جس میں مواری قبائل کو اپنے الوہی اسرار نظر آتے تھے۔ گوروں کے چہرے مُہرے اور انداز برطانوی۔ قطب جنوبی کے نزدیک ایک اور انگلستان۔

آسٹریلیا، شاداب و خوش منظر سڈنی سرخ چھتوں والے مکان اپنے COCKNEY اجداد سے آسٹریلین لوگوں نے بشاش دوستانہ انداز ورثے میں حاصل کیا ہے۔

میرے رشتے داروں کے خوبصورت مکانوں کے احاطوں میں سرخ جرینیم کھلے ہوئے تھے اور خودکار متحرک فوارے سبزے کو پانی دے رہے تھے۔ کزن سلطان حیدر کی حسین گلوکار بیگم شہناز (سڈنی ریڈیو میں انگریزی پروگرام آفیسر) اور ایک اطالوی نژاد جرنلسٹ خاتون نے انگریزی میں آدھ گھنٹے کا اور بہاری نژاد صلاح الدین صاحب نے اُردو پروگرام کے لئے ایک گھنٹہ کا انٹرویو کیا۔ دوسرے کزن ڈاکٹر محمود زیدی بحیثیت امریکن وزیٹنگ پروفیسر یونیورسٹی آف نیوساؤتھ ویلز میں سال بھر کے لئے اقتصادیات پڑھانے میں مصروف تھے اور ایک آسٹریلین پروفیسر کے مکان میں (جو مع خاندان برائے تحقیق جزائر بپودا گیا ہوا تھا) مقیم تھا۔ اس مکان میں کال بیل کے بجائے۔ ACOUSTICS اس قسم کے تھے کہ نیچے صدر دروازے پر کوئی دستک دیتا تھا تو وہ بالائی منزل کے کواڑوں پر سنائی دیتی تھی۔

آسٹریلیا میں یہ موسم گرما تھا۔ اور شام کو درختوں میں کوئل گاتی تھی اور رات کے آسمان پر وہ ستارہ جگمگاتا تھا جس کا نام کرہ جنوبی دریافت کرنے والے عیسائی ''جنوبی صلیب'' رکھ گئے تھے۔

انجیل مقصد کے عہد نامہ جدید یعنی مسیحی بائبل کا آخری حصہ بعنوان ''یوحنا عارف کے مکاشفے'' ایک قابلِ ذکر کتاب ہے۔ یہ JOHN EHT BAPTIST کا ہم نام ایک

یہودی شاعر تھا جو عیسائی ہو گیا تھا۔ عبرانی میں سوچتا تھا اور یونانی میں لکھتا تھا۔ بائبل ا۔ کارلر کا خیال ہے کہ یہ یوحنان رومن حاکموں کے خلاف اہلِ فلسطین کی بغاوت اور ان کے پرسیکیوشن کے زمانے میں گیلی سے ہجرت کر کے اناطولیہ کے شہر افی سس چلا گیا تھا۔ اس سیاسی اضطراب اور زبوں حالی کے زمانے میں اس نے قدما، حضرت دانیالؑ وغیرہ کی طرح بطور پیشین گوئی مؤثر اور گرجدار اور تقریباً ایکس پریشنسٹک EXPRESSIONISTIC انداز میں اپنے مکاشفے ''قلم بند'' کئے تھے۔ اس وقت کے اور آج کے فلسطین میں انتشار و بے انصافی میں زیادہ فرق نہیں۔ صوفیوں اور عارفوں کی پیشن گوئیاں اور سکھوں کی جنم ساکھیاں بھی مضطرب زمانوں میں لکھی گئیں۔ ''مریم دی سٹوری آف دی مینوئی۔'' پردادا سید احمد علی کی وہ ادھ جلی کتاب جس میں مَیں نے شاہ نعمت اللہ ولیؒ کی نظم کا انگریزی ترجمہ دیکھا۔ کتنی کتابیں کتنی شورشوں میں اور جلیں گی۔ کتنی ادھ جلی باقی رہیں گی (عین اس وقت ابادان اور خرم شہر کے کتب خانوں میں کیا کیا جل رہا ہوگا۔) ملبورن سے آدھی رات کو ایک معمر انگریز عورت نے ابھی اپنا ایمان نہ کھویا تھا اور نہ (بائبل کی زبان میں) انوکھے خداؤں کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ جب وہ تلاوت ختم کر چکی میں نے کتاب مقدس اس سے لی اور یوحنا کا مکاشفہ کھولا۔

''خداوند خدا جو ہے، اور جو تھا اور جو آنے والا ہے۔ یعنی قادر مطلق فرماتا ہے کہ میں الفا اور اومیگا ہوں۔ اور اپنے پیچھے نرسنگے کی سی آواز سنی کہ جو کچھ تو دیکھتا ہے۔ اسے کتاب میں لکھ۔

''اور تخت پر جو بیٹھا تھا میں نے اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی جو اندر سے اور باہر سے لکھی ہوئی تھی اور سات مہریں لگا کر بند کیا گیا پھر میں نے زور آور فرشتے کو بلند آواز سے یہ منادی کرتے دیکھا کہ کون اس کتاب کو کھولنے اور اس کی مہریں توڑنے کے لائق ہے اور میں اس بات پر زار زار رویا کہ کوئی اس کتاب کو کھولنے یا اس پر نظر کرنے کے لائق نہ نکلا۔ پھر میں نے دیکھا کہ برے نے ان سات مہروں میں سے ایک کو کھولا۔ اور ان چار جانداروں میں سے ایک کی گرج سنی کہ آ! اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے۔ اور اس کا سوار کمان لئے ہوئے ہے اور اسے ایک تاج دیا گیا۔ اور وہ فتح کرتا ہوا نکلا کہ اور بھی فتح کرے۔ "WASP"۔؟ اور جب اس نے دوسری مہر کھولی۔ پھر ایک اور

گھوڑا نکلا جس کا رنگ لال تھا۔ اسے ایک بڑی تلوار دی گئی۔''

لال!

''اور تیسری مہر۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کالا گھوڑا ہے۔ اس کے سوار کے ہاتھ میں ایک ترازو ہے۔''

کالی دنیا۔ یا عباپوش مُلا خمینی اور اُن کا ''اسلامی انصاف؟''

''اور چوتھی مہر۔ زرد گھوڑا۔''

چین۔؟

''اور جب اس نے اتھاہ گڑھے کو کھولا تو گڑھے میں سے ایک بڑی بھٹی کا سا دھواں اُٹھا۔ اور سورج اور ہوا تاریک ہوگئی۔''

ایٹم بم؟ فضا کی آلودگی؟

''اور ان میں سے ہر ایک کو سفید جامہ دیا گیا اور اُن سے کہا گیا کہ اور تھوڑی مدت آرام کرو۔ جب تک تمہارے ہم خدمت بھائیوں کا بھی شمار پورا نہ ہولے جو تمہاری طرح قتل ہونے والے ہیں۔''

''ایران میں مزید دوسو آدمی فائرنگ اسکواڈ سے ہلاک۔'' ملبورن کے ایک شام کے اخبار کی ایک سرخی متبسم لمبا تڑنگا آسٹریلین اسٹورڈ صبح کی چائے کے ساتھ اخبار سامنے رکھ گیا۔

نہیں یوحنا کے مکاشفے کی یہ عصری تاویلیں کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں۔ میں نے کنگ جیمز بائبل بند کر کے انگریز خاتون کو واپس کردی۔

آسٹریلین اُڑن ہاتھی سانتا کروز پہ اُترا۔ ہوائی جہاز کی مغربی تنظیم اور اخلاق کے ماحول سے باہر آ کر اچانک مشرق ایک مرانھی خاتون نے جو سڈنی میں سیٹل ہو چکی تھیں اور گھر والوں سے ملنے آئی تھیں۔ ایک کاؤنٹر پر بیٹھے کلرک سے کسٹم والوں کا راستہ دریافت کیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ خاتون نے دوبارہ پوچھا۔ اس نے جمائی لی اور بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ہوا پیما سے اُترنے والے مغربی جو شاید پہلی بار مشرق آئے تھے بدنظمی شور وغل اور

افراتفری سے بھونچکے ہوکر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

ادھر کسٹم کاؤنٹر پر ایک ساری پوش خاتون کے سوٹ کیس میں سے بیرونی COSMETICS اس طرح نکلے چلے آ رہے تھے جس طرح گوگیا پاشا کے طلسمی سندوقچے سے کبوتر برآمد ہوتے تھے۔

باہر ایک بٹے کٹے ہمہ پوش مسلمان نوجوان فقیر نے میرے سامنے آ کر نعرہ لگایا۔

''دے حاجی ملنگ بابا کے نام پر۔''

پیارے پڑھنے والو۔ یاد رکھو اور پہچان لو۔ کہ جہد البقا میں بچھڑنے اور ہارنے والی قوموں کی یہی نشانیاں ہیں۔

ایرپورٹ پر خریدے ہوئے اخبار پر نظر ڈالی: ایران وعراق کے مابین جنگ کے آثار۔ (پیارے پڑھنے والو۔ پند ونصیحت میرا منصب نہیں) مگر ایک بات یاد آتی ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں مسلمانوں کی ایک سو اٹھائیس سلطنتیں تباہ ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر خود مسلمانوں ہی نے ایک دوسرے کے خلاف بھیانک لڑائیاں لڑلڑ کر نیست ونابود کی ہیں۔

اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا قول یاد آتا ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ جب اللہ ہمارا اور صرف ہمارا تھا تو اس نے خلافتِ عباسیہ کا وارث ہلاکو اور اندلس کا مالک ازابلا اور فرڈی ننڈ کو کیوں بنایا اور مغلوں کا تاج کوئن وکٹوریہ کے سر پر کیوں رکھ دیا۔ مشرقی یورپ سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیئے۔ روس میں اسلام پر پہلے زار اور پھر کمیونسٹوں کو کیوں غالب کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت طویل فہرست ہے۔

ٹیکسی نے ساؤتھ بمبئی کا رُخ کیا۔

میں نے سوچا وہی مثل ہے کہ

کہاں گئے تھے؟ کہیں نہیں۔ کیا لائے کچھ نہیں۔

☆

قرۃ العین حیدر کی معرکۃ الآرا تصانیف

ناول:	آگ کا دریا، سفینۂ غمِ دل، آخر شب کے ہم سفر، گردشِ رنگِ چمن، میرے بھی صنم خانے۔
افسانے:	ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار۔
سوانحی ناول:	کارِ جہاں دراز ہے، (جلد اوّل، دوم، سوم) چار ناولٹ، سیتا ہرن، دلرُبا، چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو۔
رپورتاژ:	کوہِ دماوند، گلگشت، جہانِ دیگر، خضر سوچتا ہے، ستمبر کا چاند وغیرہ۔
تراجم:	ہمیں چراغ ہمیں پروانے (پورٹریٹ آف اے لیڈی از ہنری جیمز)، آدمی کا مقدر (میخائل شولوخوف) آلپس کے گیت (واسل بائی کوف) ماں کی کھیتی (چنگیز اعتادوف) کلیسا میں قتل (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)، تلاش (ٹرومین کاپوٹ) وغیرہ وغیرہ۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Phones: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540
E-mail: eph@onebox.com

ISBN 81-87667-27-3